ہندوستان میں
عورت کی
حیثیت
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

ہندوستان میں عورت کی حیثیت

مترجم

صغرا مہدی

مرتبہ

انڈین کونسل آف سوشل سائنس اینڈ ریسرچ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل

حکومت ہند

ویسٹ بلاک۔1، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔110066

Hindustan Mein Aurat Ki Haisiat

Translated By : Sughra Mehdi

سنہ اشاعت:

پہلا اڈیشن : 1980

دوسرا اڈیشن : 1998 تعداد 1100

قیمت: -/62

سلسلۂ مطبوعات: 746

ناشر : ڈائریکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، آر۔ کے۔ پورم،
نئی دہلی۔110066

طابع : سپریم آفسیٹ پریس، مالویہ نگر، نئی دہلی

پیش لفظ

"ابتدا میں لفظ تھا۔ اور لفظ ہی خدا ہے"

پہلے جمادات تھے۔ ان میں نمو پیدا ہوئی تو نباتات آئے۔ نباتات میں جبلت پیدا ہوئی تو حیوانات پیدا ہوئے۔ ان میں شعور پیدا ہوا تو بنی نوع انسان کا وجود ہوا۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ کائنات میں جو سب سے اچھا ہے اس سے انسان کی تخلیق ہوئی۔

انسان اور حیوان میں صرف نطق اور شعور کا فرق ہے۔ یہ شعور ایک جگہ پر ٹھہر نہیں سکتا۔ اگر ٹھہر جائے تو پھر ذہنی ترقی، روحانی ترقی اور انسان کی ترقی رک جائے۔ تحریر کی ایجاد سے پہلے انسان کو ہر بات یاد رکھنا پڑتی تھی، علم سینہ بہ سینہ اگلی نسلوں کو پہنچتا تھا، بہت سا حصہ ضائع ہو جاتا تھا۔ تحریر سے لفظ اور علم کی عمر میں اضافہ ہوا۔ زیادہ لوگ اس میں شریک ہوئے اور انھوں نے نہ صرف علم حاصل کیا بلکہ اس کے ذخیرے میں اضافہ بھی کیا۔

لفظ حقیقت اور صداقت کے اظہار کے لیے تھا، اس لیے مقدس تھا۔ لکھے ہوئے لفظ کی، اور اس کی وجہ سے قلم اور کاغذ کی تقدیس ہوئی۔ بولا ہوا لفظ، آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ ہوا تو علم و دانش کے خزانے محفوظ ہو گئے۔ جو کچھ نہ لکھا جا سکا، وہ بالآخر ضائع ہو گیا

تمہید

ایک نیشنل کمیٹی ہندوستان میں عورت کے درجے کے تعین کے لیے بنائی گئی تھی۔ اس کی رپورٹ میں ہندوستان کی شرح آبادی کے بنیادی رجحانات سے لے کر ان سرکاری پالیسیوں تک جو عورت کی حیثیت کو بہتر بنانے کے لیے اختیار کی گئی ہیں، تمام مسائل کا وسیع احاطہ کیا گیا تھا۔ یہ اس موضوع پر قیمتی دستاویز ہے، جسے زیادہ سے زیادہ پڑھا جانا چاہیے اور اس پر غور ہونا چاہیے۔ کیونکہ ہمارے خیال میں یہ رائے عامہ کو بنانے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔

چنانچہ انڈین کونسل آف سوشل سائنس ریسرچ نے اس کا خلاصہ تیار کیا ہے، کیونکہ اصل رپورٹ کو پڑھنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔

امید ہے کہ یہ اس ضرورت کو جو عام طور پر محسوس کی جا رہی ہے، پورا کرے گی اور زیادہ سے زیادہ پڑھی جائے گی۔

میں یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں، کہ اس رپورٹ کا خلاصہ تیار کرنے کی پوری ذمہ داری میری اور میرے ساتھیوں کی ہے۔ ہم نے اصل رپورٹ کے ساتھ انصاف کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ اگر کسی لحاظ سے ہم اس میں ناکام رہے ہیں، تو اس کے لیے ہم خلوص دل سے معذرت خواہ ہیں۔ اگر آپ کو اس میں کہیں کوئی شبہ ہو تو مستند بیان کمیٹی کی اصل رپورٹ کا سمجھا جائے گا، اس خلاصے کا نہیں۔

مئی ۱۹۷۵ء
نئی دہلی

جے۔ پی۔ نائک
ممبر سکریٹری

عورت کے درجے کے تعین کے لیے بنائی گئی کمیٹی

1	محترمہ ڈاکٹر پھول رینو گوہا	صدر
2	محترمہ منی بین کارا	ممبران
3	محترمہ نیرا ڈوگرا	〃
4	محترمہ ساوتری شیام	〃
5	محترمہ سکینہ حسن	〃
6	محترمہ کے لکشمی راگھورامیہ	〃
7	محترمہ ارملا ہکسر	〃
8	محترمہ ڈاکٹر لیلا دوبے	〃
9	محترمہ ڈاکٹر لوتیکا سرکار	〃
10	محترمہ وکرم مہاجن	〃
11	محترمہ ڈاکٹر وینا مجمدار	ممبر سکریٹری

فہرست مضامین

تعارف

ہمارے ملک کا دستور بنانے والوں نے عورت کی حیثیت کو بہتر بنانے کی ذمہ داری لی تھی، اور شروع ہی سے یہ تسلیم کیا تھا کہ اس وقت ملک کے سامنے جو اہم کام ہیں، یہ ان میں سے ایک ہے۔ لیکن آزادی کے بعد اس سلسلے میں جو تبدیلیاں ہوئیں ان کا جائزہ لینے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ لہٰذا حکومت نے ۱۹۷۱ء میں عورت کے درجے کے تعین کے لیے ایک نیشنل کمیٹی بنائی، جس کے سپرد یہ کام ہوا تھا کہ آزادی کے بعد سے جو قانون اور حکومت کی طرف سے عورت کی حیثیت کو بہتر بنانے کے لیے کارروائیاں کی گئی ہیں اور ان سے عورتوں کی حیثیت میں جو تبدیلیاں آئی ہیں، ان کو جانچے اور پرکھے۔ اس کمیٹی کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ سماجی تبدیلی کے پیچیدہ طریقہ کا ہندوستانی عورتوں کے مختلف طبقوں، خاص طور سے دیہاتی علاقوں کی عورتوں پر جو اثرات پڑے ہیں ان کو بھی جانچے۔ اس کے علاوہ کمیٹی سے ایسی تجویزیں بھی پیش کرنے کو کہا گیا تھا جن کو عمل میں لاکر عورتیں اس قابل ہوسکیں کہ وہ قوم کی تعمیر میں پورا اور مناسب رول ادا کرسکیں۔ کمیٹی کے اراکین کو جو کام تفویض کیا گیا تھا، اس کا پروگرام ضمیمہ میں دے دیا گیا ہے۔

نیشنل کمیٹی کی رپورٹ کا خلاصہ

باب اوّل

ہمارا طریقہ کار

ہماری تحقیق کا ڈھانچا دو چیزوں سے بنا ہے۔ ایک تو دستور کی ان دفعات سے جو عورت کی حیثیت کو بہتر بنانے کے لیے رکھی گئی ہیں، دوسرے ان واضح مقاصد سے جن کی وضاحت ہمارے مفوضہ کام کی آخری مدمیں کی گئی ہے۔ یعنی ایسی تدبیریں تجویز کرنا جو عورتوں کو اس قابل بنائیں کہ وہ قوم کی تعمیر میں پورا اور مناسب رول ادا کرسکیں۔ ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ موجودہ صورت حال کا اندازہ ان دو بڑے امور کو مدِنظر رکھ کر کریں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ہمارا دستور ایک سماجی انقلاب چاہتا ہے، جو قانون کے ماتحت ایک سماجی معینہ تبدیلی پیدا کرکے لایا جائے۔ عورتوں کو مساوی درجہ دلانا دستور کا ایک خاص مقصد تھا۔ جو تمہید، بنیادی حقوق اور ریاست کی پالیسی کے رہنما اصولوں میں مضمر ہے۔ ہمیں ان دستوری دفعات، قانونی وانتظامی کارروائیوں کے اثرات دیکھنے کے لیے اس پیچیدہ سماجی عمل کا بھی جائزہ لینا تھا کہ جو مختلف تغیر پذیر عناصر پر مشتمل ہے، جیسے (۱) ہندوستانی سماج کا مختلف النوعی ہونا اور اس کے طبقوں میں معاشی اور سماجی نابرابری ہونا۔ (۲) وہ عدم مساوات جو یہاں کے روایتی سماجی ڈھانچے کا لازمی جزو ہے۔ اور جو ذاتوں، مذہبی فرقوں اور طبقوں میں بٹی ہوئی ہے۔ سماج میں عورت کے مقررہ حقوق ہیں اور اس سے خاص طرح کا رول ادا کرنے کی توقع کی جاتی ہے۔ یہ سب چیزیں عورت کی حیثیت پر گہرا اثر ڈالتی ہیں۔ (۳) معاشی سماجی اور سیاسی تبدیلیوں کے رُخ اور عورت کی حیثیت پر ان کے اثرات۔

ہم نے دیکھا کہ ان سماجی تبدیلیوں کے اثرات عورتوں کے مختلف طبقوں پر یکساں نہیں ہیں۔ اس لیے یہ آسان نہیں ہے کہ عورت کی حیثیت پر ان تبدیلیوں کا جو اثر پڑا ہے۔ اس کے بارے میں کوئی کلیہ بنا سکیں۔ سماجی تبدیلیاں ایک پیچیدہ عمل ہے۔ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ اس کا رُخ ہمیشہ دستور کے رہنما اصولوں کے مطابق ہو۔ تعلیمی ترقی، معاشی ڈھانچے میں تبدیلی، آبادی کا شہروں میں منتقل ہونے کا رجحان اور سماجی عمل میں حصّہ لینے کے زیادہ مواقع میں بعض صورتوں میں کہیں عدم مساوات زیادہ ہوگئی تو کہیں کم ہے۔ طور طریقوں کے معیار اور اقدار کے نظام میں تبدیلیاں مختلف گروہوں پر مختلف طریقوں سے عورتوں کی حیثیت پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اس کا خاص نمونہ روایت پسندی کو جدت پسندی میں ڈھالنے کا بھی عمل ہے۔ روایتی اقدار سماج کے اونچے طبقے کے طور طریقوں کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہیں، جنھوں نے عورت کے رول کو گھر تک محدود کر دیا ہے۔ سماج کے نچلے طبقے نے تعلیم پانے اور خوشحالی آنے کے بعد ان ہی طور طریقوں کو اختیار کر لیا ہے، تاکہ سماج میں اس کا درجہ بلند ہو جائے۔ چنانچہ جدید طور طریقوں کو اختیار کرنے سے بجائے عورتوں کی حیثیت پر اچھا اثر پڑنے کے برا اثر پڑا۔ دوسری طرف متوسط طبقہ جو پرانی اونچی ذاتوں یا طبقوں سے پیدا ہوا تھا۔ اس نے ان میں کچھ اقدار کو سماجی اور معاشی دباؤ سے ترک کر دیا ہے۔ ان متضاد قوتوں کی بیک وقت موجودگی کی وجہ سے صورتِ حال واضح نہیں ہے۔

ہم نے مندرجہ ذیل چیزوں پر بھی غور کیا ہے۔

۱۔ وہ سماجی و قانونی اصلاحات جو عورتوں کی ترقی کی راہ میں رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے کی گئی ہیں۔

۲۔ وہ مزدوری کے قوانین جن کے ذریعہ یہ اہتمام کیا گیا کہ کام کرنے والوں کے لیے بہتر حالات پیدا کیے جائیں۔

۳۔ وہ پالیسیاں اور پروگرام جو سماجی اور معاشی ترقی کے لیے اختیار کیے گئے۔ (ان میں تعلیم، پیشوں کی ٹریننگ، حفظانِ صحت، خاندانی منصوبہ بندی، ترقی و بہبود کے پروگرام بھی شامل ہیں) جن کا مقصد یہ تھا کہ عورتوں کے لیے زیادہ بہتر مواقع فراہم ہو سکیں۔

۴۔ وہ نظریات یا مقاصد جن کو پیش نظر رکھ کر ایسی اصلاحی تحریکیں آزادی کی تحریک

کے سلسلے میں شروع ہوئیں۔ جنھوں نے عورتوں کی ترقی کے لیے کام کیا ان میں منظم کوششیں بھی شامل ہیں، اور انفرادی بھی۔ ظاہر ہے کہ ان سب امور کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے مندرجۂ ذیل چیزوں کو جانچنے کی ضرورت تھی:

۱۔ عورتوں اور مردوں کے رویوں کے ساتھ ساتھ وہ بنیادی تنظیم جو مطلوبہ مقاصد کو حاصل کرنے میں مددگار رہے۔ ہمیں یہ بھی دیکھنا تھا کہ روایتی اقدار نیز انسانی حقوق کی جدید اقدار کا جیسے مساوات اور سماجی انصاف، مختلف النوع تہذیبوں والے سماج میں عورتوں کے رول پر کیا اثر پڑا ہے۔

ہمارے اس جائزے سے کچھ مثبت کچھ منفی عوامل سامنے آئے ہیں، جو عورت کی حیثیت پر اثر انداز ہوئے ہیں۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ تعلیم کی ترقی، سیاسیات اور فلاح و بہبود کے کاموں میں حصّہ لینا۔ یہ چیزیں مجموعی طور پر عورتوں کی حیثیت کو بہتر بنانے کے حق میں ہیں۔ اس کے ساتھ ہم نے ان عوامل کا یقین بھی کیا ہے (۱)، جو عورت کے رول اور حیثیت میں خاطر خواہ تبدیلی لانے میں مانع ہیں۔ (۲) وہ مجبوریاں جو عورتوں کے مختلف گروپوں کو اپنے حقوق حاصل کرنے اور معاشرے میں متعدد رول ادا کرنے میں رکاوٹ ڈالتی ہیں۔ ہمیں یہ معلوم کرکے افسوس ہوا کہ بعض حالات میں یہ رکاوٹیں معاشی ترقی کے عمل کی وجہ سے اور بڑھ گئی ہیں۔ مثلاً روایتی معیشت میں عورتوں کی بڑی تعداد پیداوار کے عمل میں پوری طرح حصّہ لیتی تھی ترقی اور تجدد کے بڑھتے ہوئے رجحانات نے عورتوں کے لیے روزگار کے روایتی راستے بند کر دیے۔ تعلیم اور پیشوں کی ٹریننگ کی کمی کی وجہ سے عورتیں اس جدید معیشت میں نہیں کھپ سکتی ہیں، جو ہمارے ملک میں رواج پا رہی ہے۔

ہم نے اپنی اس تحقیق کے دوران ان بڑے گروپوں کی بدلتی ہوئی کیفیتوں کے اثر اور نوعیت کو جاننے کے لیے بہت سے پیمانوں سے کام لیا۔ وہ تخمینے جن سے تعداد کا اندازہ کرنا تھا، وہ شرح پیدائش، موت و جنس کے تناسب، معیشت اور سیاست میں حصّہ لینے والی عورتوں کی شرح، ناخواندگی اور تعلیم کی شرح کے اہم اعداد و شمار سے کیا۔ لیکن ان میں سے کسی کا بھی بامعنی مطالعہ نہیں ہو سکتا تھا جب تک کہ ہمیں ان کی کیفیت کا اندازہ نہ ہو اور ہم اپنے ذہن میں اس بات کو نہ رکھیں کہ یہ معلومات سماجی اور تہذیبی فرق کی

وجہ سے محدود ہیں۔ ہمیں مطلوبہ سماجی مقاصد اور ان کے حصول میں کافی فرق نظر آیا ہے۔ حقیقی صورت، علامتی حیثیت اور واقعی حیثیت میں بڑا فرق ہے۔ قومی اور ریاستوں کے اوسطوں کے مطابق عورتوں میں خواندگی، تعلیم، عمر، اور سیاست میں حصّہ لینے والی عورتوں کی شرح بڑھ رہی ہے، مگر یہ رجحانات اور ان کے ساتھ وہ کامیابی جو خواتین کی بہت تھوڑی تعداد نے حاصل کی ہے، ان کو دیکھ کر یہ غلط تصور پیدا ہو سکتا ہے کہ ایک اوسط ہندوستانی عورت کا رتبہ سماج میں بہت اونچا ہے۔ ہم نے اپنی تحقیق میں دیکھا کہ ترقی کے معاملے میں علاقوں، ذاتوں اور مختلف گروپوں میں کافی فرق ہے۔ اس لیے صرف ان پیمانوں پر جن سے تعداد کا اندازہ ہوتا ہے، بھروسہ کرنا گمراہ کن ہے۔ اس لیے ہم نے دوسرے اور طریقے اور تکنیک استعمال کرکے ان اندازوں کی تکمیل کی (جیسے بنیادی دستاویزیں خالص ادبی شائع شدہ اور غیر شائع شدہ مواد کا مطالعہ) جس سے حقیقی تصویر سامنے آ سکے۔ ہم نے اس کے لیے مختلف جگہ کے سفر کیے، تجرباتی مطالعہ کیا۔ اور طرح طرح کے مختلف تہذیبی اور سماجی سطح کے لوگوں سے بات چیت کر کے صحیح معلومات حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔

ہم نے اپنی اس تحقیق کو صرف آزادی کے عہد تک ہی محدود نہیں رکھا ہے، بلکہ جہاں ضرورت محسوس ہوئی ہم نے قبل آزادی کے عہد کو بھی مدِ نظر رکھا ہے۔ کیونکہ کسی بھی تغیر پذیر سماج کا جائزہ ماضی، حال اور مستقبل کو ملحوظ رکھ کر ہی لیا جا سکتا ہے۔

حیثیت، کی اصطلاح سماجی یا ذیلی نظام میں کسی شخص کی اضافی حیثیت کو ظاہر کرتی ہے۔ جو حقوق و فرائض کے لحاظ سے ہی دوسروں سے الگ جانی جاتی ہے۔ اس لیے سماج میں ہر فرد کا رول اور حیثیت دوسرے سے الگ ہے یہ لازمی ہے کہ مثالی رول، متوقع رول اور واقعی رول میں امتیاز کیا جائے۔ ان مثالوں کے اختلاف سے افراد کے رول کے تصور میں فرق ہو جاتا ہے۔ حیثیت رول ادا کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس سے ان حقوق اور مواقع پر جو عورتوں کے لیے ریاست اور سماجی اور تہذیبی اداروں نے فراہم کیے ہیں، روشنی پڑتی ہے، یہ ضروری نہیں ہے کہ ان میں آپس میں تال میل بھی ہو۔ متوقع اور حقیقی رول میں فرق کی وجہ تبدیلی کا عمل ہے۔

ان مسائل پر ہماری تفصیلی جانچ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان کے حالات کو دیکھتے

ہوئے، یہاں عورت کی حیثیت کا آسانی سے تعین نہیں ہو سکتا ہے۔ عدم مساوات اور عدم توازن کے اثرات کی وجہ سے مختلف گروہوں کی عورتوں کی حیثیت میں مختلف طریقے سے تبدیلی آئی ہے۔ ان مجبوریوں اور رکاوٹوں کو سمجھنے کے لیے جو سماج میں عورتوں کے متعدد رول ادا کرنے میں مانع ہیں ہمیں یہ بھی نظر میں رکھنا ہوگا کہ ان عورتوں کی حیثیت نظام معیشت اور نظام ریاست کے نزدیک سماجی اختلافات کی وجہ سے آبادی کے الگ گروپ کی سی ہے، یکساں نہیں ہے۔ اگرچہ ہندوستانی سماج کی تقسیم ذات، قوم اور طبقوں کے لحاظ سے ہے۔ لیکن ہمارے مقاصد کے لیے اسے تین بڑے حصّوں میں تقسیم کر دینا کافی ہے۔

۱۔ وہ عورتیں جن کو زندگی بسر کرنے کے لیے ناگزیر ضروریات زندگی بھی میسّر نہیں ہیں۔

۲۔ وہ عورتیں جنھیں کبھی مالی فراغت حاصل ہوتی ہے، کبھی بس گزر اوقات کے لیے مل جاتا ہے اور بعض اوقات روزی کمانے کے وسائل میسّر نہ ہونے کی وجہ سے وہ محتاجی کی سطح پر پہنچ جاتی ہیں۔

۳۔ وہ عورتیں جنھیں مستقل طور پر معاشی فراغت حاصل ہے۔

ہم نے اپنے کام کے لیے یہ تین رہنما اصول بنائے ہیں۔

۱۔ عورتوں اور مردوں کے درمیان مساوات بہت ضروری ہے۔ کیونکہ یہ قوم کی معاشی سیاسی اور سماجی ترقی کی بنیادی شرط ہے۔

۲۔ عورتوں کو محتاجی اور کمتر حیثیت سے نجات دلانے کے لیے سب سے مقدم چیز یہ ہے کہ انھیں روزگار کے زیادہ مواقع اور صلاحیت حاصل ہو۔

۳۔ چونکہ عورت ماں کی حیثیت سے بچّوں کی حفاظت دیکھ بھال اور تربیت کا کام انجام دیتی ہے، اس لیے سماج پر اس کی فلاح کی خاص ذمّہ داری عائد ہوتی ہے۔ بچّوں کی نگہداشت اور تربیت کی ذمے داری میں ماں، باپ اور سماج برابر کے شریک ہیں۔

۴۔ عورت گھر والی کی حیثیت سے خانہ داری کا جو کام انجام دیتی ہے، اسے سماجی اور معاشی لحاظ سے مفید اور اہم کام سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ یہ بھی قومی ترقی اور بحث کے لیے ضروری ہے۔

۵۔ شادی اور ماں بننے کو رکاوٹ نہیں بننا چاہیے، جو عورت کو قومی ترقی میں پورا اور مناسب رول ادا کرنے میں مانع ہو۔ جو پورے سماج (جس میں عورت بھی شامل ہیں) کی ذمہ داری ہے۔

۶۔ وہ معذوریاں اور عدم مساوات جس کا شکار عورتیں ہیں، صرف ان ہی کے لیے نہیں دور کی جا سکتیں، بلکہ اس کو ہر قسم کی عدم مساوات اور مختلف سماجی اداروں کے ظالمانہ رواجوں کو ختم کرنے کی تحریک کا ایک جزو ہونا چاہیے۔

۷۔ اس منزل کی طرف قدم بڑھانے کے لیے جو ملک کے دستور نے ہمارے لیے معین کی ہے، بعض خاص تدبیروں کی ضرورت ہے جو قانونی مساوات کو حقیقی مساوات میں بدل دیں۔

باب دوم

عام سماجی حالات اعداد و شمار کی روشنی میں

یہ بات بہت پہلے مان لی گئی ہے کہ ہندوستان میں عورتوں کی زندگی کے کچھ مخصوص پہلوؤں جیسے بچپن کی شادی، ناخواندگی کی شرح اور شرح اموات میں زیادتی اور روزی کمانے کے مواقع کی کمی سے یہ صاف ظاہر ہے کہ یہاں سماج میں عورتوں کا درجہ مردوں کے مقابلے میں کم تر ہے۔ اور اب جبکہ ان میں سے بعض پہلوؤں میں کچھ بہتر تبدیلیاں بھی رونما ہو رہی ہیں۔ پھر بھی دستیاب شہادتوں سے یہ ظاہر ہے کہ مردوں اور عورتوں میں عدم مساوات کا رجحان ہے۔

بچپن کی شادی

۱۹۷۱ء میں مردم شماری کے مطابق سن ۱۹۱۱-۱۹۰۱ کے درمیان شادی کے وقت مردوں کی اوسط عمر ۲۰٫۲ سے بڑھ کر ۷۱-۱۹۶۱ میں ۲۲٫۲ ہو گئی۔ اس کے مقابلے میں دیہاتوں میں عورتوں کی شادی کی اوسط عمر ۱۶٫۱ تھی اور شہروں میں ۱۹٫۲ ہے۔ جبکہ مردوں کی بالترتیب ۲۱٫۶ اور ۲۴٫۳ تھی۔ ایک تفصیلی جائزے کے مطابق ہندوستان میں ایک تہائی ضلعوں میں جو زیادہ تر مدھیہ پردیش، بہار، راجستھان اور اتر پردیش کی ریاستوں میں واقع ہیں۔ ۱۹۶۱ء میں عورتوں کی اوسط عمر پندرہ سال سے کم ہے۔ مگر ریاست کیرالہ میں کوئی بھی ایسا ضلع نہیں ہے جس میں عورتوں کی شادی کی عمر پندرہ سال سے کم ہو۔ مردم شماری کی معلومات سے جو تصویر سامنے آتی ہے، وہ خاصی غیر اطمینان بخش ہے۔ لیکن اصلی صورت حال اس سے بھی خراب ہے۔ یہ تو مردم شماری میں فرض کیا گیا ہے کہ دس سال سے کم عمر میں کسی عورت کی

اختلافات ہیں کہ عورتوں کی حقیقی حیثیت کے تعین کے لیے قومی اور ریاستی اعداد و شمار سے مدد لینا بے معنی ہے ۔ ان مسائل کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ وہ کون کون سے گروپ ہیں جو سماجی و معاشی حیثیت یا ایک علاقے میں رہنے یا ایک مذہب رکھنے کی بنا در حقیقت بن گئے ہیں، اس لیے اوسط اعداد و شمار کی تشکیل میں ان کا سب سے اہم حصہ ہوتا ہے۔ مثلاً قلتِ خوراک اور شرح اموات اور ایسے ہی دوسرے عوامل کی تحقیقات کے سلسلے میں اس کو جانچنا ضروری ہے کہ ان رجحانات میں کیا فرق ہے جو سماج کے مختلف طبقوں میں ملتے ہیں، اسی سے صحیح اندازہ ہو سکے گا۔ اس قسم کے جائزوں سے ہندوستان میں عورتوں اور مردوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے باہمی تناسب میں جو فرق ہے اس کے وجوہ آخر میں کچھ بھی ہوں لیکن یہ سب سے بڑی علامت ہے اس کی کہ مجموعی طور پر ہندوستانی سماج میں عورت کی حیثیت مرد کے مقابلے میں کم تر ہے۔

خواندگی

ابھی تک عورتوں کی خواندگی کی ترقی بر ابر تاریک تصویر پیش کر رہی ہے ۔ ۱۹۷۱ء میں خواندگی کی شرح عورتوں میں ۱۸٫۴۴ فیصدی اور مردوں میں ۳۹٫۵ فی صدی ہے ۔ عورتوں کی خواندگی شرح ۱۰ - ۱۴ سال کی گروپ کی عورتوں میں سب سے زیادہ ہے (۴۲ و ۲۰ فیصدی) دیہاتوں میں عورتوں کی خواندگی کی شرح صرف ۱۳٫۲ فیصدی ہے اور شہروں میں ۴۲٫۳ فیصدی۔ کیرالہ میں عورتوں کی خواندگی کی شرح سب سے زیادہ ہے یعنی ۵۳۱ فیصدی دیہاتوں میں اور ۶۰٫۲۶ فیصدی شہروں میں ۔ سب سے تشویشناک صورت حال راجستھان میں ہے جہاں عورتوں کی خواندگی کی شرح دیہاتوں میں ۴ فیصدی اور شہروں میں ۲۹٫۷ ہے۔ دیگر ریاستوں کی صورت حال نسبتاً بہتر ہے، لیکن ان کا کیرالہ سے کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ کل خواندہ عورتوں میں ۵۰ فیصدی ایسی ہیں جن کا کوئی تعلیمی معیار نہیں ہے ۔ ۱۰ فیصدی میٹرک پاس ہیں اور ۲٫۴ فیصدی گریجویٹ یا اس سے زیادہ تعلیم یافتہ ہیں۔ ان میں سے چند عورتوں سے جو اعلیٰ تعلیم یافتہ [illegible] ہیں ہندوستانی عورت کی جو تصویر سامنے آتی ہے وہ یہاں کی ایک اوسط درجے کی عورت کی کمتر حیثیت

اور تعلیمی معیار کو بجائے ظاہر کرنے کے اس پر پردہ ڈال دیتی ہے۔

مزدور طبقے کی عورتیں

عورت کی حیثیت کو بہتر کرنے کے لیے جو کوششیں کی جا رہی ہیں، ان کی ناکامی کا اندازہ ان کے لیے مزدوری کے مواقع کی کمی سے اچھی طرح کیا جا سکتا ہے۔ کل مزدور پیشہ عورتوں کا اوسط ۱۹۱۱ء میں ۴۴.۳۴ تھا اور ۱۹۶۱ء میں گھٹ کر ۵۳ء ۳۱ فیصدی رہ گیا۔ عورتوں کی کل آبادی میں مزدور پیشہ عورتوں کا اوسط ۱۹۱۱ء میں ۷۳ء۳۳ فیصدی تھا۔ ۱۹۶۱ء میں گھٹ کر ۹۶ء۲۷ فیصدی اور ۱۹۷۱ء میں صرف ۸۶ء۱۱ فیصدی رہ گیا۔؎ ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق کل ۳ کروڑ دس لاکھ عورتیں مزدوری کرتی ہیں۔ دو کروڑ اسّی لاکھ دیہات میں اور تیس لاکھ شہروں میں۔ ان میں سے ۸۱ فیصدی عورتیں کھیتی باڑی کا کام کرتی ہیں صرف ۶ فیصدی معیشت کے منظم سیکٹر میں اور باقی غیر منظم سیکٹر زرعی اور غیر زرعی پیشوں میں ہیں۔ دیہاتوں میں صرف ۱۲ فیصدی عورتیں مزدوری کرتی ہیں۔ اور شہروں میں ان عورتوں کی تعداد ۷ فیصدی ہے۔ مزدور پیشہ عورتوں میں ۹۸ فیصدی عورتیں ناخواندہ ہیں۔ اور غیر کامگار عورتوں میں ۸۱ فیصدی عورتیں خانہ داری میں مصروف ہیں۔ صرف ۹ء۸ فیصدی عورتیں کل وقتی طالب علم ہیں اور ۲ء۰ فیصدی عورتیں ایسی ہیں جن کے ذاتی ذرائع آمدنی ہیں۔ تقریباً تمام غیر کامگار عورتیں مکمل طور پر مردوں کی دست نگر ہیں۔

ملک کے اندر نقل مقام

پچھلی دو مردم شماریوں کے مطابق مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی بھاری اکثریت ملک کے اندر نقل مقام کرتی ہے۔ اس کا تناسب یہ ہے کہ ایک ہزار مردوں کے مقابلے میں ۲۱۴۰ عورتوں کی تعداد ہے جو دیہات سے دیہات اور شہروں سے دیہات میں نقل مقام کرتی ہیں۔ ان میں عورتوں کی اکثریت ہے اور دیہاتوں سے شہروں، شہروں سے شہروں

؎ اگرچہ اس کمی کی ایک وجہ یہ ہے کہ اب مزدوری کی تعریف بدل گئی ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ عورتوں کی مزدوری کی شرح میں برابر کمی ہو رہی ہے، اس میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔

شادی نہیں ہوتی ہے بے بنیاد ہے کیونکہ ہمارے علم میں ایسے بھی متعدد واقعات آئے ہیں کہ شیر خوار بچیوں کی شادی ہوئی ہے۔ اگرچہ ایسے واقعات اب عرفی طور پر کم ہو رہے ہیں۔ لیکن ان کی صحیح تعداد معلوم نہیں ہو سکتی ہے۔ بہرحال اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ دیہاتوں میں بچپن کی شادی اور بیوہ کی دوسری شادی نہ ہونے کا رواج اب بھی چلا آرہا ہے۔ اس لیے یہ سفارش کی جاتی ہے کہ موجودہ مفروضے کو ترک کر دیا جائے اور شادیوں کے ریکارڈ رکھے جائیں۔

عورتوں کی شرح اموات اور اس کا تناسب مردوں کی شرح اموات کے ساتھ

اب جبکہ عمر کا متوقع اوسط بڑھ گیا ہے۔ مردوں اور عورتوں کی متوقع عمر کے اوسط میں نمایاں فرق ہے ۱۹۶۱-۱۹۷۱ کی مردم شماری کے مطابق مردوں اور عورتوں دونوں کی متوقع عمر کا اوسط ۴۷ سال تھا۔ ۱۹۶۱-۷۱ میں مردوں کا اوسط عمر بڑھ کر ۴۷٫۱ سال ہوا۔ جبکہ عورتوں کا اوسط صرف ۴۵٫۶ رہا۔ اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ مردوں اور عورتوں کی متوقع عمر کے اوسط کے درمیان فرق بڑھتا جارہا ہے۔ چالیس سال سے نیچے کی عمر کی عورتوں کا متوقع اوسط مردوں کے مقابلے میں کم ہے۔ گجرات، مہاراشٹر، پنجاب، راجستھان اور اترپردیش کے دیہاتی علاقوں میں شیر خوار بچیوں کی موت کی شرح کافی زیادہ ہے۔ بارہ ریاستوں کے دیہاتوں کے تخمینے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شیر خوار بچیوں کی موت کی شرح ۱۴۸ فی ہزار ہے۔ اور اس کے مقابلے میں بچوں کی ۱۳۲ فی ہزار ہے، جبکہ نوزائیدہ بچوں اور بچیوں کی موت کی شرح میں بہت کم فرق ہے۔ یعنی بچوں کی ۴۷ فی ہزار اور بچیوں کی ۶۷ فی ہزار ہے۔ لیکن پیدائش کے کچھ عرصے کے بعد مرنے والی بچیوں اور بچوں کی شرح میں بہت فرق ہے۔ بچوں کی ۵۹ اور بچیوں کی ۷۰ فی ہزار ہے۔ ہندوستان کے دیہاتوں میں ۴ سال کی عمر کے بچوں کی موت کی شرح ۵۵ فی ہزار ہے اور بچیوں کی ۷۰ فی ہزار ہے ۵ سے ۱۴ سال تک کے عمر کے لڑکوں کی موت کی شرح ۴٫۵۲ فی ہزار ہے اور اس کے مقابلے میں لڑکیوں کی ۵٫۹۵ فی ہزار ہے۔ ۱۵-۴۴ کے عمر گروپ میں عورتوں کی موت کی شرح لڑکوں کے مقابلے میں کافی زیادہ ہے۔ مجموعی صورت حال یہ ہے کہ سن ۱۹۷۰ء میں ہندوستان کے دیہاتوں میں ۱۸ فی ہزار موتیں مردوں کی ہوئیں اور ۲۰ فی ہزار عورتوں کی۔ ہندوستان میں عورتوں

کی آبادی کا ۱۹۰۱ء میں [illegible] کروڑ تھی۔ اور ۱۹۷۱ میں بڑھ کر [illegible] کروڑ ہو گئی ہے۔ مگر عورتوں کی تعداد فی ہزار مردوں کے مقابلے میں برابر گھٹتی رہی ہے۔ سن ۱۹۵۱ء میں ہر ایک ہزار مردوں کے لیے ۹۴۶ عورتیں تھیں مگر ۱۹۷۱ء میں یہ تناسب گھٹ کر ایک ہزار مردوں کے لیے ۹۳۰ عورتوں تک آگیا۔

اگر ہم مردوں اور عورتوں کے تناسب پر عمر کے گروپ ۱۵ - ۴۰ سال کی عمر کے گروپ کا تناسب ملک کی مجموعی آبادی کے تناسب سے بھی کم ہے۔ ۲۰ - ۲۹ سال کی عمر کے گروپ میں عورتوں کی تعداد مردوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہے۔ خاص طور سے میگھالیہ آندھرا پردیش، کرناٹک، اڑیسہ، تامل ناڈو اور تری پورہ ریاستوں کے دیہی علاقوں میں۔ ہندوستان کی ریاستوں میں صرف کیرالہ ایک ایسی ریاست ہے، جس میں عورتوں کی تعداد ۱۹۲۱ء سے اب تک مردوں کے مقابلے میں زیادہ چلی آرہی ہے۔ اڑیسہ اور تامل ناڈو میں ۱۹۶۱ء تک یہی رجحان نظر آتا تھا۔ لیکن اس کے بعد سے اب تک صورت حال بالکل برعکس ہے۔ ہندوستان کی سب سے خوشحال ریاست پنجاب کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اگر اسے امتیاز کہا جا سکے کہ وہاں عورتوں کا تناسب مردوں کے مقابلے میں سب سے کم ہے۔ (۸۷۴) اور دوسری ریاستوں میں جہاں مردوں اور عورتوں کا تناسب قومی تناسب سے کم ہے، وہ ہیں جموں اور کشمیر (۸۸۲) اتر پردیش (۸۸۳) مغربی بنگال (۸۹۲) آسام (۹۰۱) اور راجستھان (۹۱۹)

مردم شماری کرنے والوں نے ہندوستان میں آبادی کے اس فرق کی توجیہ کے لیے کئی مفروضے پیش کیے ہیں۔ لیکن ان میں سے صرف اس کو عام طور پر مانا گیا ہے کہ اس کا خاص سبب یہ ہے کہ شیر خوارگی کی عمر سے لے کر بچہ پیدا کرنے تک عورتوں کی موت کی شرح زیادہ ہے آخری چند دہائیوں میں حفظان صحت کے انتظام میں جو ترقی ہوئی ہے اس کا اثر مردوں اور عورتوں پر مختلف حد تک ہوا ہے اور عورتوں و مردوں کی تعداد میں فرق بڑھ گیا ہے۔

یہ بات خاص طور سے قابلِ ذکر ہے کہ ہمارے ملک میں جہاں معاشی اور سماجی عوامل عورتوں کی حیثیت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور اتنی زیادہ عدم مساوات اور

؎ یہ ہمیشہ ممکن نہیں ہے کہ جنس کے تناسب کو دوسرے عوامل جیسے خواندگی اور تعلیمی سطح وغیرہ سے ملایا جائے۔ کیونکہ ان کے متعلق یہ معلومات ہیں وہ ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔

اختلافات ہیں کہ عورتوں کی حقیقی حیثیت کے تعین کے لیے قومی اور ریاستی اعداد و شمار
سے مدد لینا بے معنی ہے۔ ان مسائل کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے اس کا لحاظ رکھنا ضروری
ہے کہ وہ کون کون سے گروپ ہیں جو سماجی و معاشی حیثیت یا ایک علاقے میں رہنے
یا ایک مذہب رکھنے کی بنا در حقیقت بن گئے ہیں، اس لیے اوسط اعداد و شمار کی تشکیل
میں ان کا سب سے اہم حصہ ہوتا ہے۔ مثلاً قلتِ خوراک اور شرح اموات اور ایسے ہی
دوسرے عوامل کی تحقیقات کے سلسلے میں اس کو جانچنا ضروری ہے کہ ان رجحانات میں
کیا فرق ہے جو سماج کے مختلف طبقوں میں ملتے ہیں، اسی سے صحیح اندازہ ہو سکے گا۔ اس
قسم کے جائزوں سے ہندوستان میں عورتوں اور مردوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے
باہمی تناسب میں جو فرق ہے اس کے وجوہ آخر میں کچھ بھی ہوں لیکن یہ سب سے بڑی علامت
ہے اس کی کہ مجموعی طور پر ہندوستانی سماج میں عورت کی حیثیت مرد کے مقابلے میں کم تر
رہی ہے۔

خواندگی

ابھی تک عورتوں کی خواندگی کی ترقی برابر تاریک تصویر پیش کر رہی ہے۔ ۱۹۷۱ء
میں خواندگی کی شرح عورتوں میں ۱۸٫۴۴ فیصدی اور مردوں میں ۳۹٫۴۵ فی صدی ہے۔
عورتوں کی خواندگی شرح ۱۰ - ۱۴ سال کی گروپ کی عورتوں میں سب سے زیادہ ہے (۴۲و۲۴
فیصدی) دیہاتوں میں عورتوں کی خواندگی کی شرح صرف ۱۳٫۲۰ فیصدی ہے اور شہروں میں
۴۲٫۳۰ فیصدی۔ کیرالہ میں عورتوں کی خواندگی کی شرح سب سے زیادہ ہے یعنی ۵۱٫۳۰ فیصدی
دیہاتوں میں اور ۶۰٫۱۶ فیصدی شہروں میں۔ سب سے تشویش ناک صورت حال راجستھان
میں ہے جہاں عورتوں کی خواندگی کی شرح دیہاتوں میں ۴ فیصدی اور شہروں میں ۲۹٫۱۱
ہے۔ دیگر ریاستوں کی صورت حال نسبتاً بہتر ہے، لیکن ان کا کیرالہ سے کوئی مقابلہ نہیں
ہے۔ کل خواندہ عورتوں میں ۶۰ فیصدی ایسی ہیں جن کا کوئی تعلیمی معیار نہیں ہے۔ ۱۰
فیصدی میٹرک پاس ہیں اور ۲٫۴ فیصدی گریجویٹ یا اس سے زیادہ تعلیم یافتہ ہیں۔ ان
میں سے چند عورتوں سے جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں یا اونچے عہدوں پر پہنچ گئی ہیں ہندوستانی
عورت کی جو تصویر سامنے آتی ہے وہ یہاں کی ایک اوسط درجے کی عورت کی کم تر حیثیت

اور تعلیمی معیار کو بجائے ظاہر کرنے کے اس پر پردہ ڈال دیتی ہے۔

مزدور طبقے کی عورتیں

عورت کی حیثیت کو بہتر کرنے کے لیے جو کوششیں کی جا رہی ہیں، ان کی ناکامی کا اندازہ ان کے لیے مزدوری کے مواقع کی کمی سے اچھی طرح کیا جا سکتا ہے۔ کل مزدور پیشہ عورتوں کا اوسط ۱۹۱۱ء میں ۳۴.۴۴ تھا اور ۱۹۶۱ء میں گھٹ کر ۳۱.۵۲ فیصدی رہ گیا۔ عورتوں کی کل آبادی میں مزدور پیشہ عورتوں کا اوسط ۱۹۱۱ء میں ۳۳.۷۳ فیصدی تھا۔ ۱۹۶۱ء میں گھٹ کر ۲۶.۹۲ فیصدی اور ۱۹۷۱ء میں صرف ۱۱.۸۷ فیصدی رہ گیا۔* ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق کل ۳ کروڑ دس لاکھ عورتیں مزدوری کرتی ہیں۔ دو کروڑ اسی لاکھ دیہات میں اور تیس لاکھ شہروں میں۔ ان میں سے ۸۱ فیصدی عورتیں کھیتی باڑی کا کام کرتی ہیں صرف ۶ فیصدی معیشت کے منظم سیکٹر میں اور باقی غیر منظم سیکٹر زرعی اور غیر زرعی پیشوں میں ہیں۔ دیہاتوں میں صرف ۱۲ فیصدی عورتیں مزدوری کرتی ہیں۔ اور شہروں میں ان عورتوں کی تعداد ۷ فیصدی ہے۔ مزدور پیشہ عورتوں میں ۹۸ فیصدی عورتیں ناخواندہ ہیں۔ اور غیر کامگار عورتوں میں ۸۵ فیصدی عورتیں خانہ داری میں مصروف ہیں۔ صرف ۱.۹ فیصدی عورتیں کل وقتی طالب علم ہیں اور ۰.۲ فیصدی عورتیں ایسی ہیں جن کے ذاتی ذرائع آمدنی ہیں۔ تقریباً تمام غیر کامگار عورتیں مکمل طور پر مردوں کی دست نگر ہیں۔

ملک کے اندر نقل مقام

پچھلی دو مردم شماریوں کے مطابق مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی بھاری اکثریت ملک کے اندر نقل مقام کرتی ہے۔ اس کا تناسب یہ ہے کہ ایک ہزار مردوں کے مقابلے میں ۲۲۱۰ عورتوں کی تعداد ہے جو دیہات سے دیہات اور شہروں سے دیہات میں نقل مقام کرتی ہیں۔ ان میں عورتوں کی اکثریت ہے اور دیہاتوں سے شہروں، شہروں سے شہروں

---

* اگرچہ اس کمی کی ایک وجہ یہ ہے کہ اب مزدوری کی تعریف بدل گئی ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ عورتوں کی مزدوری کی شرح میں برابر کمی ہو رہی ہے، اس میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔

میں جو نقل مقام ہوتا ہے اس میں مردوں کی اکثریت ہے۔ اس وسیع پیمانے پر ملک کے اندر عورتوں کا نقل مقام تھوڑے یا درمیانی درجے کے فاصلے پر ہوتا ہے، جس کی وجہ شادی کے علاوہ روزگار کی کمی اور بے کاری ہے۔

معیشت میں حصّہ لینے کے مواقع کے لحاظ سے شہر کا ماحول عورت کے لیے سازگار نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اس کا ایک اور سبب شادی کے رشتوں کا ٹوٹنا ہے۔ بیوگی، شوہروں کا بیویوں کو چھوڑ کر چلا جانا یا ان سے قطع تعلق کر لینا۔ نقل مقام سے متعلق معلومات سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ چونکہ عورتوں میں بے بسی اور عدم تحفظ زیادہ ہے اس لیے ان کی حیثیت مردوں سے کم تر ہے۔

اس فرق سے متعلق چند اشارے

نقشہ نمبر ۱ میں اعداد و شمار کی صورت میں عورت اور مرد کے مابین فرق کی ہلکی سی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ اعداد و شمار خود اپنی تصویر ہیں۔

نقشہ نمبر ۱

۱۹۷۱ کی مردم شماری کی رو سے مردوں اور عورتوں کی
آبادی اور چند خصوصیات میں فرق ہے۔

نمبر شمار کیفیت آبادی کے لحاظ سے	عورتیں ایک ہزار مردوں کے مقابلے میں
۱۔	
کل آبادی	۹۳۰
دیہاتی	۹۳۹
شہری	۸۵۸
مذہب کے لحاظ سے	
۲۔ ہندوؤں میں	۹۳۰
مسلمانوں میں	۹۴۳
عیسائیوں میں	۹۸۴
سکھ	۹۵۹
بودھ	۹۶۲
جین	۹۴۰
۳۔ عمر گروپ	
۰ —— ۴	۹۶۹
۵ —— ۹	۹۳۵
۱۰ —— ۱۴	۸۸۷
۱۵ —— ۱۹	۸۸۳
۲۰ —— ۲۴	۱۰۰۸

نمبر شمار کیفیت آبادی کے لحاظ سے	عورتوں کی تعداد ایک ہزار مردوں کے مقابلے میں
۲۵ ۲۹	۱،۰۲۷
۳۰ ۳۴	۹۹۰
۳۵ ۳۹	۹۱۶
۴۰ ۴۴	۸۸۲
۴۵ ۴۹	۸۳۹
۵۰ ۵۴	۸۴۷
۵۵ ۵۹	۹۲۳
۶۰ ×	۹۶۰
۴۔ تعلیم کے لحاظ سے	
ناخوانده	۱،۳۴۲
خوانده اور تعلیم یافتہ	۴۷۴
مڈل پاس	۳۷۱
میٹرک یا ہائر سکنڈ پاس	۲۷۷
ٹیکنیکل اور غیر ٹیکنیکل سرٹیفکٹ حاصل کرنے والی	۳۲۷
ڈپلوما سرٹیفکٹ یافتہ	۳۳۵
گریجویٹ یا اس سے زیادہ تعلیم یافتہ	۲۴۶
۵۔ ازدواجی لحاظ سے	
کل تعداد	۹۳۱
غیر شادی شدہ	۷۶۲

نمبر شمار	کیفیت	عورتوں کی تعداد ایک ہزار مردوں کے مقابلے میں
	شادی شدہ	۱،۰۲۴
	بیوہ	۲،۷۷۲
	جن کو طلاق ہو گئی یا قانونی علیحدگی ہو گئی	۱،۶۳۰
	جن کی ازدواجی حیثیت واضح نہیں ہے	۳۲۸
	مزدور پیشہ عورتیں	
	کل مزدوری پیشہ عورتیں	۲۱۰
	کاشتکاری کرنے والی	۱۳۵
	کھیتوں میں مزدوری کرنیوالی عورتیں	۴۹۸
	مویشی پالنے والی جنگلوں میں کام کرنے والی، ماہی گیر، شکار کا کام کرنے والی، باغبانی اور ایسے ہی دوسرے کام کرنے والی عورتیں	۲۳۲
	کانوں میں کام کرنے والی، شکار کرنے والی، چیزوں کو بنانے، یا ان کی مرمت وغیرہ کرنے والی عورتیں	۱۵۵
	(الف) گھریلو صنعتوں میں کام کرنیوالی	۲۶۵
	(ب) گھریلو صنعتوں کے علاوہ دوسرے	

نمبر شمار	کیفیت	عورتوں کی تعداد ایک ہزار مردوں کے مقابلے میں
	کام کرنے والی	۸۸
	تعمیرات	۱۰۱.
	تجارت اور دوسرے کاروبار کرنے والی عورتیں	۵۹.
	ذرائع نقل و حمل و ذخیرہ سازی ذرائع رسل و رسائل میں کام کرنے والی	۳۴.
	دوسرے کام کرنے والی عورتیں	۱۶۵.
	جو مزدوری پیشہ نہیں ہیں	۱۰،۷۲۶
۷.	جو کسی خاص وجہ سے مزدوری نہیں کرتی ہیں۔	
	کل وقتی طالب علم	۴۸۰
	خانہ داری کرنے والی عورتیں	۶،۷۴۵.
	وہ عورتیں جو مردوں کی دست نگر ہیں یا شیرخوار بچیاں	۱۰،۰۸۴.
	جو ریٹائرڈ ہیں جنہوں نے گھر کرایہ پر اٹھا رکھے ہیں اور جن کی ذاتی آمدنی کے دوسرے ذرائع ہیں۔	۲۵۶.
	فقیر آوارہ گرد، جیل یا پاگل خانوں میں یا خیراتی اداروں میں رہنے والی عورتیں	۲۵۲.
	اور دوسری عورتیں	۱۹۰

ان معلومات کا ماخذ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری ہے

باب سوم

سماجی اور تہذیبی صورت حال

تعارف

معاشرے میں عورت کی حیثیت کا اندازہ کرنے کے لیے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ سماج کی ساخت اس کے اخلاقی معیار اور توقعات کیا ہیں، جو وہ مردوں اور عورتوں کے رویوں کے بارے میں رکھتا ہے۔ ان ہی سے بڑی حد تک اس کا تعین ہوتا ہے کہ معاشرے میں عورت کا مقام اور رول کیا ہے۔ ان میں سب سے اہم ادارے، حسب نسب، خاندان، شادی بیاہ کے طریقے اور مذہبی روایات ہیں۔ اور ان ہی سے عورت مرد کا نظریہ، اور اخلاقی اساس حقوق و فرائض کے بارے میں بنتا ہے۔ سماجی معیاروں اور قدروں میں تبدیلی اس رفتار سے نہیں ہوتی، جس رفتار سے سماجی تنظیموں کی دوسری شکلوں میں، جیسے صنعت و حرفت اور تعلیم کی ترقی، دیہات سے شہروں میں منتقلی، آبادی میں اضافے، اشیا کی قیمتوں اور معیار زندگی کے گھٹنے بڑھنے سے ہوتی ہے۔ اس فرق سے اس بات کی توجیح ہوتی ہے کہ تعلیمی پالیسی اور قانون اکثر لوگوں کے سماجی رویوں پر خاطر خواہ اثر ڈالنے میں ناکام رہتے ہیں۔ ہندوستان میں عورت کے اس رول میں جو آئین اور قانون نے اس کے لیے مقرر کیا ہے اور اس رول میں جس کو اختیار کرنے پر سماجی حالات نے مجبور کر دیا ہے بہت فرق ہے اور اس کا مثالی نمونہ ہندوستان میں عورت کی سماجی حیثیت ہے یعنی اس کے لیے نظری طور پر جو امکانات ہیں، وہ عملی طور پر شاذ و نادر ہی اسے نصیب ہیں۔

مذہبی روایات

مذہبی روایات کا عورت کے رول اور حیثیت پر بڑا گہرا اثر پڑتا ہے۔

ہندو مذہب

ہندو مذہب میں بے شمار عیوب عورتوں سے منسوب کردیے گئے ہیں۔ ان کو بھی شدروں کی طرح ویدوں کو پڑھنے کی اور قربانی میں حصّہ لینے کی ممانعت ہے۔ "منودھرم شاستر کی رو سے بچپن میں عورت کو باپ کے زیرِفرمان رہنا چاہیے، جوانی میں شوہر کی اور شوہر کے انتقال کے بعد بیٹوں کے وہ خودمختار کبھی نہیں رہ سکتی۔"

اس کا تصوّر محض ماں اور بیوی کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ اور اس کے یہی رول مثالی سمجھے جاتے ہیں۔ ایک مثالی بیوی، وفادار اور بے زبان ہوتی ہے۔ اس کا دھرم شوہر کی خدمت ہے۔——

لڑکی کی شادی میں کنیا دان اور بیٹوں کی اہمیت اس بنا پر ہے کہ ان سے نسل چلتی ہے۔ اس قسم کی چیزوں نے ہندو مذہب کے پدری سماجی ڈھانچے کو تقویت دی ہے۔ ماہواری اور زچگی کے زمانے میں عورت کے ساتھ نجاست کا تصوّر وابستہ کردیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ مذہبی رسومات میں حصّہ نہیں لے سکتی ہیں۔ ان پابندیوں سے اس تصوّر کو تقویت ملتی ہے کہ فطری طور پر عورتیں مردوں کے مقابلے میں کمتر ہیں۔ چونکہ عورت کے لیے شادی کرنا اور ماں بننا لازمی ہے اس لیے اس سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے شوہر اور بیٹوں کی سلامتی وحفاظت کے لیے برت رکھے۔ دوسری طرف بیوہ کے ساتھ بدقسمتی کا تصوّر وابستہ ہے اور اس کو منحوس سمجھا جاتا ہے۔ وہ سماجی اور مذہبی تقاریب میں حصّہ نہیں لے سکتی۔ اس لیے کہ اس کی نحوست دوسروں کو نہ لگ جائے۔

سناتن دھرم کی رو سے اونچی ذات کی بیواؤں کو دوبارہ شادی کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ جبکہ ۱۸۵۶ء سے قانونی طور پر ان کو اس کی اجازت مل گئی ہے۔ ان ذاتوں میں جہاں بیوہ کو دوسری شادی کی اجازت ہے، وہاں اس پر دوسری طرف پابندیاں عائد کردی گئی ہیں۔ مثلاً دوسری شادی اہتمام اور دھوم دھام سے نہیں ہوتی ہے، ان میں سے بہت سی بیواؤں کو دوسری شادی کی اس لیے ممانعت ہے کہ وہ اونچی ذات کی تھی

جائیں۔ ہندو مردوں پر اس قسم کی کوئی پابندیاں اور شرطیں نہیں ہیں، ان کو ایسے کسی خاص لباس یا نشانی کی ضرورت نہیں ہے جس سے ان کی ازدواجی حیثیت ظاہر ہو۔ نہ ان کی دوسری شادی پر پابندی ہے اور نہ رنڈوے مرد کو منحوس سمجھا جاتا ہے۔

ہندو سماج میں جو احتجاجی تحریکیں چلیں، جیسے بدھ مت، جین مت، ویشنو مت ویرشیومت، اور سکھ مت ان کے اثر سے عورت کی سماجی حالت کچھ بہتر ہوئی۔ خاص طور سے مذہبی اور روحانی رسوم و عبادات کے معاملے میں۔ مگر ان کے یہاں بھی عورت کا بنیادی تصور ماں اور بیوی کا رہا۔ اور مرد کے مقابلے میں عورت کا درجہ کمتر ہی رہا۔ بدھ مت میں بھکشنی کے مقابلے میں بھکشو کی حیثیت اونچی ہے۔ جین مت میں ان کو خوب برا بھلا کہا گیا ہے۔ اگرچہ اجتماعی زندگی میں ان کو جائز مقام دیا گیا۔ ویرشیومت میں عورت کو طلاق اور دوبارہ شادی کی اجازت ہے۔ چونکہ بھگتی تحریک نے بغیر کسی وسیلے کے عورت کو روحانی تسکین حاصل کرنے کی اجازت دیدی۔ اس میں مذہبی تعلیم مادری زبان میں دی جاتی تھی اس لیے عورتیں اس قابل ہو سکیں کہ سنت سادھو اور مذہبی رہنما بن سکیں۔ بہرحال یہ تحریکیں بھی سناتن دھرم اور دوسرے چھوٹے فرقوں نے عورت کو جو کمتر درجہ دیا اس میں کوئی قابل ذکر اصلاح کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں اور بعد میں جو مذاہب آئے، جیسے اسلام عیسائیت اور زرتشتی مذہب۔ وہ عورت کے بارے میں اپنے الگ تصورات رکھتے تھے۔ لیکن یہاں رہ کر انھوں نے بھی اپنے کو ہندوستان کے ماحول کے مطابق کر لیا اور اکثر صورتوں میں انھوں نے ان رسم و رواج کو اختیار کر لیا جن کا عام چلن تھا۔

اسلام اسلام میں عورت اور مرد کو برابر سمجھا گیا ہے اور اس کے نزدیک عورت مذہب کے راستے میں رکاوٹ نہیں ہے۔ اگرچہ عورتوں کو قرآن نے بہت بلند مقام دیا ہے مگر قرآن کی ان تعبیروں میں جو بعد کی صدیوں میں کی گئی ہیں اپنے زمانے کے تہذیبی معیاروں کے مطابق عورت کے درجے کو کمتر کر دیا ہے۔ اگرچہ صاحب ایمان ہونے کے لحاظ سے عورتیں اور مرد برابر ہیں۔ لیکن عورت نہ تو مذہبی رہنما ہو سکتی ہے اور نہ نماز میں امامت کر سکتی ہے۔ اور نہ فقہی امور میں کچھ عورت کو دخل ہے۔ وہ قاضی کا منصب بھی نہیں لے سکتی ہے۔ شرم و حیا، عفت و عصمت پر زور دیا گیا

تو اس کی مختلف تعبیریں ہوئیں اور رفتہ رفتہ یہ رواج ہو گیا کہ عورتیں پردہ کریں اور جہاں تک ہو سکے گھر کی چار دیواری میں رہیں ۔ پردہ نشینی اور علیٰحدگی کا رواج زیادہ تر شہروں میں اونچے اور متوسط طبقے کی خصوصیت بن گیا ہے ۔ اگرچہ اب ان طبقوں میں اس کا رواج کم ہو رہا ہے ، لیکن یہ اب نچلے اور متوسط طبقے کی زندگی کا مظہر ہے ۔ اور مزدور پیشہ طبقے میں ان کی سماجی حیثیت کے اونچے ہونے کا نشان امتیاز بن گیا ہے ۔ علیٰحدگی کے رواج نے عورتوں پر بہت سی پابندیاں مسلط کر دیں اور انھیں جماعت کی نماز میں شرکت کے حق سے محروم کر دیا ۔

نکاح کے معاہدے میں عورت مرد کے حقوق برابر نہیں ہیں ۔ چونکہ شوہر کو ایک سے زیادہ شادی اور یک طرفہ طلاق دینے کا حق ہے ۔ شادی میں لڑکی کی رضامندی برائے نام ہوتی ہے اور اس کے لیے ولی مقرر کیے جانے کے رواج نے عورت کی حیثیت کو مزید کم کر دیا ہے ۔ شوہر کو خاندان کا سردار مقرر کیا ہے اور بیوی کا فرض ہے وہ شوہر کی تابعداری اور خدمت کرے ۔ اگرچہ بیوہ کو دوسری شادی اور عورتوں کو خلع کا حق ہے مگر اس کو معاشرے میں اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا ہے ، خاص طور سے متوسط طبقے میں ۔ طلاق کی صورت میں مہر کی شرط رکھ کر ایک حد تک عورت کے حقوق کا تحفظ کیا گیا ہے لیکن بہت کم عورتوں کو اس کا موقع میسر ہے کہ وہ مہر کا دعویٰ کر سکیں ۔

اسلام نے عورت کو جائیداد میں حق دیا ہے ، لیکن عملی طور پر وہ اس حق سے محروم ہے ۔ عورتیں جہالت اور نا اہلیت کے باعث اپنے حقوق حاصل نہیں کر سکی ہیں ۔

عیسائیت اسلام کی طرح عیسائیت کے بنیادی عقاید بھی ہندوستان کے ان متعدد فرقوں کی روایات کے ساتھ خلط ملط ہو گئے جنھوں نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا ۔ بائبل میں عورت کا تصور بہکانے والی اور تحریص دینے والی کا ہے ۔ لہٰذا اس تصور نے شوہر کے اس حق کو تقویت دی کہ وہ بیوی پر اور اس کی جائیداد پر اپنا کنٹرول رکھے ۔ لیکن میاں بیوی کے باہمی رشتے میں فرض شناسی اور عزت پر بھی زور دیا گیا اور خاندان کی جداگانہ تنظیم کی بنا پر عورت کی حیثیت بہتر ہوئی یہاں تک کہ جن جماعتوں میں مشترکہ خاندان کا دستور و رواج چلا آ رہا ہے ، ان میں بہو کو ہندو خاندانوں کی طرح نیچے نہیں رکھا جاتا ہے ۔ اس کو اپنے شوہر کے ساتھ آنے جانے ، گھومنے پھرنے کی آزادی

ہے، اور یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ اس کا بنیادی رشتہ اپنے شوہر سے ہے۔
عیسائیت میں یک زوجیت کا دستور ہونے اور شادی کے تصور کے دائمی ہونے کے سبب سے عورتوں کی حیثیت اونچی ہو گئی ہے۔ اور ان کو اس لحاظ سے تحفظ حاصل ہے کہ وہ اپنے گھر میں بچوں کے ساتھ رہ کر ان کی پرورش کر سکتی ہیں لیکن اس کی وجہ سے وہ جداگانہ زندگی گزارنے کے حق سے محروم ہو گئی ہیں اور زیادہ شوہر کی تابع ہو گئی ہیں۔

بائبل نے عورتوں کی چند صفات اور صلاحیتوں کو نمایاں کیا ہے۔ محنت و مشقت کی صلاحیت، بچوں کی دیکھ بھال، باہر محتاجوں کے ساتھ محبت و شفقت سے پیش آنا اور سوجھ بوجھ وغیرہ۔ عورتیں مذہبی رسومات میں حصہ لے سکتی ہیں، لیکن کلیسا کی تنظیم میں پادری کی ذمہ داری اس کو نہیں سونپی جا سکتی (سوائے میتھوڈسٹ فرقے کے)۔
عیسائیت میں شادی عورت کی زندگی کا واحد مقصد نہیں ہے۔ وہ ایک ذمہ دار آزاد اخلاقی ہستی ہے۔ اس روایت کی وجہ سے سب سے پہلے عیسائی عورتوں نے تعلیم حاصل کی، نرسوں، ڈاکٹروں اور معلمات کی حیثیت سے ملازمتیں حاصل کیں۔ اگرچہ عیسائی مذہب میں عورتوں کی ذات سے وابستہ ممنوعات کم ہیں۔ مگر اس میں کسی بحث کی گنجائش نہیں ہے کہ ان کے یہاں بھی عورت کا بنیادی تصور مرد کے مقابلے میں کمتر ہے۔

زرتشتی مذہب ہندوستان میں اس مذہب کے پیرو پارسی ہیں۔ ان کے یہاں خاندان اور معاشرے دونوں میں عورت معزز سمجھی جاتی ہے۔ اس کو جائیداد میں حصہ لینے کا حق ہے۔ مذہبی اور غیر مذہبی تعلیم حاصل کر سکتی ہیں۔ شوہر کو طلاق دے سکتی ہیں، دوسری شادی کر سکتی ہے۔ روایتی طور پر ماہواری کے زمانے میں عورت کو مذہبی رسومات میں حصہ لینے کی ممانعت ہے۔ تعدد ازدواج اور بچپن کی شادی کی رسمیں جو ہندو اور مسلمانوں کے اثر سے پارسیوں میں بھی رائج ہو گئی تھیں۔ پارسی پنچایت نے انیسویں صدی میں اس کی شدید مخالفت کی اور آخر کار ان کو ختم کر کے چھوڑا، لیکن پارسیوں میں اگر کوئی مرد کسی غیر پارسی عورت سے شادی کرے تو معیوب نہیں سمجھا جاتا ہے۔ اور اس کے بچے پارسی ہی مانے جاتے ہیں۔ لیکن کسی پارسی عورت کا غیر پارسی مرد

سے شادی کرنے کا حق حاصل نہیں ہے یہاں تک کہ اسے آتشکدے میں داخل ہونے کی اجازت بھی نہیں ہے۔

قبائلی مذاہب قبائلی عورتیں اپنے خاندان اور گروپ کی مذہبی رسوم اور عبادات میں حصّہ لے سکتی ہیں لیکن مخصوص دیوتاؤں کی پوجا میں حصّہ لینے کی ممانعت ہے۔ وہ قبیلے جن میں مادری نظام ہے عورتیں مورو ثی دیوتاؤں کی پوجا کرتی ہیں۔ ماہواری کے زمانے میں عورت کے ساتھ نجاست کا تصوّر اور اس زمانے میں اہم مذہبی رسومات کی ادائیگی سے علیٰحدگی کا رواج ہندوستان کے سارے قبیلوں میں ہے۔ چونکہ یہاں عورتیں روزی کمانے میں مدد دیتی ہیں، اس لیے ان کو سماجی طور پر کافی آزادی حاصل ہے۔ لیکن پنچایتوں اور قبائلی کونسلوں میں جن کا کام اجتماعی ضبط و نظم اور اخلاق عامہ کی دیکھ بھال ہے۔ عورتوں کا کوئی مقام نہیں ہے۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے، اس سے یہ بات ظاہر ہے کہ کسی مذہب میں بھی عورت کی حیثیت میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدی کی اصلاحی تحریکیں جیسے ہندوؤں میں برہمو سماج، آریہ سماج، پرارتھنا سماج اور مختلف فرقوں میں اسی طرح کی دوسری اصلاحات نے بچپن کی شادی، بیواؤں سے بدسلوکی کے خلاف آواز اٹھائی۔ اور عورتوں کو تعلیم اور حقوقِ ملکیت دیے جانے کا مطالبہ کیا۔ ان تحریکوں کے لیڈروں کو سماجی اور مذہبی اصلاحات کو ایک دوسرے سے الگ کرنے میں بڑی مشکلات پیش آئیں، لیکن سب مذاہب میں ایک ساتھ اصلاح کے مقصد میں وہ کامیاب نہ ہو سکے، کیونکہ ان سب فرقوں کے قدامت پرست طبقوں اور حکومت نے ان کوششوں کی مزاحمت کی۔ اس لیے ان تحریکوں کا دائرہ عمل دو لحاظ سے محدود رہا۔ (۱) بجائے اس کے اس میں ایک متحد تحریک چلائی جاتی جس سے پورے معاشرے میں تبدیلی آتی ہر مذہب میں الگ الگ تحریکیں چلیں۔ (۲) ان کا مقصد صرف گھر کی حد تک عورت کی حیثیت میں تبدیلی لانا تھا۔ اور خاندان میں اس کی عزّت و وقار کا تحفظ کرنا تھا۔ بہرحال ان تحریکوں کا سب سے نمایاں اثر شہری متوسط طبقے پر پڑا اور ان تحریکوں کا جو مطمحِ نظر تھا وہ ہندوستانی سماج کے بس

طبقے کے تہذیبی ورثے کا ایک حصّہ بن گیا۔ ان مصلحین کو اونچے طبقے کی عورتوں کی محرومیوں کو دور کرنے کی زیادہ فکر تھی اس لیے انھوں نے اس کے خلاف آواز نہیں اٹھائی کہ عام طور پر سماج میں کمتر مقام ہونے کی وجہ سے عورتوں کو دبایا اور کچلا جارہا تھا۔ انھوں نے وسیع سماجی عمل میں عورت کے حصّہ لینے کی ضرورت اور اس سے متعلق مسائل پر بھی غور نہیں کیا۔ یہ کام انھوں نے مہاتما گاندھی اور آزادی کی قومی تحریک کے لیے چھوڑ دیا کہ وہ عورتوں کی آزادی کی تحریک کو اس بڑی تحریک کے تحت چلائیں جس کا مقصد سبھی کمزور فرقوں سے عدم مساوات کو دور کرنا تھا۔ اور خاص طور پر ان فرقوں سے کہ جو سماج کے ظلم وجور کا شکار تھے۔

سلسلۂ نسب کا نظام

ہندوستان میں سلسلۂ نسب کے نظام ہیں۔ مادری نظام اور پدری نظام۔

مادری نظام وہ قومیں جن میں مادری نظام رائج ہے۔ ان کی بڑی آبادی ملک کے جنوب مغرب اور شمال مشرق میں ہے۔ کیرالہ کی نائر، تھیار موپلا اور دلکشا دیپ قوم۔ میگھالیہ کی گارو اور خاسی قوم آسام میں۔ یہاں کی بڑی آبادی اسلام اور عیسائیت کو ماننے والی ہے مگر شادی اور رشتہ داری کے طور طریقوں پر اس کا کوئی خاص اثر نہیں ہے لیکن انیسویں صدی میں تجارتی معیشت، تعلیم اور پیشے کے سلسلے میں نقل مقام کی ضرورتوں نے میاں بیوی کی سکونت اور وراثت کے قوانین اور اس سے متعلق دوسرے حالات میں تبدیلیاں پیدا کی ہیں۔ جس کا اثر یہاں بھی ہے۔

مادری نظام میں سلسلۂ نسب عورت سے چلتا ہے۔ مگر اقتدار عورت کے خاندان کے مردوں کو حاصل ہے۔ مادری نظام ایسی معیشت سے وابستہ ہے جس میں عورت معاشی طور پر مرد کی دست نگر نہیں ہوتی ہے۔ سوائے نائر قوم کے ان لوگوں کی عورتیں کے جو زراعت پیشہ ہیں، روزی کمانے کا کام نہیں کرتی ہیں۔ لیکن خاندان میں انھیں برابر کے حقوق حاصل ہیں۔ عورتوں پر پابندیاں ان ہی گروہوں میں پائی جاتی ہیں جہاں

تربیت کے دوران ماں باپ کو اس سے بالا مدد نہیں ملتی ہے۔ لڑکے لڑکی کے درمیان دوا علاج کھانے پینے اور تعلیم میں جو فرق برتا جاتا ہے، اس کا تعلق براہ راست اسی رویے سے ہے۔ قبائلی اور دیہاتی علاقوں میں لڑکی کی ملکیت کے حقوق بہت محدود ہیں۔ مرد ہی اس کی جائداد کا مالک اور وہی اس کا وارث ہوتا ہے۔ ایک بیوہ کو اپنے شوہر کی جائداد سے فائدہ اٹھانے کا حق اسی صورت میں ہے کہ وہ دوسری شادی نہ کرے۔ علیحدگی یا طلاق کی صورت میں بچے ماں کے پاس رہ سکتے ہیں، لیکن اس شرط پر کہ بڑے ہونے کے بعد وہ باپ کے حوالے کر دیے جائیں۔ اس تہذیبی تصور سے کہ عورت کا رول محض امدادی ہے پدری سلسلۂ نسب اور بیوی کی سکونت شوہر کے گھر میں ہوتی ہے۔

خاندانی تنظیم

ہندوستان میں عام طور پر خاندانی تنظیم مشترکہ خاندان کی صورت میں نظر آتی ہے، جو جدی مردوں پر مشتمل ہے۔ ان کا حق ملکیت مساوی اور آمدنی و خرچ کا بجٹ مشترک ہوتا ہے۔ ساتھ رہتے بستے اور کھاتے پکاتے ہیں۔ اگرچہ یہ طرز زندگی نئے زمانے کے طور طریقوں، شہروں میں سکونت اختیار کرنے اور سماجی و معاشی تبدیلیوں سے بہت کچھ متاثر ہوا ہے۔ مشترکہ خاندان کا طرز زندگی زیادہ تر زمینداروں، کاروباری لوگوں، اور دوسری اونچی ذاتوں کے خاندانوں میں پایا جاتا ہے۔ قبائلی لوگوں میں جداگانہ گھربار کا طریقہ خاندانی تنظیم کا مقبول طرز زندگی ہے۔ ایک عورت سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ اپنے آپ کو وہ سسرال کے طریقوں کے مطابق ڈھالے جہاں وہ شادی کے بعد جا کر رہتی ہے۔ سسرال میں اس پر کڑی پابندیاں لگا دی جاتی ہیں۔ گھر کے اہم فیصلوں میں اس کا بہت کم یا بالکل دخل نہیں ہوتا ہے۔ وہ بلا واسطہ اپنی ساس کے تابع فرمان رہتی ہے۔ گھر میں اس کی حیثیت اس پر منحصر ہوتی ہے کہ گھر کی آمدنی میں اس کے شوہر کا کتنا حصہ ہے۔ اونچے اور متوسط طبقے میں اس کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ وہ جہیز کتنا لائی ہے۔

متوسط طبقے میں بڑی بوڑھی مائیں عزت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔ خاندان کے اہم فیصلوں میں ان کی رائے مانی جاتی ہے۔ ہم نے جو جائزہ لیا ہے اس کے مطابق خاندانی

لوگ گروپ کے حدود قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ ذات اور خاندان کی حیثیت کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ نائر عورتوں پر بہت سی پابندیاں ہیں۔ لیکن گارو، خاسی اور ملکشادیپ قوموں کی عورتوں کو نقل و حرکت کی زیادہ آزادی حاصل ہے۔ اس لیے کہ وہ روزی کی فراہمی میں مدد کرتی ہیں۔

مادری نظام میں بعض باتوں میں کچھ لازمی تضاد پائے جاتے ہیں۔ اقتدار خاندان میں مردوں کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ لیکن گروپ کا تعین عورتیں کرتی ہیں۔ شوہر بیوی کی برادری میں شامل نہیں کیا جاتا ہے اور بیوی بچوں پر اس کے حقوق کم سے کم ہوتے ہیں۔ جائداد پر بیوی کے باپ بھائیوں یا ماموں چچا کا کنٹرول ہوتا ہے۔ پیشے کی ضرورتوں کے تحت نقل مقام اور معیشت کے نظام کی تجدید کے نتیجے میں اگر بیوی بچے ساتھ ہوں تو ان پر شوہر کے حقوق بڑھ جاتے ہیں، لیکن اس کی وجہ سے مادری نظام میں خلل پڑتا ہے۔ نائر اور تراوندوں کا تو شیرازہ ہی بکھرتا نظر آتا ہے، کچھ تو سیاسی اور معاشی تبدیلیوں کی وجہ سے اور کچھ شادی کے قوانین نے ہر فرد کو یہ حق دیدیا ہے کہ طلاق سے وہ اپنے حق کا مطالبہ کرسکتا ہے۔ نائر عورتوں نے تعلیم کے مواقع سے فائدہ اٹھایا ہے اور اس بنا پر کہ وہ صاحب ملکیت اور نسل کی چلانے والی ہیں بدستور عزت دی جاتی ہے برخلاف اور مادری نظام رکھنے والی قوموں کے نائر عورتوں پر ایک تو پہلے ہی پابندیاں تھیں، جو انھیں گھر میں رہنے پر مجبور کرتی ہیں، دوسرے انھوں نے شادی کے برہمنی طور طریقے، جیسے جہیز کا دستور اختیار کرلیا ہے، اس لیے سماج میں ان کی حیثیت کم ہو گئی ہے۔

۲. پدری نظام ہندوستان کی آبادی کی اکثریت پدری سلسلۂ نسب کے نظام کی پیرو ہے۔ مرد کو نسل اور خاندان کے نام کو باقی رکھنے والا سمجھا جاتا ہے۔ لڑکی کا جہیز دوسرے خاندان میں چلا جاتا ہے۔ اسی لیے نظام میں اس پر زور ہوتا ہے کہ شادی کے وقت لڑکی اپنے شوہر کی برادری میں منتقل ہو جاتی ہے۔ اس کا اثر عورت کی سماجی حیثیت اور قانونی حقوق پر پڑتا ہے۔ صرف بیٹا ہی اپنے خاندان کے لیے ضروری مذہبی رسمیں ادا کرسکتا ہے۔ سماجی اور تہذیبی دباؤ کی وجہ سے لڑکی کا شادی کرنا لازمی ہے۔ وہ ایک بوجھ بھی جاتی ہے۔ اس لیے اور بھی کہ اس کی پرورش اور

فیصلوں میں عورت کا رول برائے نام ہے لیکن ان معاملات میں جن کا تعلق بیٹیوں سے ہوتا ہے، ماؤں کے فیصلے کو کچھ تھوڑی بہت اہمیت حاصل ہے۔ گھریلو معاملات میں ساس کا حکم چلتا ہے۔ اور اکثر ساس کے سامنے بہو کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی ہے۔ وہ معمولی ماماؤں کی طرح کام میں جٹی رہتی ہے لیکن جب ساس بوڑھی یا بیوہ ہو جاتی ہے تو اس کا اقتدار کم ہو جاتا ہے اور بہو کو خاندان کے کفیل کی بیوی کی حیثیت سے اہمیت حاصل ہو جاتی ہے۔ ہمارے جائزے کے مطابق عورتوں کے اپنے سسرالی رشتہ داروں سے پردہ کرنے کے مختلف درجے ہیں۔ ایسی عورتیں جو اپنے سسر سے پردہ کرتی ہیں۔ ہریانہ میں سب سے زیادہ ہیں (۱۴ر۲۱ فیصدی) راجستھان میں (۸۱ر۲۴ فیصدی) اور دہلی میں (۸۷ر۰۰ فیصدی)۔ یہ اوسط جنوبی ہندوستان کی ریاستوں میں کم ہے۔ کیونکہ وہاں پر پردے کا رواج کبھی بھی زیادہ نہیں رہا ہے۔ عورتیں اپنے میکے سے دور شہری علاقوں میں رہتی ہیں، اور ان کو گھومنے پھرنے، ملنے جلنے کی آزادی ہے خصوصاً اس صورت میں جبکہ وہ اپنی روزی کما کر خاندان کی آمدنی میں اضافہ بھی کرتی ہوں۔ ایک چھوٹے خاندان میں جہاں عورت کو کسی کی تابعداری نہیں کرنی پڑتی ہے۔ اس پر کم پابندیاں عائد ہوتی ہیں اور وہ خود اپنے گھر کی مالکہ سمجھی جاتی ہے۔

شادی

ان معاشروں میں جہاں پدری نظام رائج ہیں، شادی کے معنی یہ ہیں کہ لڑکی شادی کے بعد اپنا پیدائشی گروہ چھوڑ کر شوہر کے گروپ میں شامل ہو جائے۔ کم سنی کی اور ماں باپ کی طے کی ہوئی شادیاں عام طور پر پسند کی جاتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لڑکی کی دوشیزگی کو بہت اہم سمجھا جاتا ہے — گوتر یا برادری میں شادی کرنے پر پابندی عائد ہے۔ مسلمانوں میں یہ پابندی نہیں ہے۔ ان کے یہاں شادی بیاہ عام طور پر قریبی عزیزوں میں ہوتا ہے، تاکہ خاندان کی جائداد گھر میں رہے۔ جنوبی ہندوستان میں ہندوؤں میں بھی رشتے کے بھائیوں سے شادی کا عام دستور ہے۔ تعلیم اور روشن خیالی کی بنا پر شہری علاقوں میں شادی میں لڑکے لڑکی کے انتخاب کا طریقہ بدل گیا ہے۔ ابھی حال میں ہم نے جو جائزے لیے تو معلوم ہوا کہ نئی نسل زیادہ تر ماں باپ کی طے کی ہوئی

شادیوں کو زیادہ ترجیح دے رہی ہے۔ حالانکہ آزادی سے قبل کے عہد میں نوجوان اپنی پسند کی شادی کو ترجیح دیتے تھے۔

ماں باپ کی طے کی ہوئی شادیوں میں کئی ایسے نمایاں پہلو ہیں، جن سے عورت کی کمتر حیثیت کا اظہار ہوتا ہے۔ لڑکی شادی سے پہلے لڑکے اور اس کے خاندان والوں کے سامنے پسند کے لیے پیش کی جاتی ہے۔ کنیادان، کی رسم میں باپ اپنی کنواری بیٹی کو دولہا کو دان کرتا ہے۔ شادی میں لین دین بھی عورت کی حیثیت کم ہونے کا ایک اور مظہر ہے۔ اس کا رواج خاص طور سے شمالی وسطی اور مغربی ہندوستان میں ہے۔ شمالی ہندوستان میں دولہا اور اس کے ماں باپ کو لڑکی کے ماں باپ سے تحفے تحائف لینے کا حق ہے، مگر دولھن کے ماں باپ داماد کے گھر ایک وقت کھانا کھانا بھی اچھا نہیں سمجھتے ہیں۔

اونچی ذات کے مرد کی شادی نیچی ذات کی لڑکی سے ہوتی ہے، یہ رواج بھی عورتوں کی حیثیت پر اثر ڈالتا ہے۔ اس کا رواج شمالی ہندوستان کے راجپوتوں، جاٹوں اور میتھلی برہمنوں اور دوسرے گروہوں میں ہے۔ ان لوگوں کے یہاں لڑکیوں کو بچپن میں قتل کرنے کا رواج ایک حد تک اسی وجہ سے تھا کیونکہ انھیں اونچی ذات میں لڑکی کے لیے مناسب بر ملنا مشکل ہوتا تھا۔ مجبوراً لڑکی کی شادی نیچی ذات میں کی جاتی تھی، جہاں جہیز بہت زیادہ لیا جاتا تھا۔

تعدد ازدواج

تعدد ازدواج کی دونوں شکلیں یعنی ایک شوہر کی کئی بیویاں ہونا اور ایک بیوی کے کئی شوہر ہونا ہندوستان میں پائی جاتی ہیں۔ ایک بیوی کے کئی شوہر ہونے کا رواج کچھ اچھوت قبیلوں تک ہی محدود ہے۔ جیسے نیلگری کی توڈا قوم میں، اتر پردیش کے ضلع جونسر باور کی کھاسی قوم میں، ہماچل پردیش کے لاہلال، کنوٗر اور اسپیٹی قوموں میں۔ ایک شوہر کی کئی بیویاں ہونے کا رواج ہندوستان کے اکثر حصّوں میں عام تھا۔ جو عورت کے لیے توہین آمیز اور اس کے وقار کے منافی تھا۔ اس کے خلاف سماجی ردِّ عمل ان اصلاحی تحریکوں کی خصوصیت تھی، جو انیسویں صدی میں چلائی گئی تھیں۔ یک زوجگی کے اصول کو تعلیم یافتہ لوگوں نے بڑی حد تک مان لیا ہے مگر

٭ تعدد ازدواج کا لفظ ہم نے جہاں کہیں رپورٹ میں استعمال کیا ہے، کئی بیویاں ہونے کے معنی میں کیا ہے۔

مصلحین کا اس معاملے پر اختلاف رائے تھا کہ اس رواج کو ختم کرنے کے لیے کیا طریقے اختیار کیے جائیں۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ قانونی طور پر اس کی ممانعت کر دینی چاہیے۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ تعلیم کے پھیلنے سے یہ رواج خود بخود ختم ہو جائے گا۔ کچھ تو اس سماجی ردِ عمل کی وجہ سے۔ اور کچھ ان طبقوں میں جن میں کئی بیویاں رکھنے کا رواج تھا، مادی خوشحالی کی کمی کے باعث یہ رواج پچھلے چند سال میں بڑی حد تک کم ہو گیا ہے۔

تعددِ ازدواج کو ممنوع کرنے کی مانگ کو گاندھی جی اور عورتوں کی تنظیموں کی وجہ سے بڑی تقویت ملی۔ چنانچہ بعض صوبوں اور رجواڑوں وغیرہ میں اس سلسلے میں آزادی سے پہلے ہی اس طرح کے قانون پاس کر دیے تھے۔ اور آخر کار سن ۱۹۵۴ میں میرج ایکٹ کے تحت سب ہندوؤں کو تعددِ ازدواج کی ممانعت ہو گئی۔

موجودہ قانون کی رو سے صرف مسلمانوں کو بیویاں رکھنے کی اجازت ہے۔ سن ۱۹۶۱ میں جو مردم شماری ہوئی، اس کے مطالعہ سے معلوم ہوا ہے کہ بہت اور فرقوں میں بھی اس کا رواج اب تک باقی ہے۔ اگرچہ کئی دہائیوں سے اس کا رواج کم ہو رہا ہے۔ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ ہندوؤں میں تعددِ ازدواج کی شرح ۵.۸ فیصدی اور مسلمانوں میں ۵.۷ فیصدی ہے۔ جین مذہب کے ماننے والے لوگوں میں ۶.۷۲ فیصدی اور بدھ مذہب کے پیرو لوگوں میں ۷.۹۷ فیصدی اور قبائلی قوموں میں ۱۵.۲۵ فیصدی ہے۔ صرف قبائلی قومیں ایسی ہیں جن میں تعددِ ازدواج پچھلے سالوں میں بڑھ گیا ہے۔ اگرچہ اکثر قبائلی قوموں میں کئی بیویاں رکھنے کی اجازت ہے۔ لیکن ہم کو معلوم ہوا ہے کہ زیادہ تر کئی شادیاں قبیلے کے سردار ہی کرتے ہیں۔ عام طور پر یہ لوگ کئی شادیاں کرنے کے یہ جواز پیش کرتے ہیں۔ بیوی کا بانجھ ہونا، دوسری شادیوں سے معاشی فائدہ حاصل ہونا۔ عزت و وقار میں اضافہ ہونا۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ عیسائی مذہب کی پیرو قبائلی قوموں میں بھی کئی شادیاں کرنے کا رواج ہے۔ مگر یہ شادیاں چرچ میں نہیں ہوتیں۔ بلکہ مروجہ دستور کے مطابق شادی کو تسلیم کر لیا جاتا ہے۔

غیر قبائلی قوموں میں بھی کئی شادیاں کرنے کی کچھ اس قسم کی وجوہ بتائی جاتی

ہیں۔ بیوی کا بانجھ پن اولاد نرینہ کا نہ ہونا ، بیوہ بھاوج سے شادی کرنے کا رواج (جو اب تک کچھ قوموں میں ہے)۔

تعدد ازدواج کی ایک اور سماجی وجہ ادھر کچھ سالوں سے پیدا ہو گئی ہے ۔ جاہل بیوی اور تعلیم یافتہ شوہر کے درمیان تبادلۂ خیالات کی دشواری کی وجہ سے جاہل بیوی اور تعلیم یافتہ شوہر میں (جو نئے زمانے کے محرکات سے متاثر ہوتا ہے) تہذیبی بُعد پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ صورت حال عام طور پر بچپن کی شادی کی وجہ سے پیش آتی ہے۔ ایسی صورتوں میں عورتیں اگر طلاق لینا بھی چاہیں، تو نہیں لے سکتیں چونکہ وہ معاشی اور سماجی طور پر مرد کی محتاج ہوتی ہیں، اور ایک وجہ اور بھی ہے کہ اکثر طلاق کی خاندان والوں کی طرف سے مخالفت بھی ہوتی ہے ۔

ان قوموں میں جہاں عورت خاندانی آمدنی میں اضافہ کرتی ہے، وہاں تعدد ازدواج کا محرک معاشی فائدہ ہوتا ہے۔ ہندو مسلمان دونوں دستکار گروہوں میں اسی لیے کئی شادیاں ہوتی ہیں کہ بجائے اس کے کام اجرت پر کرائیں، بیویوں سے کرا لیتے ہیں جو کہیں سستا پڑتا ہے۔ جیسے منی پور میں تعدد ازدواج کا بہت رواج ہے۔ اس کا صریحی تعلق اس بات سے ہے کہ یہاں عورتیں معاشی حیثیت سے خود کفیل ہوتی ہیں۔ اپنے کام کی اجرت سے نہ صرف یہ کہ بچوں کا بار اٹھاتی ہیں، بلکہ شوہر کی آمدنی میں بھی اضافہ کرتی ہیں۔

اگرچہ تعدد ازدواج کا رواج مسلمانوں میں اتنا زیادہ نہیں ہے جتنا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ہمیں پتہ چلا ہے کہ مسلمان عورتوں میں اس بات پر ناراضگی ہے کہ تعدد ازدواج کی قانونی طور پر کیوں اجازت ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ جب بھی انھوں نے اس کے خلاف کہا ہے تو اس کی مخالفت کا سامنا انھیں کرنا پڑا ہے۔ مسلمان عورتوں کو اس سلسلے میں سماجی تحفظ حاصل نہیں ہے۔ اگرچہ ہم یہ جانتے ہیں کہ صرف قانون کسی رواج کو ختم نہیں کر سکتا، لیکن قانون سماج کے لیے معیار مقرر کرتا ہے، اور پبلک ضمیر کو بیدار کرتا ہے۔ ہم اس بات کو پسندیدہ بات نہیں سمجھتے ہیں کہ مسلمان عورت کو اس رواج کے خلاف جد و جہد کرنے میں سماجی طور پر کوئی مدد نہیں دی جاتی ہے۔

ہندوؤں میں تعدد ازدواج اب تک جاری رہنے کا سبب یہ ہے کہ عام طور پر عورتیں قانونی حقوق سے ناواقف ہیں اور سماج میں یہ رواج اب بھی مقبول ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ بعض حالات میں شوہر بیویوں کو مجبور کرکے ایسا دستاویز لکھوا لیتے ہیں جس میں بیوی کی طرف سے شوہر کو دوسری شادی کی اجازت ہوتی ہے۔ اور عورتیں یہ خیال کرتی ہیں کہ اب وہ اپنے قانونی حق سے محروم ہو گئی ہیں۔ اس لیے ان تنظیموں کو جو عورتوں کی ترقی اور آزادی کے لیے کام کر رہی ہیں۔ تعدد ازدواج کے خلاف یہ مہم چلانی چاہیے کہ ایسے مردوں کو جو ایک سے زیادہ شادی کریں برادری سے خارج کر دیا جائے اور رائے عامہ کو اس کے خلاف ابھارنا چاہیے۔

دُلہن کی قیمت اور جہیز شادی کے سلسلے میں روپے کا جو لین دین ہوتا ہے، اس کی دو خاص صورتیں ہیں۔ ایک جہیز اور دوسرے دلہن کی قیمت کی صورت میں۔ جہیز تو دلہن کے ساتھ دولہا والوں کے یہاں جاتا ہے اور دلہن کی قیمت دولہا اپنے سسرال والوں کو ادا کرتا ہے۔

دلہن کی قیمت وصول کرنے کا رواج ان قبائلی قوموں میں ہے جن میں پدری نظام رائج ہے اور غیر قبائلی قوموں کی درمیانی اور نیچی ذاتوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ نظری طور پر یہ قیمت نقد اور اشیاء کی صورت میں دُلہن کے باپ کو اس بدلے میں ادا کی جاتی ہے کہ لڑکی کا اختیار اب دولہا اور اس کی برادری والوں میں منتقل ہو گیا ہے۔ اس میں یہ خیال مضمر ہے کہ یہ اس نقصان کی تلافی ہے جو دلہن کے گھر والوں کو کمانے والے فرد کے جانے سے ہوتا ہے۔ جن قوموں میں یہ رواج ہے وہاں لڑکیوں کو بوجھ نہیں سمجھا جاتا ہے اور والدین ان کی شادی کے خیال سے گھبراتے نہیں ہیں۔ کیونکہ لڑکی شادی سے پہلے بھی اور شادی کے بعد بھی اپنے خاندان کو مالی فائدہ پہنچاتی ہے۔ بہرحال اس لین دین میں بازاری سودے کا رنگ ہے۔

ایک اور دستور بھی ہے جس کی رُو سے شوہر اپنی بیوی سے بدسلوکی کرے تو وہ کچھ معاوضہ دے کر شوہر سے اپنا پیچھا چھڑا سکتی ہے۔ یہ دستور اچھا ہے کہ اس سے عورت کو اپنے ناپسندیدہ شریکِ زندگی سے نجات مل جاتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی اس دستور کا ناجائز استعمال بھی ہوتا ہے کہ کسی مرد سے کچھ معاوضہ لے کر بیوی کو

شوہر اس کی مرضی کے بغیر کسی دوسرے مرد کے حوالے کر دیتا ہے۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ اس رسم کے خلاف (جو ہماچل پردیش میں 'ریت' اور مدھیہ پردیش میں ناترا کہلاتی ہے) عام طور پر عورتوں میں بہت ناراضگی پائی جاتی ہے۔

غریب قوموں میں دلھن کی قیمت وصول کرنے کے رواج کا بڑا سبب یہ ہے کہ ماں باپ بہا جنوں کے عام طور پر مقروض ہوتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ایک طرح سے ان کے غلام بن جاتے ہیں۔ ہمیں ایسی رپورٹیں بھی ملی ہیں کہ کچھ مندرجۂ فہرست ذاتوں اور یوپی کی قبائلی قوموں میں شوہر اپنا قرض، جو وہ شادی کے وقت لیتے ہیں بیویوں کو اس قرض کی ادائیگی کے لیے عصمت فروشی کے لیے خود ان کے پاس بھیجدیتے ہیں، جن کے وہ مقروض ہوتے ہیں۔ دلھن کو خریدنے کی رسم کو ختم کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ وہ اس طرح ختم ہو سکتی ہے کہ اس تصور کو بدلا جائے کہ عورت کسی کی ملکیت ہے۔ اور اسی کے ساتھ ان قوموں کی حالت اور زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

دُلھن کی قیمت کے بدلے جہیز کی رسم کا اختیار کرنا لڑکی اور اس کے خاندان یا گروپ کی سماجی حیثیت کو بلند کرنے کی کوشش ہے۔ کیونکہ جہیز کا تصور اونچی ذاتوں سے وابستہ ہے۔ ہمیں یہ رپورٹیں ملی ہیں کہ اس تبدیلی کے بدولت لڑکی کی قدر و قیمت اپنے خاندان میں کم ہو گئی ہے، جہاں وہ فائدہ کے بجائے نقصان کا باعث بن جاتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ صورتِ حال اس کا نتیجہ ہے کہ عورتوں کو روزی پیدا کرنے کے مشاغل سے الگ رکھا گیا ہے جس سے ان کی روزی کمانے کی صلاحیت جاتی رہی ہے۔

جہیز کے تصور میں مختلف علاقوں میں حیرت انگیز طور پر اختلاف ہے۔

۱۔ بعض جگہ اس کا تصور اس عطیہ کا ہے جو دلھن کو دیا جاتا ہے جس کی مقدار اکثر پہلے سے طے ہوتی ہے اور جو سسرال والوں کی ملکیت ہوتا ہے۔

۲۔ بعض جگہ یہ ایک ایسا عطیہ ہے جو دولھا کو شادی میں یا شادی سے پہلے اس کے سسرال والوں کی طرف سے ملتا ہے۔

۳۔ کہیں اسے لڑکی کے ساتھ سسرال والوں کو بھی تحفے تحائف کی صورت میں دیا جاتا ہے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں میں جہیز کی رسم کا جواز ان چیزوں پر مبنی ہے۔ بہت سے لوگ اسے قبل وفات ترکہ سمجھتے ہیں جو دُلھن کو اپنے خاندان سے ملتا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ ایک طرح کا بیمہ ہے جو معاشی بحران میں دُلھن کے کام آئے۔ کچھ لوگ اسے دولھا دُلھن کے لیے گھر کے اسبابِ خانہ داری مہیا کرنے کا ذریعہ خیال کرتے ہیں۔ لیکن اصل میں جہیز کا تصور یہ ہو گیا ہے کہ یہ لڑکی کے لیے اچھا اور مناسب بر حاصل کرنے کے لیے بہت ضروری ہے، تاکہ اس کی ضمانت ہو کہ لڑکی اپنے گھر کے مقابلے میں دولھا کے گھر اونچے معیار سے زندگی گزارے گی۔ جہیز کی رسم کا ایک اہم محرک یہ بھی ہے کہ ملک میں مختلف طبقوں میں معاشی اور سماجی عدم مساوات بڑھ گئی ہے۔ جہیز کا رواج ہر طبقے میں ہے۔ جہیز پر جو رقم خرچ کی جاتی ہے وہ سینکڑوں سے لے کر لاکھوں تک ہوتی ہے۔ چیزوں میں برتن اور زیورات سے لے کر فریجڈیر، موٹر اور ایرکنڈیشنر تک ہو سکتے ہیں۔ اس لین دین کی تہ میں ایک ہی جواز چھپا ہوتا ہے کہ لڑکی اور اس کے واسطے سے اس کے والدین کی حیثیت سماج میں بلند ہو جائے۔ لڑکی کے لیے مالی تحفظ حاصل کرنے کی خوشی کی وجہ لڑکی کے والدین دولھا اور دولھا والوں کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں، ان سے ایسے مطالبے بھی کیے جا سکتے ہیں کہ ان کی معاشی مقدرت سے جن کو کوئی نسبت نہیں ہوتی ہے۔ اور اس طرح انھیں قرض کے بوجھ سے نیچے دبا دیا جاتا ہے۔ اس لیے آج کی واقعی صورتِ حال کا جہیز کے روایتی جواز سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اس جائزے کے سلسلے میں ہمیں اپنے سفر کے دوران یہ معلوم ہوا کہ جہیز کا رواج بڑھ رہا ہے۔ اصل میں یہ رواج شہروں میں تھا، لیکن اب یہ رواج دیہاتوں اور ان قوموں میں بھی رائج ہو گیا ہے جن میں اس سے پہلے نہیں تھا۔ جہیز کی بڑھتی ہوئی مانگ اور شادی میں جو دھوم دھام ہوتی ہے۔ اس کا بوجھ خاندان کی مالی حالت پر زبردست پڑتا ہے۔ اور بے چاری نوعمر لڑکی کو نامنصفانہ مقابلے کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ جہیز کتنا ملے گا۔ اس کی اپنی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی ہے۔ شادی کی بات چیت پر بازاری لین دین کا رنگ چڑھ جاتا ہے۔ جس سے ایک ایسی فضا پیدا ہو جاتی ہے کہ جس میں شان و شوکت اور نمود و نمائش کے غلط تصورات فروغ پاتے ہیں۔ اور اس سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے، کہ عورت جو خانہ داری کا کام

کرتی ہے وہ پیداوار نہیں ہے۔اور یہ عورتوں کو طفیلی زندگی بسر کرنے کے لیے بڑھاوا دیتا ہے۔ کالے دھن کی آمدنی اور ایسے روپیہ سے جس کا انکم ٹیکس سے بچنے کے لیے حساب کتاب نہیں رکھا جاتا ہے جہیز کی شرح بڑھتی ہے، جس سے ان خاندانوں کو جو حلال اور اوسط درجے کی آمدنی رکھتے ہیں، قرض لینے پر مجبور ہونا پڑتا ہے، جس کا انھیں بھاری سود بھی دینا پڑتا ہے۔ لڑکے والے جہیز اپنے لڑکے کے تعلیمی مصارف کے معاوضے کے طور پر لیتے ہیں۔ اس لیے ایسے والدین جن کی کئی لڑکیاں ہوتی ہیں مجبوراً دُہرے خرچ سے بچنے کے لیے لڑکیوں کو تعلیم نہیں دلاتے ہیں۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ لڑکی اگر پڑھی لکھی ہوتی ہے تو اس کے والدین کو زیادہ جہیز دینا ہوتا ہے کیونکہ اس کے لیے زیادہ تعلیم یافتہ لڑکا چاہیے جو زیادہ جہیز کی توقع کرتا ہے۔

ہمارے خیال میں جہیز کا تصور علاوہ اس کے کہ عورتوں کے لیے ذہنی کوفت اور دماغی خلل کا سبب بن سکتا ہے، ایک سوشلسٹ سماج کے مقصد کے منافی ہے۔ اور اس سے جنگ کرنے کے لیے متعدد طریقے اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ عورتوں اور مردوں میں بیداری پیدا کر دی جائے۔ شادی بیاہ کے رسوم میں اصلاح کی جائے عورتوں کے لیے روزگار کے مواقع فراہم کیے جائیں۔ ان کے مرد کے طفیلی بن کر رہنے کے تصور کو قابل ملامت قرار دیا جائے۔ خانہ داری سے متعلق کاموں کی قدر و قیمت پر نظر ثانی کی جائے اور اس کو معاشی لحاظ سے پیداآور کام دیا جائے۔ تحفوں اور جہیز کی نمایش اور شادی میں شان و شوکت کے اظہار کے لیے بہت زیادہ خرچ کرنے پر پابندی لگا دی جائے۔ اور عورتوں کی انجمنوں، اخبار، ریڈیو اور فلم کو اس رواج کی مخالفت میں خاص طور سے زور شور سے حصّہ لینا چاہیے۔ اور عورتوں میں یہ شعور پیدا کرنا چاہیے اس رواج کے اثرات ان کے لیے ذِلّت کا باعث ہیں۔

بیوگی ہمارے اندازے کے مطابق جو ۱۹۳۱ کی مردم شماری پر مبنی ہے۔ (وہ آخری مردم شماری تھی جس میں ذات پات کی تصریح کی گئی تھی)

۹۰۴ فیصدی ہندوؤں میں اس وقت تک معمولاً دوسری شادی نہیں کی جاتی تھی۔ باوجود اس کے ایسے لوگوں کی تعداد نسبتاً کم ہے اور ہندو فرقے میں ایسے مصلحین بھی ہوئے ہیں، جنھوں نے قانونی اصلاح کی کوششیں کیں۔ لیکن بیوہ کی شادی اور

ناخوشگوار حالات کا مسئلہ اب تک موجود ہے اور اسے غیر اہم نہیں سمجھا جا سکتا ہے ۔
۱۹۷۱ میں دو کروڑ ۳۰ لاکھ بیوائیں تھیں، اس کے برخلاف ۱۹۵۱ میں ان کی تعداد ۲ کروڑ ۳۰ لاکھ تھی ۔ ۱۹۶۱ میں بیواؤں کی فی صد تعداد ۱۵٫۵ تھی جو گھٹ کر ۱۲٫۵ رہ گئی تھی ۱۹۷۱ میں ان کی تعداد ایک ہزار رنڈوے مردوں کے مقابلے میں ۲٫۷۷۲ ہو گئی تھی ۔ بیواؤں کی تعداد ہر عمر گروپ میں رنڈوے مردوں سے زیادہ ہے ۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بیوہ کی شادی کی راہ میں اب بھی کافی رکاوٹیں ہیں ۔ خاص طور سے بیوہ عورتیں شادی اس لیے بھی نہیں کرتی ہیں کہ انھیں اپنے بچوں سے جدا ہونا پڑے گا ۔

بیواؤں کے ساتھ سماج کا یہ رویہ مختلف معاشی اور سماجی سطحوں پر مختلف ہوتا ہے، مگر یہ بات سماج کے بڑے حصے میں پائی جاتی ہے کہ بیوہ ہونے کے بعد عورتوں کا طرز زندگی بدل جاتا ہے ۔ ہمارے سروے کے مطابق ۵۲٫۵۹ فیصدی ہندو ۷۹٫۴۶ فی صدی مسلمان، ۳۲٫۱۲ فیصدی عیسائی اس حق میں ہیں کہ بیوہ کا لباس الگ ہونا چاہیے لیکن مذہبی رسموں میں بیوہ عورتوں کے حصہ لینے کے سلسلے میں لوگوں کا رویہ کچھ بہتر ہوا ہے ۔ لیکن یہ بات بہت دلچسپ ہے کہ یہ تبدیلی سب سے زیادہ اونچی ذاتوں، کچھ مندرجہ فہرست ذاتوں یا دوسری نیچی ذاتوں میں ہوئی ہے ۔

باوجود ان تھوڑی بہت تبدیلیوں کے جو بیواؤں کے سلسلے میں لوگوں کے رویوں میں ہوئی ہے ہمارے یہاں بیوہ کی جو حالت ہے، وہ ہمارے معاشرے کے دامن پر بدنما داغ ہے ۔ ہم لوگ بنارس میں ایسی بہت سی بیواؤں سے ملے جو محتاجی کی زندگی بسر کر رہی ہیں جن کو ان کے خاندان کے بے حمیت لوگ یہاں چھوڑ گئے ہیں ۔ یہ خیرات مانگ کر یا ایسے ہی چھوٹے موٹے کام کر کے اپنا پیٹ بھر رہی ہیں ۔ ان میں سے اکثر ایسی ہیں جو اپنے سے زیادہ اپنے بچوں کی آئندہ سلامتی و صحت کی خواہاں اور ان کے لیے فکرمند ہیں ۔

صاحب املاک خاندانوں کی بیواؤں کو قانونی اصلاحات کی وجہ سے شوہر کی جائداد میں حصہ دینے سے ان کی حالت کافی سدھری ہے ۔ حکومت کے اس فیصلے سے کہ سرکاری ملازمین کی بیواؤں کو تاحیات پنشن، ساتھ میں بچوں کے لیے الاؤنس ان کے بالغ ہونے تک ملے گا، بیواؤں کا ایک حد تک مالی تحفظ ہو گیا ہے ۔

شادی کی عمر اگرچہ اب ہندوستان میں پہلے کے مقابلے میں لڑکیوں کی شادی

کی عمر میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ لیکن دیہاتوں میں کم سنی کی شادی کا خاصی حد تک رواج ہے۔ صرف اپنی برادری یا گوتر کے اندر شادی کرنے اور اسی قسم کی دوسری پابندیاں جو مختلف ذاتوں میں لگادی گئی ہیں، نیز عورت کی عصمت پر بہت زیادہ زور دینے کی وجہ سے کم سنی کی شادی کو بڑھاوا ملتا ہے۔ یہ بات معنی خیز ہے کہ زیادہ تر قبائلی اقوام اور گروہ ایسے ہیں جن کے یہاں کم سنی میں شادی نہیں ہوتی ہے۔ ملک کے مختلف حصوں میں ہمیں کم سن شادی شدہ بچیاں بھی ملی ہیں۔ لیکن جب اس بارے میں گفتگو ہوئی کہ شادی کس عمر میں ہونی چاہیے تو قریب قریب ہر شخص نے کہا کہ شادی کے لیے چودہ پندرہ سال کی عمر مناسب ہے ہمیں کچھ رپورٹیں ملی ہیں کہ مندرجۂ فہرست ذاتوں میں لڑکیوں کی شادی اس لیے بھی کم سنی میں کردی جاتی ہے۔ ان کی عزت اونچے طبقوں کے لوگوں کی خواہش نفسانی سے محفوظ رہے۔ کم سنی کی شادی اور جہالت کا ایک ایسا چکر بن جاتا ہے کہ جو آبادی کے اضافے، ماں اور بچے کی صحت پر، عورتوں کی حیثیت اور تعلیم پر اثر انداز ہوتا ہے۔ شہری علاقوں میں لڑکوں کی تعلیم اور برسرروزگار ہونا ضروری ہونے کی وجہ سے لڑکیوں کی شادی کی عمر بڑھ گئی ہے۔ اس سلسلے میں شہری متوسط اور اونچے طبقوں کے جو رویے ہیں، ان کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگ لڑکیوں کی شادی کی عمر مناسب ۱۶ سے ۲۲ سال تک سمجھتے ہیں۔

شادی کے دستور اونچے طبقے میں شادیاں مذہبی رسومات کے ساتھ ہوتی ہیں، دوسری قوموں میں روایتی شادی کی مختلف شکلیں رائج ہیں۔ عام طور پر یہاں طلاق سیدھے سادے طریقوں سے آسانی سے ہو سکتی ہے۔ مطلقہ اور اس عورت کی شادی کی تقریب جس کی علیٰحدگی ہوئی ہو مختلف علاقوں میں مختلف طریقے سے ہوتی ہے۔ اکثر قبائلی گروہوں میں بات چیت کے ذریعے شادی کرنے کو ترجیح دیتے ہیں، لیکن ان کے یہاں اس کی بھی گنجائش ہے کہ مرد عورت کو بھگا لے جائے اور لڑکی کا اس پر اصرار ہو کہ وہ خود شوہر کو پسند کرے گی، تو ایسی شادیاں بھی عام طور پر قبول کرلی جاتی ہیں۔

بدلتے ہوئے سماج میں عورتوں کا رول

رول کی تفریق اگرچہ ہندوستانی ریاست نے عورتوں اور مردوں میں مساوات کو تسلیم کیا ہے۔ لیکن عملی طور پر سماج میں ان کے رول میں واضح طور پر امتیاز کیا جاتا ہے۔ حقیقی مساوات اس وقت ممکن ہو سکتی ہے کہ جب آئینی مساوات کو لوگ دل سے مانیں۔ باوجود علاقائی اختلافات کے ہندوستان میں عورت مرد کے بنیادی رول کا تصور بڑی حد تک ایک ہے۔ — عورت سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے اصلی کام خانہ داری کے امور کو انجام دے۔ گھر والی اور ماں کی حیثیت سے گھر کی دیکھ بھال کرے۔ لوگوں کے تہذیبی طرز فکر کے مطابق بچوں کی پرورش اور دیکھ بھال عورت ہی کا کام ہے۔ عورت کھیتوں میں کام کرے یا فیکٹری میں، مکان کی تعمیر کے کاموں میں ہاتھ بٹائے یا دفتر وغیرہ میں کام کرے، اس سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ خانہ داری کا کام اسی طرح انجام دے جس طرح وہ عورتیں کرتی ہیں، جن کا واحد کام یہی ہے۔ گھر کے باہر عورت کا وہ رول قابل قبول نہیں ہے۔ جو مردوں کا ہے — جماعت کے معاملات ہوں، یا امورِ حکومت کو انجام دینا ہو، یہ بلا شرکت غیرے مردوں کا مخصوص میدان سمجھا جاتا ہے۔ گاؤں کی پنچائتیں یا ذات، برادری کی انجمنیں مردوں ہی پر مشتمل ہیں (جن میں بعض مسلم ذات برادریاں بھی شامل ہیں)۔ مرد گھر کے باہر تو ہاتھ کا کام کر سکتے ہیں۔ مگر وہی کام گھر میں کرنا اپنے لیے کسر شان سمجھتے ہیں، اور اس کے انجام دینے کی توقع عورتوں سے کی جاتی ہے۔ مرد کھانا پکانا، کپڑا سینا پیشے کے طور پر تو اختیار کر لیتے ہیں لیکن گھر میں یہ کام عورتوں کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔

عورتوں سے جس قسم کے اور جس مقدار میں کام کی توقع کی جاتی ہے وہ مختلف علاقوں میں اس قدر مختلف ہے کہ یہ تصور کہ کچھ کام مردوں کے لیے مخصوص ہیں اور کچھ عورتوں کے لیے من گھڑت معلوم ہوتا ہے۔ شمال مشرقی علاقوں میں کپڑا بننے کے کام پر بلا شرکت غیرے عورتوں کا قبضہ ہے، لیکن ہندوستان میں کچھ ایسے بھی حصے ہیں کہ جہاں عورت کرگھے کو چھو بھی نہیں سکتی ہے۔ دستکاری کشمیر میں مرد

کرتے ہیں اور پنجاب اور دوسرے صوبوں میں یہ کام عورتوں کا سمجھا جاتا ہے۔ کھیتی باڑی کے سلسلے میں عورتیں جو کام کرتی ہیں وہ مختلف علاقوں میں مختلف ہوتے ہیں۔ اس سے یہ مفروضہ غلط ثابت ہو جاتا ہے کہ بھاری کام مردوں کا حصہ ہیں۔ شمالی پہاڑی علاقوں میں عورتیں دو دو تین تین سو پونڈ وزنی لکڑی کے گٹھے اٹھا کر لے جاتی ہیں۔ شہتیر چیرتی ہیں اور لکڑی کاٹنے میں مدد کرتی ہیں۔ یہ اہم بات ہے کہ جو کام مردوں کے لیے مخصوص ہیں وہ اہم سمجھے جاتے ہیں۔

البتہ متوسط طبقے میں مرد اور عورت کے کاموں کو واضح طور پر الگ رکھا گیا ہے۔ وہ کام جو خانہ داری سے متعلق ہیں ان میں اور وہ کام جو روزی کمانے کے لیے گھر سے باہر کیے جاتے ہیں بہت واضح امتیاز برتا جاتا ہے۔ اوّل الذکر کام صرف عورتوں کے کرنے کے سمجھے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ خاندانی کاروبار مثلاً پرچون کی دوکان، درزی یا بنائی کا کام، کھانے پینے کی چیزیں تیار کرنا اور ان کو محفوظ کرنا ان کاموں میں گھر میں وہ کر عورتیں جو مدد کرتی ہیں اس کو بیداوار سمجھا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی خدمت کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔ ان کے نام مردم شماری میں مزدور پیشہ لوگوں کی فہرست میں نہیں لکھے جاتے۔ ان طبقوں کی عورتوں کے لیے جنھیں کوئی اور ہنر نہیں آتا ہے۔ اور اس قسم کے کاموں کو وہ اپنی روزی کمانے کا ذریعہ بناتی ہیں۔ یہ قابل افسوس بات ہے کہ عورتیں دوسروں کے چھوٹے موٹے کام کریں، اس سے خاندان کے وقار کو ٹھیس لگتی ہے۔

عورتوں کے لیے کرسی نشین ملازمتیں حاصل کرنے سے یہ روایتی تصوّر بدل رہا ہے۔ پہلے لڑکیوں کی ملازمت پر جو روک تھام ماں باپ کی طرف سے ہوتی تھی، وہ بھی اب ہٹتی جا رہی ہے۔ ان صورتوں میں خاص طور سے جبکہ لڑکیاں کام کرکے اپنی روزی کماتی ہیں، کبھی اپنے جہیز اور شادی کے اخراجات کا بوجھ اٹھاتی ہیں۔ ماں باپ اور چھوٹے بھائی بہنوں کا بوجھ اٹھاتی ہیں اور اسی لیے نچلے متوسط طبقے میں ایسی صورتیں نایاب نہیں ہیں کہ لڑکی کی آمدنی چلے جانے کے ڈر سے والدین ان کی شادیاں نہیں کرنا چاہتے۔

خوش حال گھرانوں میں نوکروں کے ہونے سے عورتوں کے گھرداری کے بوجھ میں کچھ کمی ہو جاتی ہے، لیکن ان سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ زیادہ اچھی طرح سے گھر

چلائیں اور بچوں کی پرورش کریں ۔ خانہ داری کو ایک آرٹ کا درجہ دیدیا گیا ہے اور اس سے متعلق چھوٹی چھوٹی چیزوں کو بہت زیادہ اہمیت دی جانے لگی ہے ۔ عورتوں کے مشاغل کا صحیح تعین اس پر موقوف ہے کہ وہ کس علاقے میں رہتی ہیں ۔ وہاں کا تعلیمی معیار کیا ہے ۔ اور اس پر نئے زمانے کے طور طریقے کس حد تک اثر انداز ہوئے ہیں ، لیکن ان کے رول میں تفریق بہرحال باقی رہتی ہے ۔

گھر کے اندر اور باہر کے معاملات میں جیسے کسی اہم بات کا فیصلہ کرنا ، خرچ اور آمدنی کی نگرانی کرنا ، ان کاموں میں امتیاز ہے ۔ ہمارے جائزے سے یہ بالکل واضح ہو گیا کہ ہمارے سوالوں کے جواب دینے والوں میں ان کی تعداد بہت کم تھی ۔ جنھوں نے یہ کہا کہ ان کاموں میں عورت مرد برابر کے شریک ہیں ۔

عمل کے یہ معیار لڑکے اور لڑکی کی تربیت پر اثر انداز ہوتے ہیں ، جبکہ کچھ روشن خیال خاندانوں کو یہ فخر ہے کہ وہ تعلیمی مواقع کے سلسلے میں لڑکے اور لڑکی میں فرق نہیں کرتے ہیں ۔ لیکن ان کو بھی لڑکی کے مخصوص رول اور نسوانی صلاحیتوں کا خیال برابر رہتا ہے ۔ یہ فرق اب تک باقی ہے کہ لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں کا تحفظ کیا جاتا ہے ۔ اس بات پر اب بھی زور دیا جاتا ہے کہ لڑکیاں ایسی تعلیم حاصل کریں جو عورتوں کے لیے مناسب ہو ۔ لڑکوں سے گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹانے کو نہیں کہا جاتا ہے لیکن ان سے اس طرح کے کام لیے جاتے ہیں جیسے بازار سے سودا خریدنا ، باہر کے اور چھوٹے موٹے کام کرنا ، ماں بہنوں کی حفاظت کے لیے ان کے ساتھ باہر جانا ۔ اگر لڑکوں میں کھانا پکانے ، سینے پرونے کی صلاحیت ہو تو ان کا مذاق اڑایا جاتا ہے ، اور ان کی ہمت افزائی نہیں کی جاتی ہے ۔

لڑکوں کی تعلیم اور کیریر پر زور دیا جاتا ہے اور بہت کم ماں باپ یہ تصور کرتے ہیں کہ لڑکیاں بھی کوئی کیریر اختیار کریں ۔ لڑکی کی زندگی کا واحد مقصد شادی سمجھا جاتا ہے ۔ تعلیم اس لیے دلادی جاتی ہے کہ آڑے وقت میں وہ اس کے کام آئے ۔

لڑکیاں پڑھنے لکھنے یا ایسے ہی دوسرے کاموں میں مہارت بھی رکھتی ہوں ، تو بھی اس بات کا جائز عذر نہیں سمجھا جاتا ہے کہ وہ گھر کے کاموں میں دلچسپی نہ لیں ۔ لڑکے اور لڑکی کے رول میں امتیاز کے تصور کا اثر ان کی تعلیم پر ناگزیر طور پر پڑتا ہے ، کہ ان کی

تعلیم پر کتنا خرچ کیا جائے اور ان کی اہلیت و صلاحیت کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

عورتوں کے نسوانی رول پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے اور اس کا اثر لازمی طور پر بچپن سے ہی ان کی شخصیت پر پڑتا ہے۔ وہ شروع سے ہی کردار میں لچک پیدا کرنا حالات سے مطابقت پیدا کرنا اور اطاعت شعاری سیکھتی ہیں۔

اسی لیے وہ کسی معاملے میں الگ مضبوطی سے اپنی رائے رکھنے میں ہچکچاتی ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ شادی کے بعد انہیں اس پر قائم رہنے کا موقع نہ ملے۔ ان قیود اور موانع سے اکثر عورتوں کی آئندہ زندگی پر اثر پڑتا ہے۔ خصوصاً اس وقت جب ان کو اپنے کیریر کے سلسلے میں مردوں سے مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔ غریب طبقوں میں جہاں لڑکیاں گھر کا خرچ چلانے میں مدد کرتی ہیں، لڑکوں کی تعلیم پر ان کی تعلیم کو قربان کر دیا جاتا ہے۔ اس جائزے کے سلسلے میں سفر کے دوران ہمیں ایسی بھی مثالیں ملیں، کہ علاوہ معاشی اسباب کے ماں باپ لڑکیوں کو تعلیم دلانے سے اس لیے بھی گھبراتے ہیں کہ وہ والدین اور خاندان کی اطاعت سے سرتابی نہ کریں۔ اور اپنے رواجی رول سے بیگانہ نہ ہو جائیں۔

گھر اور کام | وہ نسبت جو لڑکیوں کی کمانے کی اہلیت اور خاندان کے اندر اُن کی حیثیت میں ہے، اس بات پر منحصر ہے کہ جو کام وہ کرتی ہیں، وہ کس درجے کا ہو۔ چونکہ ہاتھ کا کام ہمارے معاشرے میں کمتر سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے وہ عورتیں جو مزدوری کرتی ہیں یا ایسے چھوٹے موٹے کام کرتی ہیں جن کے لیے کسی ہنر کی ضرورت نہیں ہے، ان کی حیثیت ہمارے معاشرے میں اونچی نہیں سمجھی جاتی ہے، جبکہ ان عورتوں کی عزت ہوتی ہے جو اونچے درجے کا کام کرتی ہیں۔

غریب طبقے کی عورتیں گھر کے کاموں اور اس کام کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہوتی ہیں، جو وہ روزی کمانے کے لیے کرتی ہیں۔ وہ اسی لیے بچوں کی دیکھ بھال اچھی طرح نہیں کر پاتی ہیں۔ اور متوسط طبقے کی عورتیں جنہیں گھر کے کاموں اور ملازمت سے نپٹنا پڑتا ہو، ان کی حالت بھی کچھ بہتر نہیں ہے۔ شہری زندگی میں عورتوں کے لیے کچھ آسانیاں ہیں۔ جن سے گھر کا کام کسی قدر سہل ہو جاتا ہے (مثلاً انہیں پانی اور ایندھن دور سے نہیں

لانا پڑتا ہے) لیکن اپنے درجے کی دیہاتی عورتوں کے مقابلے میں ان سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ بچوں کی تعلیم پر زیادہ توجہ دیں۔ گھر زیادہ سے زیادہ سلیقے سے رکھیں۔ نئے نئے کھانے پکائیں، اور آئے دن کے مہمانوں اور خاندان کے دوستوں کی میزبانی کریں۔ ان پر کام کے اس بوجھ سے اس بات کی توجیہ ہوتی ہے کہ برابر ان کو یہ خواہش رہتی ہے کہ ان کی لڑکیاں آرام اور فراغت کی زندگی گزاریں۔ اس طبقے کی عورتوں کے دل میں بہت وسعت ہوگئی ہے کہ انھیں اپنے روایتی فرائض کے علاوہ نئے فرائض بھی انجام دینے ہوتے ہیں۔ پورے وقت کی ملازمت اور اس کے لیے جتنی پیشہ ورانہ کارگزاری کی ضرورت ہوتی ہے، اس سے متعلق ذمہ داریاں اٹھانا پڑتی ہیں۔ پھر گھر کو جدید طرز اور خاندان کے ساتھ جس کا دائرہ اب وسیع ہوگیا ہے چلانا ہوتا ہے۔ ان سب کاموں اور فرائض کے دباؤ نے ان کو ذہنی الجھنوں اور کشمکش میں مبتلا کردیا ہے۔ اور ان حالات کی بنا پر ان کی زندگی بہت کٹھن ہوگئی ہے۔ بہت کم عورتیں ہیں، جنھیں مالی فراغت اور خاندان کے لوگوں کی ہمدردی حاصل ہے اور انھیں کسی قدر آرام اور فرصت کا موقع ملتا ہے۔ جس میں وہ اپنی ذہنی اور اخلاقی صلاحیتوں کو بڑھائیں۔ یا ان سماجی تقاضوں اور گھر و ملازمت کے کاموں میں ہم آہنگی پیدا کریں۔

عورت کی ملازمت اور اس کے عام زندگی میں حصہ لینے کے بارے میں سماج کے رویّوں میں جو تبدیلی آئی ہے۔ اس کی رفتار سست اور ناہموار ہے۔ ان رویّوں کا تعلق عورت کی فطری صلاحیتوں، رجحانوں، اس کے دائرہ عمل اور مرد عورت کے تعلقات کے فرق کے گہرے تعصبات سے ہے جو لوگوں کے ذہنوں میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹری اور معلمی کا پیشہ عورتوں کے لیے اور پیشوں کے مقابلے میں زیادہ باعزت سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے کہ یہ پیشے ان روایتی تصورات سے نہیں ٹکراتے جو لوگوں کے ذہنوں میں نسوانیت کا بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے برخلاف نرسنگ کا پیشہ روایتی نسوانی رول سے تو نہیں ٹکراتا، لیکن اس میں گندی چیزوں کو چھونا پڑتا ہے۔ مرد مریضوں اور ڈاکٹروں سے سابقہ رہتا ہے۔ کام کے اوقات غیر معین ہیں۔ اس لیے چند علاقوں اور قوموں کو چھوڑ کر اسے کم مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ اسی قسم کے تعصبات عورتوں کے ڈرامہ

موسیقی اور رقص میں حصہ لینے کے سلسلے میں پائے جاتے ہیں مگر اب یہ کم ہوتے جا رہے ہیں چونکہ ان سے آمدنی بہت ہوتی ہے۔

چھوٹے شہروں میں ان تبدیلیوں کی رفتار اور بھی سست ہے۔ یہاں کے سماجی رویّوں کی وجہ سے عورتوں کا کسی غیر روایتی پیشے میں جانا اور بھی مشکل ہے۔ چونکہ آزادی کے بعد عورتوں کو انتظامی سروس کے عہدوں پر فائز ہونے کا موقع مل گیا ہے، اس لیے اس قسم کی ملازمتوں کے خلاف تعصب تیزی سے ختم ہو رہا ہے۔ لیکن چھوٹے شہروں میں مرد اب بھی عورت افسر کے ماتحت کام کرنا پسند نہیں کرتے ہیں۔ عورت کے مناسب مقام کے روایتی تصوّرات کی بنا پر ایسے واقعات پیش آتے ہیں۔ جیسے اتر پردیش کا وہ مشہور واقعہ جس میں وہاں کے وزیرِ اعلیٰ نے یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ افسر عورتوں کو انتظامی ذمہ داریاں نہ سپرد کی جائیں۔ یہ خیالات سب کے ذہنوں میں بیٹھے ہوئے ہیں، ان میں مرد بھی شامل ہیں اور عورتیں بھی۔ اور آجکل ادب، فلم، اخبارات، ریڈیو اور سماجی تحقیق کا موضوع بنے ہوئے ہیں۔

اس کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں کہ معاشرے میں عورتوں کا اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سماج کی نظروں میں پسندیدہ بھی ہے اور ناپسندیدہ بھی۔ ایک وقت میں ان کی آمدنی کی قدر کی جاتی ہے کہ اس سے مالی بوجھ کم ہوتا ہے اور معیارِ زندگی بلند ہو جاتا ہے، لیکن باہر کام کرنے کے سلسلے میں جس آزادی اور دوڑ دھوپ کی ضرورت ہوتی ہے بہت سے لوگ اسے نہیں پسند کرتے اور اب تک باہر کام کرنے والی عورتوں کو بدنام کیا جاتا ہے۔

مرد اپنی ملازمت سے دیر میں واپس آ سکتے ہیں، اپنی خانگی ذمہ داریوں کو کچھ عرصے کے لیے ٹال سکتے ہیں، لیکن عورتوں کو اس کی اجازت نہیں ہے۔ ہمیں بہت سی شکایتیں ملی ہیں کہ وہ لوگ جو باہر کے ملکوں میں جا کر گھر کے کاموں میں بیوی کی مدد کرتے ہیں اپنے ملک واپس آ کر اس سے احتراز کرتے ہیں۔ اگر کچھ مرد گھریلو کاموں میں ہاتھ بٹاتے ہیں تو وہ محلّے والوں اور گھریلو دوستوں کی تنقید اور اعتراض کا نشانہ بنتے ہیں۔ عام طور پر یہ مشہور کر دیا گیا ہے کہ ملازمت کرنے والی عورتیں نہ اچھی ماں ہوتی ہیں نہ کارگزار گھروالی۔ اسی لیے گھر کی مالی حالت ذرا بہتر ہو جائے تو اکثر عورتیں ایک دم باہر کا کام

کرنا چھوڑ دیتی ہے۔ باہر کام کرنے والی زیادہ تر عورتوں کو یہ احساس سا رہتا ہے کہ وہ بچوں پر اتنی توجہ نہیں دیتی ہیں کہ جتنی دینی چاہیے۔ اور اس کی تلافی کرنے کے لیے وہ حد سے زیادہ لاڈ پیار کرتی ہیں۔

عورت اور مرد کے رول میں ٹکراؤ مختلف صورتوں میں ہوتا ہے۔ خصوصاً اس صورت میں جبکہ دونوں کے منصبی درجوں میں مرد کا درجہ کم ہو، دونوں میں موافقت مشکل ہو جاتی ہے۔ کیونکہ مرد سمجھتے ہیں کہ صورتِ حال معمول کے برعکس ہے، جس کے مطابق روزی کمانے کا کام دراصل مرد کا ہے۔ برخلاف اس کے اونچے منصب رکھنے والے مردوں کی بیویوں کا چھوٹے درجے اور کم تنخواہ کے کام کرنا ذلت کی بات سمجھی جاتی ہے۔ سب سے زیادہ قدر ان بیویوں کی ہوتی ہے جو خود کوئی کام نہ کریں اور اپنے کو شوہر کی زندگی سے ہم آہنگ کر لیں۔ وہ عورتیں جو شادی کے بعد نوکری کرنا چاہتی ہیں کہ اپنے ضرورت مند ماں باپ سگے سوتیلے بھائی بہنوں کی کفالت کریں تو ان کو شوہر اور سسرال کی شدید غلط فہمیوں اور غیر ہمدردانہ سلوک کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

عورت مرد کے تعلقات میں عدم مطابقت کے یہ مسائل اس وقت تک باقی رہیں گے جب تک اشتراکی عمل کے ذریعے گھریلو کاموں، خاندانوں میں اور خاندانوں کے باہر مرد اور عورت کے کاموں میں امتیاز کو گھر اور اسکول دونوں سے ختم کیا جائے گا۔ اس میں مدد دینے کے لیے ایسے اقدامات کی ضرورت ہے، جیسے وہ ادارے جن میں کام کرنے والی عورتوں کے بچوں کی نگرانی ہوتی ہے، قائم کیے جائیں۔ نقل و حمل کے ذرائع سہل ہوں۔ محنت بچانے والی مشینیں فراہم کی جائیں، خانہ داری کے کام کو آسان بنایا جائے اور اس میں یہ تبدیلی ہو کہ وقت کم صرف ہو۔ خانہ داری اور بچوں کی تربیت کے کام کو سماجی اور معاشی حیثیت سے پیدا آور کام تسلیم کر لیا جائے تو مردوں کو بھی اس میں حصہ لینے میں ذلت کا احساس نہیں ہوگا۔ اور نہ یہ کام جدید معاشرے میں عورت کے متعدد رول ادا کرنے میں مانع ہوں گے۔ اگر خانہ داری کے کام کا شمار قومی کفایت اور معاشی استحکام میں کیا جائے تو سماج میں عورت کے کام کا اعتراف بھی ہوگا اور وہ اس کا ممنون احسان بھی ہوگا۔ برخلاف اس صورتِ حال کے کہ بے چاری عورت کو محنت اور مشقت تو کرنی پڑتی ہے۔ مگر اس کا اعتراف نہیں ہوتا

خاص مسائل | عورتوں کی ضروریات کا جو تصور ہے اور انھیں پورا کرنے کے لیے جو اسے مواقع حاصل ہیں، ان میں فرق ہے۔ اسی کی وجہ سے اس کا استحصال کیا جاتا ہے۔ اس کی تلافی صرف قوانین اور عورتوں کے فلاح و بہبود کے پروگراموں سے نہیں ہوگی۔ بلکہ اس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ یہ مسائل اتنے بڑے اور پیچیدہ ہیں کہ بغیر اداروں کی مدد کے حل نہیں ہو سکتے ہیں۔ جس معاشرے میں تبدیلیاں آ رہی ہوں اور جس کے اندر آپس میں تہذیبی اختلافات ہوں، سماجی اداروں اور قدروں کو بدلتی ہوئی ضرورت کے مطابق بنانے کی رفتار سست ہو، تو اس میں طرح طرح کے مسائل پیدا ہوتے ہیں اور معاشرے میں لوگوں کے رویے میں ایک ایسی کج روی نظر آتی ہے، کہ جنھیں سماجی، معاشی نظام کے ڈھانچے میں تبدیلی لائے بغیر دور نہیں کیا جا سکتا۔ یہ مسائل عصمت فروشی، قیدی عورتوں کے، کنواری ماؤں اور ضعیف عورتوں کے مسئلوں پر مشتمل ہیں۔

عصمت فروشی | اس قدیم پیشے کو جدید طریقوں سے تجارتی پیمانے پر چلانا نئی چیز ہے اس لعنت کے فروغ میں یہ عوامل ہمیشہ سے بہت اہم رہے ہیں۔ عصمت عفت پر حد سے زیادہ زور، کم سنی کی شادی، بیوہ کی دوسری شادی کی ممانعت، جہیز اور عورتوں کے روزگار کے مواقع میں کمی۔ صنعتی نظام اور شہروں میں جا کر بسنے کا بڑھتے ہوئے رجحان نے عصمت فروشی کے دھندے کو نہایت منافع بخش صنعت بنا دیا ہے اور اس کی پوری نوعیت کو بدل دیا ہے۔ اب روایتی اداروں کے بجائے بعض ذاتوں میں اسے سماجی اور مذہبی جواز حاصل تھا۔ نئے زمانے نے قحبہ خانے چلانے کا ایک بہت بڑا بیوپار بنا دیا ہے۔ عصمت فروشی کے بارے میں جو حال میں تحقیقات ہوئی ہے، اس سے یہ ثابت ہوا ہے کہ عصمت فروش عورتوں کی بڑی تعداد ان روایتی گروپوں کی اولاد ہے۔ لیکن اس کے ساتھ بہت سی ایسی بھی ہیں، جو اس پیشے میں نئی ہیں اور یہ وہ عورتیں ہیں جو سماجی ظلم و ستم کا شکار تھیں۔ کیونکہ عورتوں کے لیے روزگار کے مواقع کافی نہیں ہیں۔ اس غریب بلکہ متوسط طبقوں کے خاندانوں میں بھی شوہروں کو مجبوراً بیویوں کو عصمت فروشی کی اجازت دینی پڑتی ہے۔ پابند مزدوروں[1] اور دوسرے کھیت مزدوروں کی بیویاں اپنے خاندانوں کو قرض کے جال سے نکالنے کے لیے یہ پیشہ اختیار

---

[1] وہ مزدور جن کو قرض دے کر بلا اجرت کام کروایا جاتا ہے اور اس طرح ان کے قرض کی ادائیگی ہوتی ہے۔

کرلیتی ہیں۔ کچھ علاقوں میں کنواری لڑکیوں کو اس لیے اس کی اجازت دیدی جاتی ہے کہ وہ اس طرح اپنی کمائی سے جہیز کا سامان کریں۔ ابھی حال میں کچھ متوسط طبقے کی عورتوں نے یہ پیشہ ضرورت سے مجبور ہوکر اور تھوڑی عورتوں نے خوشحالی کا بھرم قائم رکھنے کو اختیار کر لیا ہے۔

یہاں تک کہ کچھ تعلیم یافتہ عورتیں بھی اس صف میں نظر آتی ہیں، چونکہ دوسرے قسم کے روزگار حاصل کرنے میں دشواریاں ہیں۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ اس پیشہ کی حیثیت ہندوستان میں تاریخی اور روایتی ہے، پھر بھی ہمارے نزدیک اس کی بنیاد اس استحصال پر قائم ہے، جو امیر غریب کا اور مرد عورتوں کا کرتے ہیں۔ اب اگر عورتوں کو سماج میں مردوں کی برابری کا درجہ حاصل ہونا ہے، تو سماج کو انھیں معاشی، سماجی اور نفسیاتی تحفظ کی ضمانت دینی ہوگی۔ ان کو اس نابرابری اور استحصال کی بدترین شکل سے بچانا ہوگا۔ بڑے شہروں اور دوسرے شہری علاقوں میں عصمت فروشی کے پھیلتے ہوئے دائرے سے ایک طرف تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے یہاں اس کی مانگ بہت بڑھ رہی ہے دوسرے اس کاروبار کے فروغ میں بہت سے بچولیے اور دلال پیدا ہو گئے ہیں، جو اس سے منافع کماتے ہیں اور اس منافع کے لالچ سے نہ صرف قبائلی عورتوں بلکہ دوسرے طبقوں کے لوگوں کو شہ ملتی ہے کہ ان عورتوں اور لڑکیوں کو اپنے جال میں پھنسا لیں۔ جن میں یہ رواج کبھی نہیں رہا ہے۔

۱۹۵۶ میں جو عورتوں کو پیشہ کرانے کے انسداد کا ایکٹ پاس ہوا تھا اس کا مقصد اس تجارتی کاروبار کو ختم کرنا تھا لیکن اس میں عصمت فروشی کرنے والی عورتوں یا اپنے طور پر عصمت فروشی کرنے کی سزا نہیں رکھی گئی تھی۔ بلکہ اس کو ایسی صورتوں میں قابل تعزیر ٹھہرایا تھا جب یہ اپنا دھندا پبلک مقامات اور عبادت خانوں کے قرب و جوار میں کریں۔ پولیس کے بڑے عہدیداروں کے مطابق قانون میں اس کمی اور نیز اس امر کی وجہ سے کہ چھاپہ مارتے وقت عورت گواہوں کی موجودگی ضروری ہے، پولیس کے اختیارات اس پیشے کو دبانے کے سلسلے میں بہت محدود ہیں۔ سماجی کام کرنے والے اور پولیس کے افسر اس بات پر متفق ہیں کہ اس ایکٹ میں اس جرم کے لیے جو سزائیں رکھی گئی ہیں، وہ نہایت ناکافی ہیں۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ قانون میں ترمیمیں زیر غور ہیں۔

ہماری تجویز ہے کہ عورتوں کو اس پیشے سے بچانے اور ان عورتوں کو جو اس پیشے میں

ہیں، سماج میں بحال کرنے کے لیے بہتر تدبیریں ہونی چاہئیں۔ ناجائز اور ایسے بچوں کے لیے جن کی ماؤں نے انھیں چھوڑ دیا ہو، ہوم ہونے چاہئیں۔ ان عورتوں کے لیے جنھیں اخلاقی اور سماجی خطروں کا سامنا ہو۔ ایک مشاورتی سروس ہونی چاہیے۔ جو انھیں اس پیشے سے نجات دلائے۔ اور ان کی معاشی بحالی کا انتظام بھی ہونا چاہیے۔

قیدی عورتیں

قیدی عورتوں کی حالت پر مناسب توجہ نہیں دی گئی ہے، اس لیے کہ وہ کل قیدی آبادی کا ایک بہت چھوٹا حصہ ہیں (۳۰ء۴ فیصدی سزا یافتہ ۲۰ء۳ فیصدی وہ ہیں جن کے مقدمے زیر سماعت ہیں)۔ ان میں تقریباً ۷۰ فیصدی مجرم عورتیں ۲۱ سے چالیس سال کی عمر کی ہیں۔ ۱۰ فیصدی کے قریب وہ ہیں جن کی عمر ۱۶ سے بیس سال کے درمیان ہے۔ ان میں ۸۲ فیصدی ناخواندہ، ۱۵ فیصدی کنواری اور ۱۲ فیصدی بیوائیں ہیں۔ ان میں سے بڑی اکثریت صاحب اولاد عورتوں کی ہے۔ یہ معلوم ہوا ہے کہ ان کے جرم کے اسباب زیادہ تر مفلسی اور کچھ سماجی معاملات میں ان کی لاچاری اور بے بسی ہے۔ ان میں زیادہ تر ایسی ہیں جو عادی مجرم نہیں ہیں۔ اور ان کے لیے جیل کی زندگی غیر صحت مند ہے۔ لاکمیشن نے یہ سفارش کی تھی کہ وہ مجرم عورتیں جن کو تھوڑے عرصے کی قید کی سزا دی گئی ہو۔ ان کو جیل میں نہیں بھیجنا چاہیے۔

ہمیں یہ بھی اطلاع ملی ہے کہ بعض جیلوں میں قیدی عورتوں کو، جن میں مجرم بھی ہیں اور غیر مجرم بھی پاگل عورتوں کے ساتھ رکھا جاتا ہے۔ یہ ایک خطرناک عمل ہے۔ جو مجرم عورتوں کی اصلاح اور سماج میں ان کی بحالی کی راہ میں بھی رکاوٹ ہے اور پاگل عورتوں کے علاج میں بھی حارج ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں جو دوسرا مسئلہ ہمارے علم میں آیا ہے، وہ یہ ہے کہ مقامی جیلوں میں جگہ کی کمی کی وجہ سے قیدی عورتوں کو گھروں سے دور کے جیل خانوں میں بھیج دیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے گھریلو زندگی و سماج میں ان کا دوبارہ کھپنا اور خاندان میں جگہ پانا زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔

خودکشی

ردِ عمل ہے ان مسائل کا جو بظاہر کسی اور طرح حل نہیں کیے جا سکتے۔ یہ وہ آخری قدم ہے جو انسان اپنے اندرونی کرب اور اضطراب سے نجات پانے کے لیے اٹھاتا ہے، تہذیبی ڈھانچہ، سماجی معاشی حالات، اجتماعی سرگرمیوں کی نوعیت یہ ایسی چیزیں ہیں، جن سے خودکشی کو بڑھاوا ملتا ہے۔ یا اس کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ ہندوستان

میں خودکشی کی سب سے قدیم شکل جس نے رواج کی شکل اختیار کرلی تھی "ستی" تھی۔ اور ایسے سماجی نظام کا نتیجہ تھی جس میں بیوہ کو ذلیل سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اس کو انیسویں صدی میں قانوناً ممنوع قرار دیدیا گیا۔

۱۹۶۹ء ـ ۱۹۶۶ء میں کل ملاکر جتنی خودکشی کی وارداتیں ہوئیں، ان میں عورتوں کی تعداد مردوں کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ ۱۹۷۰ میں خودکشی کرنے والوں میں عورتیں ۴۸ء۴۱ فیصدی ہیں۔ خودکشی کرنے والی عورتوں کی سب سے زیادہ تعداد ۱۵ سے ۲۴ برس کی عمر کی اور ۲۵ سے ۴۵ سال کی عمر کی عورتوں کی ہے۔ خودکشی کے اسباب عام طور پر یہ معلوم ہوئے ہیں کہ خوفناک بیماری کی وجہ زندگی سے بیزار ہو جانا۔ ساس سسر یا میاں بیوی کی آپس کی ناچاقی۔ خودکشی کے اسباب کا اب تک کل ہند سروے نہیں ہوا ہے۔ لیکن گجرات میں عورتوں کی بڑھتی ہوئی خودکشی کے وارداتوں کی وجہ سے ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر ہوئی تھی۔ اس نے یہ معلوم کیا کہ ان خودکشیوں میں جو عورتیں کرتی ہیں، ان کے اسباب جسمانی، دماغی اور گھریلو پریشانیاں ہیں۔ اور مردوں کی خودکشی کی زیادہ تر وجہ معاشی پریشانیاں ہوتی ہیں۔ ان عورتوں میں جنھوں نے خودکشی کی ہے ۶۲ فیصدی جاہل تھیں اور ان میں بڑی اکثریت شادی شدہ عورتوں کی تھی، تحقیقاتی کمیشن نے اس پر زور دیا کہ خودکشی کے خاص اسباب کم سنی کی شادی، شوہر کے انتخاب میں آزادی نہ ہونا، اور مشترک خاندان کی وجہ سے تعلقات کی خرابی۔ اس سے پہلے خودکشی کے سلسلے میں جو سروے ہوئے (ریاست بمبئی میں ۵۴-۱۹۵۰ اور سوراشٹر میں ۵۵-۱۹۵۲) ان سے یہ معلوم ہوا کہ گجرات کے کچھ ضلعوں میں خودکشی کی وارداتیں مردوں سے زیادہ عورتوں میں ہوتی ہیں۔

حال میں جو واقعات ہوئے ہیں جن میں عورتوں نے بچوں کے ساتھ خودکشی کی ہے، اس کی ایک وجہ خاندانی معیشت کا عدم استحکام اور سماجی تحفظات اور روزگار کے مواقع میں کمی ہے۔ خودکشی دراصل اس بات کی علامت ہے کہ سماجی تنظیم میں شدید خرابی ہے۔ جو روز بروز بڑھتی جائے گی، اگر افلاس اور محرومیوں کی وجہ سے زندگی کی دشواریاں یوں ہی بڑھتی گئیں۔

کنواری مائیں خودکشی کی تحقیقاتی کمیٹی نے اس کی شرح کے بڑھنے کا ایک بہت بڑا سبب ناجائز حمل بتایا ہے سن ۱۹۷۱ میں طبی اسقاط حمل ایکٹ کے پاس

ہونے سے پہلے غیر شادی شدہ ماؤں کے پاس تین راستے تھے یا تو مجرمانہ اسقاطِ حمل کرا کے اپنی جان خطرے میں ڈالیں۔ یا محتاجی کی زندگی بسر کریں یا پھر طوائف بن کر رہیں۔ کچھ ناجائز حمل زنا بالجبر کچھ خاندانی تعلقات میں ناخوشگواری خاندانی زندگی کا شیرازہ بکھر جانے یا جنسی معاملات میں ناواقفیت کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ ہم ان میں سے کچھ ایسی عورتوں سے ملے جن کی زندگی صرف اس لیے تباہ ہو گئی، کہ اس حالت میں انھیں خاندانوں نے قبول کرنے یا کسی قسم کی مدد کرنے سے بالکل انکار کر دیا تھا۔ ایک باپ نے اس حالت میں اپنی بیٹی کو جان سے مار ڈالنے کا حکم دیدیا تھا، اس کی جان گاؤں کے ماسٹر نے عورتوں کے ہوم میں بھیج کر بچائی۔

ایسے ہوم جن میں اس قسم کی عورتوں کو رکھا جائے بہت کم ہیں۔ اور جو ہیں ان سے عام طور پر لوگ واقف نہیں ہیں۔

یہ مسئلہ شہروں میں منتقل ہونے کے بڑھتے ہوئے رجحان اور روایتی وسماجی معیاروں میں انتشار پیدا ہونے کی وجہ سے بڑھ کر رہا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس پر جتنی توجہ دی گئی ہے، اس سے بہت زیادہ توجہ رضاکارانہ فلاح وبہبود کی تنظیموں اور سرکاری ایجنسیوں کو دینی چاہیے۔ اس کی سخت ضرورت ہے کہ اس کے بارے میں معلومات حاصل کی جائیں۔

ایسی عورتوں کے لیے مشورہ اور مدد کا انتظام ہونا چاہیے کہ وہ سماج اور خاندانوں میں کھپ سکیں۔

ضعیف عورتیں ہندوستان کے روایتی سماج میں مشترک خاندان کے رواج کی وجہ سے بوڑھے لوگوں کا تحفظ ہو جاتا تھا۔ خاندانی تنظیم کے اس ڈھانچے اور قدیم اقدار میں انتشار کی وجہ سے بوڑھی عورتوں کی بڑی تعداد معاشی طور پر لاچار ہو کر رہ گئی ہے۔ بہت سی بوڑھی عورتیں محتاج خانوں میں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہی ہیں، کیونکہ ان کا اور کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ ان کے خاندان والے شاذ و نادر ہی آکر ان کو دیکھتے ہیں۔

اگرچہ کچھ ریاستی حکومتیں ایسی اسکیمیں چلا رہی ہیں کہ جن میں بوڑھے لوگوں کو پنشن دی جاتی ہے۔ لیکن اس کے بارے میں ہمیں یہ معلوم ہوا ہے کہ ایک تو ان کی رقم بہت کم ہے۔ دوسرے کم لوگوں کی پہنچ اس تک ہو پاتی ہے۔ پھر پنشن لینے والے لوگوں کی جہالت اور مجبوری سے فائدہ

اٹھا کر بیچ کے لوگ جو اس کی وصولیابی میں مدد کرتے ہیں۔ اپنا کمیشن وصول کر لیتے ہیں ریاستی حکام، غیر سرکاری ایجنسیوں کو اس پر خاص طور سے دھیان دینے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ زمانے کے بدلتے ہوئے ماحول میں بوڑھی عورتوں کے خاندان والوں میں یہ احساس روز بروز بڑھتا جاتا ہے کہ یہ بوڑھیاں ان کے سر پر خواہ مخواہ کا بوجھ ہیں۔

محتاج اور کنگال عورتیں پچھلے چند سالوں سے محتاج عورتوں کی تعداد میں غریبی بے روزگاری اور خاندانی تنظیم کا شیرازہ بکھر جانے کی وجہ سے بہت اضافہ ہو رہا ہے۔ اور یہ شہری اور دیہاتی دونوں علاقوں میں زیادہ کثرت سے نظر آنے لگی ہیں۔ ان میں زیادہ تر بیوائیں یا وہ عورتیں ہیں جن کے شوہروں نے چھوڑ دیا ہے۔ یہ عورتیں یا تو بھیک منگوں کے لشکر میں شامل ہو جاتی ہیں۔ یا پھر ان سے پیشہ کرا کر ان کا استحصال کیا جاتا ہے۔ اس طرح وہ اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتی ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ حکومت کا یہ تخمینہ کہ ۴۰-۱۴ سال تک کی عمر کی عورتیں ہر سال ایک لاکھ کے قریب معذور ہو جاتی ہیں، دراصل کم ہے۔ ان کی بحالی کے ادارے ان کی تعداد کے لحاظ سے بہت ناکافی اور طریق کار کے لحاظ سے ناقابل اطمینان ہیں۔

خلاصۂ بحث

ہمارے جائزے کے مطابق ہم ایسے نئے معیار اور ادارے قائم کرنے میں ناکام رہے ہیں، جن کی بدولت عورتیں اس قابل ہو سکیں کہ ہندوستانی سماج کی توقع کے مطابق اپنے متعدد رول ادا کر سکیں۔ دستور نے ہندوستانی عورتوں کو جن حقوق اور مواقع کی ضمانت دی ہے ان کی اکثریت اس سے فائدہ نہیں اٹھا رہی ہے۔ جہیز اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کا بڑھتا ہوا رواج جن سے عورت کی سماجی حیثیت گھٹ جاتی ہے، یہ ظاہر کرتا ہے کہ تحریک آزادی کے زمانے میں عورتوں کی حیثیت کے جو معیار قائم ہوئے تھے وہ اب رجعت کی طرف مائل ہیں۔ علاقائی زبانوں کے رسالوں کے مضامین کے تجزیہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پچھلی دو دہائیوں میں عورتوں اور ان کے

مسائل کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ نئے سماجی قوانین سے بہت سی عورتیں اب بھی ناواقف ہیں۔ یہ درست ہے کہ سماج کے ادارے اور رویے تیزی سے نہیں بدلتے مگر عورتوں کی فلاح و ترقی کے عمل میں تیزی اس طرح سے لائی جا سکتی ہے کہ اس میں سوچ بچار کے بعد منصوبہ بندی کوششیں کی جائیں۔ اس کی ذمہ داری، ریاست، سماج اور ان سب لوگوں پر یکساں عائد ہوتی ہے، جو عورتوں اور مردوں میں مساوات کے قائل ہیں، ہم ان سب کو تاکید کرتے ہیں کہ وہ اس بارے میں رائے عامہ کو ہموار کریں اور ان کوششوں کو تقویت پہنچائیں جو اس طرح کے رواجوں، جیسے کم سنی کی شادی، تعدد ازدواج، جہیز اور شادی میں بے جا اسراف کے انسداد کے لیے کی جا رہی ہیں۔ اور انھیں ایسی مہمیں چلانی چاہیں کہ عورتوں میں اپنے قانونی حقوق کا زیادہ سے زیادہ شعور ہو۔ اخبار، ریڈیو، فلم جنھوں نے اب تک لوگوں کی توجہ صحیح رُخ کی طرف موڑنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ عورتوں کو ان کے حقوق و فرائض کے بارے میں بنیادی معلومات بہم پہنچانے کے لیے کچھ نہیں کیا ہے۔ انھیں اس پر آمادہ کرنا چاہیے کہ وہ اس معاملے میں زیادہ سرگرمی دکھائیں۔ خاص طور پر فلم بنانے والوں اور اشتہار دینے والوں کے خلاف ان شکایات پر بھی توجہ دینا چاہیے جو ہمارے سامنے پیش ہوئی ہیں کہ وہ لوگوں کے سامنے عورت کا ذلت آمیز تصور پیش کرتے ہیں، اس طرح کہ وہ عورت کا محض جنسی پہلو دکھاتے ہیں، جس سے جنسی جرائم اور بے راہ روی کو نشہ ملتی ہے اور عورت کی سماجی حیثیت خطرے میں پڑ جاتی ہے۔

چوتھا باب

عورتیں اور قانون

ہم نے عورتوں کی قانونی حیثیت کا جائزہ تمام نقطہ ہائے نظر سے لیا خصوصاً شادی ۔ طلاق ۔ بچوں کی متبنیت اور سرپرستی ۔ گزارہ وراثت اور بعض دیگر متعلقہ مسائل کے لحاظ سے مثلاً ازدواجی جائداد ۔ خاندانی عدالتیں (فیملی کورٹ) یکساں ضابطہ دیوانی اور قانون فوجداری نیز قانون متعلقہ قومیت میں اصلاحات ۔ اس سلسلے میں ہماری تحقیقات کے نتائج اور ہماری سفارشات مندرجۂ ذیل ہیں ۔

قانون، سماجی تبدیلی کے ایک آلۂ کار کی حیثیت سے برطانوی عہد حکومت کے دوران سماجی اور مذہبی معاملات میں عدم مداخلت کی عام پالیسی کے گوناگوں نوعیت کے نظاموں کو استحکام و دوام عطا کردیا اور سماجی معاشی تبدیلیوں کے ساتھ عام فطری مطابقت عمل کو روک کر بطور نتیجہ ایک جمود کی کیفیت اور نہ صرف مختلف مذہبی فرقوں کے درمیان بلکہ ان فرقوں کے ذیلی حصوں کے درمیان بھی اختلافات میں شدت پیدا کردی ۔ انیسویں صدی کے سماجی مصلحین نے ادھر اُدھر بعض حالات میں مطابقت و ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی ۔جو انسان دوست ملحوظات اور سماجی مطالبات کا نتیجہ تھی اور اس سلسلے میں اہم ترین وہ قانون تھا جو رسم ستی کے خلاف بنایا گیا ۔ لیکن اس قسم کی سماجی آئین سازی کی کوئی کوشش ۱۸۵۷ کے

بعد نہیں کی گئی۔ قومی تحریک کے طاقتور ہونے اور مہاتما گاندھی کی کوششوں کے ساتھ ساتھ اس غرض سے ایک مطالبہ پیش کیا جانے لگا کہ قانون میں بڑی قسم کی تبدیلیاں کی جائیں اور عورتوں کی قانونی کمتری کو دور کیا جائے نیز یہ کہ شادی، طلاق، وراثت یا بچوں کی سرپرستی جیسے معاملات میں جو کہ ان کی زندگی اور شخصیت پر اثرانداز ہوتے ہیں اس امتیازی سلوک کو ختم کیا جائے جو اُن کے خلاف روا رکھا جاتا ہے۔ اس طرح ہندو لا (HINDU LAW) میں اصلاح کا سلسلہ خود آزادی سے بھی قبل ہی شروع ہو گیا اگرچہ قدامت پرستانہ مزاحمت کے باعث ۱۹۵۰ سے شروع ہونے والے عشرۂ سال کے دوران اس اصلاح کا عملی نفاذ محض جزوی طریقہ پر ہی کیا جا سکا۔

سماجی تبدیلی پیدا کرنے کے لیے آئین سازی پر حد سے زیادہ انحصار صرف ہمارے ملک کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ کئی جدید معاشروں کا بھی یہی حال ہے۔ خصوصاً وہ معاشرے جو غیر ملکی دورِ حکومت سے برآمد ہوئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ سماجی تبدیلیوں کو آگے بڑھانے میں قانون کسی حد تک واقعی مفید ثابت ہوتا ہے۔ لیکن اس چیز کی اہمیت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ آئین سازی بذاتِ خود معاشرہ کو تبدیل نہیں کر سکتی۔ عدلیہ ان اصولوں کو عملی شکل دینے میں اکثر ناکام رہی ہے جو قوانین کی تہہ میں کارفرما تھے۔ مثلاً ان معاملات میں جن کا تعلق دو زوجگی سے تھا یا ان معاملات میں جو زوجہ کے حق، کار و کسبِ معاش سے متعلق تھے۔ عاملہ بھی ان قوانین پر عملدرآمد کرانے یا عوامی ذرائع نشر و اشاعت سے ان کے متعلق واقفیت و آگاہی کو توسیع دینے سے قاصر رہی ہے۔ اگر قوانین ایک ملک کی معاشرتی قدر کے آئینہ دار ہوتے ہیں تو آزادیٔ نسواں کی مقدار اس کی عام ثقافتی ترقی کا پیمانہ ہوتی ہے۔

شادی

شادی سے متعلق جو مسائل محتاط و غائر توجہ کی ضرورت رکھتے ہیں، وہ کثرتِ ازدواج، ہندو لا کے تحت دو زوجگی کے خلاف قوانین کا مؤثر نفاذ۔ شادی کے لیے عمر کا تعین۔ شادیوں کا لازمی اندراج (رجسٹریشن) اور جہیز

کثرتِ ازدواج

ایک ایسے قانونی نظام میں جو کثرتِ ازدواج کی اجازت

دیتا ہو اور ایک ایسے سماجی نظام میں جو کہ قانون کی طرف سے جو اس کو برداشت کرتا ہو دونوں جنسوں کے درمیان پوری مساوات بمشکل ہی ممکن ہے۔ کثرت ازدواج کی جو رسم ہندوستان میں روایتی طور پر پھیلی ہوئی تھی وہ خوش قسمتی سے سال کے گزشتہ چند عشروں میں مائل بہ انحطاط رہی ہے۔ یک زوجگی کے اصول کو عیسائیوں ہندوؤں، پارسیوں اور یہودیوں کے لیے بنائے گئے قوانین میں قبول کر لیا گیا ہے اور اس طرح ہندوستان کی ۸۸ فیصدی آبادی پر اس اصول کی قانونی حکمرانی ہے۔ صرف مسلم لا ہی ایسا ہے جو یک زوجگی کی سمت میں اس بدلتے ہوئے رجحان سے غیر متاثر رہ گیا ہے۔

۱۔ کثرت ازدواج کے متعلق مسلم لاء

ہم نے اس مسئلہ پر جن مسلم خواتین کا انٹرویو لیا۔ انھوں نے تین مختلف نوعیت کے خیالات و نظریات کا اظہار کیا (۱) یوپی کے متوسط طبقے کی تعلیم یافتہ خواتین کسی بھی قسم کی تبدیلی کے خلاف تھیں۔ (۲) اسی ریاست کی غریب عورتوں نے یک زوجگی کی شادیوں کی خواہش ظاہر کی اور کثرت ازدواج کی نا انصافیوں کی مذمت کی اور (۳) کشمیر میں عورتوں کی طرف سے کثرت ازدواج کو قانونی طور پر ممنوع قرار دینے کا ایک یکساں اور پرزور مطالبہ کیا گیا۔

مسلم لا شادی کو ایک معاہدہ قرار دیتا ہے۔ بعض فقہا اور علمائے قانون نے ایک معیاری معاہدہ کی وکالت کی ہے جس میں دیگر امور کے علاوہ یہ چیز شامل ہو کہ زوجہ کو اپنے شوہر کو طلاق دینے کا اختیار حاصل ہوگا اگر وہ ایک دوسری زوجہ کر لیتا ہے۔ اگرچہ یہ تدبیر کثرت ازدواج کو روکنے کے لیے پیش کی گئی ہے تاہم یہ ظاہر ہے کہ اس سے پہلی زوجہ اور اس کے بچوں کو کوئی راحت فراہم نہ ہو سکے گی اور نہ شوہر کی پوزیشن پر اس کا کوئی خاص اثر پڑےگا۔ کیونکہ اس کی دوسری شادی جائز ہی رہے گی اور دو زوجگی کا فعل قانونی طور پر غلط نہیں ہوگا۔ یہ تدبیر ان لوگوں کو بھی روکنے میں غیر مؤثر ہوگی جو محض اس لیے ظاہری و جعلی طور پر اسلام قبول کر لیتے ہیں کہ دیگر قوانین کے تحت جو دو زوجگی کی ممانعت ہے۔ اس سے بچ سکیں۔

اگرچہ مسلم لاء میں اصلاح کی ضرورت عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے، اور کثرتِ ازدواج کی بیشتر دوسرے اسلامی ملکوں میں ممانعت ہو گئی ہے۔ تاہم حکومت ہند نے اس سمت کوئی اقدام نہیں کیا ہے کہ مسلم فرقہ میں رائے عامہ اس تبدیلی کے حق میں نہیں ہے۔ مسلمان عورتوں کے مفادات کو نظر انداز کرنا مساوات اور سماجی انصاف سے انکار کے مترادف ہے اور اس لیے یک زوجگی کو ہندوستان میں تمام فرقوں کے لیے ایک اصول و قاعدہ بنا دینے کی بنیادی پالیسی پر کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔

۱۰۔ ہندو میرج ایکٹ کے تحت دو زوجگی کے خلاف قانون کا نفاذ

اگرچہ دو زوجگی کو ہندوؤں کے لیے ایک جرم قرار دیدیا گیا ہے اور قانون کی رو سے دوسری شادی ناجائز ہے۔ تاہم جیسا کہ سنہ ۱۹۶۱ء کی ایک مردم شماری سے ثابت ہوا[٭] اور مدھیہ پردیش، آندھرا پردیش، بہار، اتر پردیش، مغربی بنگال اور مدھیہ پردیش کی ریاستوں میں اپنے دوروں کے درمیان خود کمیٹی کے علم میں جو واقعات لائے گئے ہیں ان کے پیش نظر یہ ظاہر ہے کہ اس قسم کی شادیاں ابھی تک رائج ہیں۔ غیر تعلیم یافتہ اور اقتصادی طور پر مردوں کی دست نگر عورتوں کے لیے اس سلسلے میں عدالتوں میں جانا دشوار ہوتا ہے اور خود ان کے خاندان والے بھی قانونی چارہ جوئی کرنے میں ہمیشہ ان کی مدد نہیں کرتے۔ شادی کے متعلق لفظ، (SOLEMNIZATION) (باضابطہ ادائیگی رسوم) کی فنی و علمی تعبیر سے بھی دشواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ قانون میں مندرجہ ذیل تبدیلیاں کی جائیں، تاکہ ان کا نفاذ موثر طریقہ سے ہو سکے۔

(الف) عدالت کی اجازت کے ساتھ دو زوجگی کے خلاف قانونی چارہ جوئی شروع کرنے کا اختیار لڑکی کے خاندان والوں کے علاوہ دوسرے اشخاص تک وسیع کر دینا چاہیے۔ تاکہ قانون کی خلاف ورزی کو روکا جا سکے۔

(ب) ہندو میرج ایکٹ ۱۹۵۵ کی دفعہ ۱۷ میں شادی کے متعلق (SOLEMNIZATION) (باضابطہ ادائیگی رسوم) کے بجائے یہ الفاظ شامل کر دیے جائیں کہ شادی

٭ ہندوستان میں کثرتِ ازدواج کے واقعات۔ ہندوستان کی مردم شماری سنہ ۱۹۶۱ء (اس کا گراف بھی دیا گیا ہے)

کی کوئی بھی شکل قبول کرتا ہے۔ مزید برآں اس دفعہ میں اس مفہوم کی ایک
تصریح کا اضافہ کردینا چاہیے کہ اگر اس طرح کی شادی سے زن و شوہر کا ایک
حقیقی رشتہ قائم ہو جاتا ہے تو طرفین کی جانب سے بعض ضروری رسوم کی ادائگی
کو ترک و حذف کردینے کے یہ معنی نہیں ہوں گے کہ وہ زوجگی کے جرم کا ارتکاب
نہیں کیا گیا۔

(ج) ہندو میرج ایکٹ ۱۹۵۵ کی دفعہ ۵ میں اس مفہوم کی ایک قانونی
گنجائش فراہم کردینی چاہیے کہ اس ایکٹ میں شامل کوئی بھی چیز ایک عدالت
کو ایک دوزوجگی والی مجوزہ شادی کے خلاف حکم امتناعی دینے میں مانع نہیں
ہو گی۔

۳۔ سابقہ فرانسیسی اور پرتگالی علاقوں میں قوانین

ان علاقوں کے ہندوستان میں
ضم ہو جانے کے بعد بھی قبل
انضمام کے قوانین کو منسوخ نہیں کیا گیا ہے۔ پانڈیچری میں ہندوؤں پر چار تعلقوں
کی اور عیسائیوں پر دو تعلقوں کی حکمرانی قائم ہے۔ گوا۔ دمن اور دیو میں بعض
ہندو فرقوں کے درمیان کثرت ازدواج کی اجازت ہے۔ کثرت ازدواج کی اجازت
دینے والے ایسے قوانین کا جاری رہنا ہماری سماجی پالیسی کے متضاد و متناقص ہو
اور بالکل ناقابل جواز ہے۔ اس لیے ان کی جگہ فوراً ہندو میرج ایکٹ ۱۹۵۵ کا نفاذ
ہونا چاہیے۔

شادی کی عمر

بچپن کی شادی کے تباہ کن اثرات نے سماجی مصلحین کو اس
بات پر آمادہ کردیا کہ ایسی شادیوں پر قوانین کے ذریعہ پابندی
عائد کردی جائے۔ سول میرج ایکٹ ۱۸۷۲ نے شادی کی عمر چودہ سال مقرر کردی
اور کمسنی میں تکمیل زفاف کو روکنے کی کوششوں کا نتیجہ ایسی تدابیر کی شکل میں ظاہر
ہوا جنھوں نے رضا کی عمر کو رفتہ رفتہ ۱۲ سال تک بڑھا دیا۔ آخر میں چائلڈ میرج
ریسٹرنٹ ایکٹ ۱۹۲۹ نے مردوں کے لیے شادی کی کم از کم عمر ۱۸ سال اور عورتوں
کے لیے چودہ سال مقرر کردی (جس کو بعدہٗ ترمیم کرکے ۱۵ سال کر دیا گیا) اگرچہ
بچوں کی شادی کو والدین کے لیے یا ان افراد کے لیے جو ایسی شادی کی رسم ادا کردیں

اس کے لیے ہدایت دیں یا اس کا اہتمام و انصرام کریں اور بالغ دولہا کے لیے ایک قابلِ تعزیر جرم بنا دیا گیا تاہم ایسی شادیوں کی قانونی صحت کو قطعی زیرِ بحث نہیں لایا گیا۔

اس عام ایکٹ کے علاوہ جس کا اطلاق تمام فرقوں پر ہوتا ہے۔ الگ الگ فرقوں کے مختلف پرسنل لاء شادی کے لیے اپنی اپنی کم سے کم عمر رکھتے ہیں۔ ان میں نہ تو کم سے کم عمر کے سلسلے میں کوئی یکسانیت ہے اور نہ قانون کی خلاف ورزی کے نتائج میں۔ صرف اسپیشل میرج ایکٹ ۱۹۵۴ء ہی مردوں اور عورتوں کے لیے شادی کی کم سے کم عمر بالترتیب ۲۱ اور ۱۸ سال مقرر کرتا ہے۔ جتنے بھی پرسنل لا ہیں ان سب میں لڑکیوں کے لیے شادی کی کم سے کم عمر نسبتاً کم متعین کی گئی ہے اور ان سب میں ہی یہ عمر ۱۸ سال سے کم ہے۔

بچپن کی شادی کے خلاف دلائل پیش کرنے کی اب بمشکل ہی کوئی ضرورت باقی ہے۔ لیکن اس امر کی طرف اشارہ کرنا بیجا نہ ہوگا کہ حکومت گجرات نے جو "سوسائڈ انکوائری کمیٹی"[a] مقرر کی تھی اس نے یہ رپورٹ پیش کی کہ کم عمر شادی شدہ عورتوں کے درمیان خودکشی کے واقعات کی کثرت کے ذمہ دار جو نمایاں عناصر ہیں ان میں سے ایک بچپن کی شادی ہے۔ عورت کی شادی کی عمر کو بڑھا کر کم سے کم ۱۸ سال کر دینا مناسب ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے کوئی بھی لڑکی جسمانی اور ذہنی طور پر اتنی پختہ و بالغ نہیں ہوتی کہ مادرانہ ذمہ داریوں کو اٹھا سکے۔

اگرچہ بچپن کی شادی کو قابلِ سزا قرار دینا ضروری ہے۔ تاہم ایسے قانون کے فائدے کو یہ چیز بہت کچھ ختم کر دیتی ہے کہ بذاتِ خود یہ شادی قانوناً درست و جائز مانی جاتی ہے۔ قانون کے اس پہلو میں ترمیم کرنا اور بچپن کی شادیوں کو قانونی طور پر ناجائز قرار دینا ایک طویل المدت مقصد ہونا چاہیے۔ علاوہ ازیں بچپن کی شادیوں کو روکنے اور ان کے نتائج میں تخفیف کرنے کی تدابیر کے طور پر یہ ضروری ہے کہ لڑکی کو سنِ بلوغ میں پہنچ کر انتخاب کا حق و اختیار دیا جائے جیسا کہ مسلم لا میں ہے۔ ایک لڑکی کو مسلم لا کے تحت یہ اختیار حاصل ہے کہ سنِ بلوغ کو پہنچنے پر اپنی بچپن کی شادی کو فسخ کر سکتی ہے۔ اگر مندرجہ ذیل امور مسلم ہوں:

---

[a] سوسائڈ انکوائری کمیٹی (ریشپ ہٹی) گورنمنٹ آف گجرات ۱۹۵۴ء کی رپورٹ کے مطابق۔

(۱) یہ کہ اس کی شادی باپ یا سرپرست نے پندرہ سال کی عمر سے پہلے کردی تھی۔
(۲) یہ کہ وہ ۱۸ سال سے پہلے ہی شادی کو ختم کردے اور
(۳) یہ کہ شادی کے بعد جنسی تعلقات قایم نہیں ہوئے۔

سنِ بلوغ پر شادی کو فسخ کردینے کا یہ حق تمام فرقوں میں لڑکیوں کو ملنا چاہیے قطعِ نظر اس کے کہ شادی کے بعد جنسی تعلقات قائم ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں۔

حکومتِ گجرات نے بچپن کی شادی کو ایسا جرم قرار دیا ہے جو قانون کے خلاف ہے اور جس کی سماعت عدالت میں ہوسکتی ہے اور ایک "چائلڈ میرج پروینشن آفیسر" (CHILD MARRIAGE PREVENTION OFFICER) کے تقرر کا اہتمام کیا ہے۔ یہ آگے کی طرف ایک قدم ہے اور قانون کے بہتر نفاذ کو یقینی بنانے کے لیے ضروری ہے کہ چائلڈ میرج ریسٹرینٹ ایکٹ ۱۹۲۹ء کے تحت تمام جرائم کو قابلِ تعزیر و سماعت بنادینا چاہیے اور اس کی دفعات کے نفاذ کے لیے خصوصی افسروں کا تقرر کرنا چاہیے۔

"پارسی شادی و طلاق ایکٹ" ۱۸۶۵ میں یہ دفعہ رکھی گئی ہے کہ "پارسیوں کے درمیان کسی بھی شادی کو یا ایسی کسی بھی شادی سے متعلق یا اس سے پیدا ہونے والے کسی معاہدہ کو نافذ کرنے کے لیے کوئی بھی دعویٰ کسی عدالت میں نہیں لایا جائے گا اگر دعویٰ دائر کرنے کے وقت شوہر ۱۶ سال کی عمر مکمل نہ کرچکا ہو یا زوجہ ۱۴ سال کی عمر مکمل نہ کرچکی ہو"۔ اسی قسم کی ایک دفعہ سب فرقوں کے پرسنل لاء میں شامل کرنا ضروری ہے۔

شادی کا لازمی رجسٹریشن

سب شادیوں کا لازمی رجسٹریشن جس کی سفارش یو۔ این۔ آو نے کی ہے، کثرتِ ازدواج والی اور بچپن کی شادیوں کو روکنے کا ایک کارگر طریقہ ہوگا۔ شادیوں کا قابلِ اعتماد ثبوت پیش کرے گا اور بچوں کی جائز ولادت اور ان کے حقوقِ وراثت کا ضامن ہوگا۔ عیسائیوں اور پارسیوں میں شادی کا رجسٹریشن لازمی ہے اور ان شادیوں کا رجسٹریشن بھی لازمی ہے جو اسپیشل میرج ایکٹ ۱۹۵۴ کے تحت ہوئی ہوں۔ اس ایکٹ کی دفعہ ۱۵ جس میں دیگر قوانین کے تحت ہونے والی شادیوں کے رجسٹریشن کی بھی اجازت دی گئی ہے کوئی بڑا نتیجہ پیدا کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ تمام شادیوں کے لیے لازمی رجسٹریشن کا نظام رائج کیا جائے۔

جہیز | امتناع جہیز ایکٹ ۱۹۶۱ء (DOWRY PROHIBITION ACT) اپنے مقصد کے حصول میں بری طرح ناکام ہوا ہے۔ اس رواج کے تیز رفتار فروغ کے باوجود اس ایکٹ کے تحت چلائے جانے والے مقدمات کی تعداد انتہائی قلیل ہے۔ جہیز بل (DOWRY BILL) پر بحث کے دوران یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے قانون سازی سے زیادہ سماجی ضمیر کی بیداری ضروری ہے نیز یہ کہ عورتوں کے لیے روزگار کے بڑھتے ہوئے ذرائع اور دیگر مواقع کے ساتھ ساتھ اس برے رواج میں کمی ہو جائے گی۔ ان دونوں میں سے کسی بھی صورت حال کے پیدا ہونے کے کچھ آثار نہیں ہیں۔ سماجی ضمیر ابھی تک محو خواب ہے۔ جس کا ثبوت بہت سے وہ واقعات ہیں جو ہم سے بیان کیے گئے اور جن میں مناسب جہیز نہ لانے پر لڑکی کے ساتھ اس کے سسرال والوں یا شوہر نے بد سلوکی کی۔ سماجی ضمیر کے محو خواب ہونے کا ثبوت یہ حقیقت بھی ہے کہ جن لوگوں نے ہم سے ایسے واقعات بیان کیے ان میں سے کسی نے بھی پولیس کو طلب کرنے یا ایسے خاندانوں کی سماجی ملامت کرنے کی ضرورت کا تذکرہ نہیں کیا۔ تعلیم اس برائی کو روکنے میں غیر مؤثر ثابت ہوئی ہے کیونکہ تعلیم یافتہ نوجوان بے حیائی کے ساتھ برائی کے استحکام و دوام میں مدد کرتا نظر آتا ہے۔ موجودہ اقتصادی حالات سے بھی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عورتوں کے لیے روزگار کے بڑھتے ہوئے مواقع اور معاشی آزادی کا حصول ایک لمبی مدت کا عمل ہوگا۔ ان حالات میں اس قانون کے مقصد اور پالیسی کو نہایت سختی کے ساتھ نفاذ میں لانا قطعی ضروری ہو گیا ہے۔ اس لیے یہ خصوصی تدابیر تجویز کی جا رہی ہیں۔ (۱) اس جرم کو قابل سماعت و سزا بنا دینا (۲) اس کے نیز دیگر سماجی قوانین کے نفاذ کو ایک علیٰحدہ انتظامیہ کے سپرد کر دینا جو اپنے فعل و عمل میں سماجی کارکنوں اور فرقہ متعلقہ کے روشن خیال اراکین کے ساتھ تعلق و رابطہ قائم رکھے۔ (۳) اس ایکٹ میں دو ضمنی معاون دفعات اور شامل کرنا۔ جن کے ذریعہ دولہا یا اس کے والدین کو ایسے تحائف دینا ممنوع قرار دیا جائے جو پانچ سو روپے سے زیادہ کے ہوں یا جن کو اس طرح استعمال کیا جا سکتا ہو کہ ان کے ذریعہ دولہا خود اپنی مالی ذمہ داریوں مثلاً قرض وغیرہ کا بوجھ ہلکا کر سکے۔ نیز جہیز کی ایسی نمائش

کو قابلِ تعزیر قرار دیا جائے، جس سے اس رواج کو استحکام حاصل ہوتا ہو، اور اس کی حوصلہ افزائی ہوتی ہو (دوم)، جیسا کہ ماضی میں دو زوجگی والی شادیوں کے سلسلے میں کیا جاتا تھا۔ جہیز کے لین دین کو ایک جرم قرار دے کر سرکاری ملازمین کے طرزِ عمل کے قواعد و قوانین کے تحت سزائیں دینا۔ پانچ سال کے بعد اس ترمیم شدہ ایکٹ کے اثرات کا اندازہ لگانا چاہیے۔

طلاق ایک زوجگی کے اصول کے تحت ہونے والی شادی جس میں طلاق کا حق نہ ہو فریقین کے لیے بڑی مصیبت و صعوبت کا باعث ہوتی ہے۔ "اتحادِ تا حیات" کا تصور یا شادی کی ایک مقدس عہد و پیمان کی سی نوعیت جو اس کو ناقابلِ فسخ بنا دیتی ہے، یہ دونوں ہی چیزیں رفتہ رفتہ فرسودہ اور زنگ خوردہ ہو چکی ہیں اور طلاق کا حق ہندوستان کے تمام قانونی نظاموں میں داخل کر دیا گیا ہے۔ لیکن ان قوانین کی نمایاں خصوصیت ان کی بدلتی ہوئی حالتیں اور دونوں جنسوں کے ساتھ ان کا غیر مساویانہ سلوک ہے۔ ۱۹۷۱ کی مردم شماری کے مطابق مطلقہ یا شوہروں سے علیحدگی اختیار کرنے والی عورتوں کی تعداد ۲٫۰۷۰٫۰۰۰ ہے جن میں سے ۷۴۳٫۲۰۰ دیہی علاقوں میں اور ۱۲۷٫۵۰۰ شہری علاقوں میں اور ایک ہزار مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی نسبت ۱۴۳.۰ ہے۔

۱۹۶۱-۷۱ کے اعداد و شمار اس دس سالہ مدت میں طلاق شدہ اور علیحدگی اختیار کرنے والے افراد کی فی صد تعداد میں نمایاں کمی ظاہر کرتے ہیں۔ اگرچہ شہری اور دیہی دونوں قسم کے علاقوں میں مطلقہ عورتوں کا تناسب مردوں سے زیادہ تھا۔ ۱۹۶۱ میں ایک مردم شماری سے یہ ظاہر ہوا کہ دیہاتی لوگوں میں طلاق کے طریقے کو وسیع پیمانے پر قبول کیا گیا۔[*] طلاق کے واقعات کی سب سے زیادہ تعداد مسلمانوں سے متعلق تھی اور اس کے بعد ہندوؤں، بدھ مذہب کے ماننے والوں، جینیوں، سکھوں اور عیسائیوں میں۔ ان میں طلاق کے سب سے زیادہ اسباب بانجھ پن، بدکاری اور انتہائی مفلسی تھے۔

ہندو قانون ہندو شادیوں کے ناقابلِ فسخ ہونے کے متعلق جو عام تصور ہے اس کے برعکس نیچی ذاتوں میں طلاق کی ان رواجی صورتوں پر وسیع

---

[*] ہندوستان میں طلاق کی صورتِ حال سنہ ۱۹۶۱ء میں ہندوستان کی مردم شماری، جس کا گراف آخر میں ہے۔ نیز ۱۹۷۱ کی مردم شماری میں لیے گئے دیہی جائزے۔

طور سے عمل کیا گیا ہے۔ جن کو سماجی اور قانونی دونوں ہی طریقوں پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان میں سے سب سے زیادہ عام صورتیں یہ ہیں۔ فریقین کی باہمی رضا مندی کے ذریعہ طلاق۔ شوہر کے ذریعہ سے طلاق اور قانونی کارروائی کے ذریعہ طلاق — رواجی قانون کے تحت طلاق کے بعد دوسری شادی کے لیے کوئی انتظار کی مدت نہیں ہے۔ طلاق کی ان صورتوں کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ ان میں وقت اور پیسے دونوں کی بچت ہوتی ہے۔ جو کہ عام طور پر قانونی کارروائیوں میں ضائع ہو جاتے ہیں۔ لیکن چونکہ ان میں سے طلاق کی بعض شکلیں عوامی پالیسی یا اخلاقیات کے خلاف ہیں۔ اس لیے یہ ہو سکتا ہے کہ رواجی قانون کے تحت واقع ہونے والی ایک طلاق کو عدالت مسترد کر دے۔ یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ ان رواجوں کا ایک جائزہ اور مکمل ریکارڈ تیار کیا جائے اور سماجی قانونی ماہرین کی ایک جماعت یہ متعین کرنے کے لیے اس کا جائزہ لے کہ طلاق کی کونسی صورتیں ایسی ہیں، جن کو جائز قرار دینا چاہیے۔ اس ریکارڈ کی نقلیں لوگوں کو اور پنچایتوں کو فراہم کر دینا چاہیے۔

ہندو میرج ایکٹ ۱۹۵۵ دونوں فریقوں کو ان اسباب کی بنا پر طلاق کی اجازت دیتا ہے۔ (الف) حرامکاری کی زندگی (ب) مذہب کی تبدیلی (ج) دیوانگی ہو یا متعدی جذام یا کوڑھ (د) امراض خبیثہ (ہ) ترک دنیا (د) سات سال یا اس سے زیادہ عرصہ کے لیے غائب رہنا (ز) ایک قانونی علیحدگی کے عدالتی حکم دو سال بعد تک دوبارہ جنسی تعلقات قائم کرنے سے قاصر رہنا۔ (ح) حقوق زنا شوئی کو بحال کرنے سے متعلق ایک عدالتی حکم کی تعمیل سے قاصر رہنا۔ اس سلسلے میں زوجہ کو دو مزید اسباب دیے گئے ہیں۔ یعنی (الف) اگر شوہر شہوت پرست ہو یا ایک اور زندہ زوجہ رکھتا ہو اور (ب) اگر وہ عصمت دری، اغلام یا بہیمیت کا مرتکب ہوا ہو۔ یہ سفارش کی جاتی ہے کہ اس ایکٹ میں بیرحمی اور ترکِ رفاقت کو بھی طلاق کے اسباب کی فہرست میں شامل کر دینا چاہیے تاکہ اس چکردار راستے سے بچا جا سکے کہ پہلے عدالتی ذریعہ سے ایک قانونی علیحدگی حاصل کی جائے۔ اور پھر دو سال بعد طلاق حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔

ترکِ رفاقت یا حقوق زنا شوئی کی بحالی کے لیے "معقول وجہ" کی جو تشریح عدلیہ نے کی ہے۔ وہ اطمینان بخش نہیں ہے اور کچھ معاملات میں عورتوں کے ساتھ عدلیہ کا رویہ

تعلیم یا روزگار کے مساوی مواقع کے سلسلے میں مبہم رہا ہے۔ چونکہ عدالت نے یا تو شوہر کے اس اختیار و حاکمیت کی تائید و حمایت کی کہ اگر بیوی کی ملازمت ایسے مقام پر ہے جو خود اس کے کام کی جگہ سے دور ہے تو وہ بیوی کو اس ملازمت وغیرہ سے استعفا دینے پر مجبور کر سکتا ہے یا پھر بیوی کے اس اختیار و حق کو صرف اس صورت میں تسلیم کیا جبکہ حقیقی اقتصادی ضرورت موجود ہو، اس لیے یہ سفارش کی جاتی ہے کہ کام یا روزگار کی جگہ کے فرق کو ترک رفاقت یا حقوق زنا شوئی کی بحالی کے لیے ایک وجہ نہیں قرار دینا چاہیے۔

مسلم قانون طلاق مسلم لا کے تحت ایک شوہر اپنی مرضی سے شادی کو فسخ کرنے کا ایک مطلق اور غیر محدود اختیار رکھتا ہے۔ لیکن ایک مسلمان بیوی کو ایسا کوئی حق نہیں ہے۔ روایتی قانون (TRADITIONAL LAW) نے اس کو تین صورتوں سے فسخ شادی کے حصول کی اجازت دی تھی۔ (الف) طلاق ایسی صورت میں، جہاں شوہر معاہدہ شادی میں حق طلاق اپنی زوجہ کو تفویض کر دے اس شرط کے ساتھ کہ اگر وہ دوسری شادی کرلے تو وہ اس کو طلاق دے سکتی ہے۔ (ب) طلاق اس معاہدہ کے ساتھ کہ بیوی شوہر کو کچھ رعایتیں دیدے۔ (ج) فریقین کی باہمی رضامندی سے طلاق۔ مالکی اور شافعی مسلکوں کے پیش کردہ قانون سے فائدہ اٹھاتے ہوئے "مسلم شادیوں کے فسخ کا قانون" (DISSOLUTION OF MUSLIM MARRIAGES ACT) حسب ذیل حالات میں زوجہ کے حق طلاق کو تسلیم کرتا ہے:

(الف) چار سال تک شوہر غائب رہے۔

(ب) دو سال تک نان و نفقہ فراہم کرنے سے لاپرواہی کرے اور قاصر رہے۔

(ج) سات سال یا اس سے زیادہ عرصے تک شوہر قید میں رہے۔

(د) تین سال تک جنسی ذمہ داریاں پوری کرنے سے قاصر رہے۔

(ہ) نامرد ہو۔

(و) کسی جنسی بیماری، کوڑھ یا دیوانگی میں مبتلا ہو۔

(ز) سن بلوغ پر پہنچ کر شادی کو فسخ کرنے کے متعلق لڑکی کا حق۔

(ح) بیرحمی یا کوئی اور ایسا سبب جس کو مسلم لا میں طلاق لینے کے لیے جائز مانا

گیا ہو۔

اس ایکٹ سے بہت سی مسلمان عورتوں کو فائدہ ہوا ہے۔ جن اسباب کو طلاق کے لیے سب سے زیادہ استعمال میں لایا گیا وہ ہیں سن بلوغ پر فسخ شادی کا حق و اختیار اور نان و نفقہ دینے سے شوہر کا قاصر رہنا۔ آخر الذکر صورت حال میں بعض اوقات عدالتوں نے فسخ شادی کے حصول کا یہ حق زوجہ کو ایسی حالت میں نہیں دیا ہے جبکہ اس کا چال چلن اور طور طریقہ ایسا تھا جو نان و نفقہ دینے کی ذمہ داری سے شوہر کو بری کر دیتا تھا۔ لیکن ایسے حالات میں ایک زیادہ معقول نقطۂ نظر وہ ہے جو جسٹس کرشنا ائر نے اختیار کیا جنھوں نے کہا ہے کہ ایسی شادی کو قائم رکھنے کی کوشش میں کوئی خوبی کی بات نہیں۔ جو کہ فی الحقیقت ٹوٹ چکی ہے۔ لہذا یہ سفارش کی جاتی ہے کہ نان و نفقہ فراہم کرنے سے شوہر کے قاصر رہنے پر حق طلاق اس چیز کے لحاظ کے بغیر ہونا چاہیے کہ زوجہ کا چال چلن اور طور طریقہ کیسا ہے۔

ان سب حقوق کے باوجود جو ۱۹۳۹ کے ایکٹ سے عورت کو ملے ہیں اور جو رواجی صورتوں کے مطابق اسے حاصل ہیں، ایک مسلمان بیوی ایک قانونی کمتری و عدم تحفظ کی حالت میں مسلسل طور پر مبتلا ہے اس وقت تک جب تک شوہر کے یک طرفہ طلاق دینے کے حق کو تسلیم کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔ دوسرے مسلم ممالک پہلے ہی اس حق پر پابندی لگا چکے ہیں۔ یہ سفارش کی جاتی ہے کہ شوہر کے اس یک طرفہ حق طلاق کو ختم کرنے کے لیے اور حصول طلاق جن بنیادوں پر کیا جا سکتا ہے ان کے متعلق دونوں فرقوں کے واسطے مساوات حقوق پیدا کرنے کے لیے فوراً ہی آئین سازی کا کام شروع کرنا چاہیے۔ "ہندوستانی طلاق ایکٹ" ۱۹۶۹ (INDIAN DIVORCE ACT) جس کا اطلاق سب عیسائیوں پر ہوتا ہے، حصول طلاق کے سلسلے میں شوہر اور زوجہ کے حق میں امتیاز کرتا ہے۔ اگر بیوی نے بدکاری کی ہے تو شوہر طلاق حاصل کر سکتا ہے۔ بیوی کو طلاق حاصل کرنے کے لیے شوہر کی بدکاری کے علاوہ اس پر کوئی اور جرم بھی ثابت کرنا پڑتا ہے (مثلاً محرمات کے ساتھ مباشرت، دو زوجگی بیرحمی، ترک رفاقت)۔ لاء کمیشن نے ۱۹۶۰ میں "اسپیشل میریج ایکٹ ۱۹۵۹" کے خطوط پر ایک بل اس قانون کی اصلاح کی غرض سے تیار کیا تھا۔ بہت افسوس

ہے کہ حکومت اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے سے قاصر رہی اور یہ سفارش کی جاتی ہے کہ لاء کمیشن کے تجویز کردہ خطوط پر ہندوستانی طلاق ایکٹ ۱۸۶۹ (INDIAN DIVORCE ACT) کی اصلاح کرنے کے لیے فوری قدم اٹھانا چاہیے۔

۴۔ پارسی قانون پارسی شادی اور طلاق ایکٹ ۱۹۳۶ (PARSEE MARRIAGE AND DIVORCE ACT) طلاق کی عام شرطوں کے علاوہ بیوی کو حصول طلاق کا ایک مزید حق دیتا ہے اگر اس کے شوہر نے اس کو عصمت فروشی پر مجبور کیا ہو۔ یہ سفارش کی جاتی ہے کہ اس شرط کو دوسرے سب پرسنل لاز میں بھی شامل کرلیا جائے۔

۵۔ یہودی قانون (یہودی لاء) یہودی لوگ قانون ساز اداروں کے تحریری قانون کے ماتحت نہیں ہیں لیکن وہ بدکاری اور بے رحمی کی بناء پر عدالتوں سے طلاق لے سکتے ہیں بعض مخصوص حالات کو چھوڑ کر یہودیوں میں یک زوجگی کا رواج ہے۔ یہ ضروری ہے کہ اس معاملہ کے متعلق یہودی قانون کی تدوین اور اصلاح کی جائے۔ اور اس میں یک زوجگی کے اصول اور ان امور کو شامل کیا جائے جن کو اسپیشل میرج ایکٹ ۱۹۵۴ میں عام طور پر طلاق کی بنیادیں اور شرائط قرار دیا گیا ہے۔

۶۔ اسپیشل میرج ایکٹ ۱۹۵۴ اس سیکولر قسم کی شادی میں دونوں میں سے کوئی بھی فریق ان اسباب کی بنا پر طلاق لے سکتا ہے۔ حرامکاری، تین سال تک ترک رفاقت، بے رحمی، غیر صحت مند دماغ۔ کوڑھ، جنسی بیماری سات سال تک مسلسل عدم موجودگی، عدالتی د قانونی علیٰحدگی یا حقوق زناشوئی کی بحالی کے ایک عدالتی حکم کے بعد ایک سال تک جنسی تعلق کا دوبارہ شروع ہونا۔ مزید برآں عصمت دری اغلام یا بہیمیت کی بنیادوں پر بھی زوجہ طلاق حاصل کرسکتی ہے۔ اس ایکٹ کی ایک اہم خصوصیت فریقین کی باہمی رضامندی سے طلاق ہے۔ یہ سفارش کی جاتی ہے کہ فریقین کی رضامندی کو سب فرقوں کے پرسنل لاء میں طلاق کی ایک بنیاد کے طور پر تسلیم کیا جانا چاہیے۔ تاکہ وہ بالغ افراد جن کی شادی فی الحقیقت ٹوٹ چکی ہو اسکو باعزت طور پر فسخ کرسکیں۔

طلاق کے سارے قوانین کی اصلاح کے لیے دو عام اصول اختیار کرنے چاہییں۔

(۱) جہاں تک طلاق کے لیے بنیادوں اور شرطوں کا تعلق ہے دونوں فریقوں کے لیے مساوات حقوق ہونا چاہیے اور (۲) تبدیلی مذہب کو طلاق کی ایک بنیاد اور سبب کے طور پر تسلیم نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ یہ چیز ازدواجی ذمہ داریوں سے بچنے کا ایک آسان طریقہ پیش کرتی ہے۔

iii بچوں کی تبنیت اور سرپرستی

ہندوستان میں واحد پرسنل لا، جو صحیح معنی میں بچوں کی تبنیت کو تسلیم کرتا ہے ہندو قانون ہے اس کے نزدیک تبنیت کا مفہوم ہے "ایک قائم مقام یا بدل کے طور پر ایک متبنیٰ بیٹا بنانا اس حالت میں جبکہ کوئی اولاد نرینہ موجود نہ ہو" ہندو ایڈاپشن اینڈ منٹیننس (HINDU ADOPTION AND MAINTENANCE LAW) نے اس سلسلے میں سابق قانون سے صاف طور پر تین طرح سے انحراف کیا:

(الف) اس نے اس کی اجازت دی کہ لڑکے یا لڑکی دونوں میں سے کسی کو بھی متبنیٰ کیا جا سکتا ہے۔

(ب) اس نے متبنیٰ کرنے کے سلسلے میں بچے کو دینے یا لینے کے لیے زوجہ کی رضی پر اصرار کیا۔

(ت) اس نے عورت کو غیر شادی شدہ، بیوی اور مطلقہ ہونے کی صورت میں متبنیٰ کرنے کا حق عطا کیا۔

شادی شدہ عورت صرف اس وقت کسی بچے کو متبنیٰ کر سکتی ہے جبکہ اس کا شوہر تارک الدنیا ہو گیا ہے۔ دیوانہ ہو گیا ہو یا اب ہندو نہیں رہا ہے۔ اگرچہ اس ایکٹ نے اس سلسلہ میں عورت کی حیثیت کو یقیناً بہتر بنا دیا ہے تاہم اس کی ضرورت ہے کہ اس کو مزید بہتر بنایا جائے اور ایکٹ میں یہ دفعہ شامل کی جائے کہ زوجین میں سے ہر زوج کو دوسرے کی رضا مندی سے متبنیٰ کرنے کے مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔ اس نقطہ نظر سے ہم "اڈاپشن آف چلڈرن بل ۱۹۷۲" کا ایک یکساں اور نا مذہبی قانون کی حیثیت سے خیر مقدم کرتے ہیں جس سے پورے فرقے کو فائدہ پہنچے گا اور اس کو جلد ہی قانون بنا دینے کی سفارش کرتے ہیں۔ اگرچہ معاصرانہ ذہن و فکر سرپرستی کے متعلق والدین کے حقوق (جن کو پہلے پدرانہ حقوق کے مترادف سمجھا جاتا تھا) اور بچوں کے

مفاد و فلاح کے درمیان ایک امتیاز کرتا ہے اور اوّل الذکر کو آخر الذکر سے کم تر قرار دیتا ہے تاہم ہمارے قوانین میں صاف طور پر اس رجحان کا عکس نظر نہیں آتا۔

۱۔ ہندو قانون | ہندو مائنارٹی اور گارجین شپ ایکٹ ۱۹۵۶ اس سلسلے میں باپ کے برتر حق کی حمایت کرتا ہے اور لڑکوں اور غیر شادی شدہ لڑکیوں کے لیے باپ کو پہلا فطری سرپرست قرار دیتا ہے (ماں کی حیثیت ثانوی ہے) لیکن باپ کو پہلے جو یہ حق حاصل تھا کہ وصیت کے ذریعہ ایک سرپرست مقرر کرکے ماں کو سرپرستی کے حق سے محروم کر سکتا تھا اپنے اس سابقہ حق سے اب وہ محروم ہو چکا ہے۔ ماں کا حق اوّلیت "معمولی طور پر" صرف پانچ سال سے کم عمر کے بچوں کی تحویل تک تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کو ناجائز بچوں کے معاملہ میں بھی باپ سے زیادہ حق حاصل ہے۔ یہ ایکٹ اس بات کی بھی ہدایت کرتا ہے کہ سرپرستی کے مسئلے کا فیصلہ کرنے میں عدالتوں کو لازم ہے کہ سب سے بڑا لحاظ "بچے کی فلاح" کا رکھیں۔ سپریم کورٹ نے اپنے ایک حالیہ فیصلہ میں کہا گیا کہ خصوصی حالات میں ماں فطری سرپرست بن سکتی ہے اس وقت بھی جبکہ باپ زندہ ہو۔ امید ہے کہ یہ فیصلہ زیریں عدالتوں کی رہنمائی کرے گا اور ان کو اس امر سے باز رکھے گا کہ ناقابل تغیر اور مستقل طور پر باپ کے حق کی حمایت کرتی رہیں خواہ یہ چیز بچے کے مفاد کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

۲۔ مسلم قانون | ایک مسلمان باپ کی حیثیت غالب و حاکمانہ ہے اور سرپرستی کے متعلق اس کے حقوق بہت وسیع ہیں۔ ماں کو باپ کی موت کے بعد بھی بچوں کا قدرتی سرپرست نہیں تسلیم کیا جاتا ہے۔ خواہ اس کو باپ کی وصیت میں فطری سرپرست مقرر کر دیا گیا ہو (شیعہ فرقہ کے لوگ اس چیز کو ایسی حالت میں تسلیم نہیں کرتے جبکہ ماں ایک غیر مسلم ہو) لیکن مسلم لا نابالغ بچوں کی تحویل پر اس کا پہلا حق تسلیم کرتا ہے اور اس حق سے اسے بچوں کا باپ بھی بدچلنی کے علاوہ اور کسی حال میں محروم نہیں کر سکتا۔ شیعہ اور حنفی مسلکوں میں اس عمر کے متعلق اختلاف ہے۔ جبکہ تحویل نگرانی کا مادرانہ حق ختم ہو جاتا ہے۔ ایک نابالغ بیٹے کے معاملہ میں شیعہ مسلک یہ مانتا ہے کہ ماں کا حق صرف اس مدت کے دوران رہتا ہے۔ جبکہ وہ دودھ پیتا ہو۔ یعنی دو سال کی عمر تک۔ حنفی فقہ میں یہ مدت عمر بڑھا کر سات سال کی عمر تک کر دی گئی

ہے۔ نابالغ لڑکیوں کے معاملہ میں شیعہ مسلک ماں کے حق کی حمایت اس وقت تک کرتا ہے جبکہ لڑکی سات سال کی عمر کو پہنچ جائے اور حنفی مسلک سن بلوغ حاصل کرنے تک۔ دونوں مسلک اس بات پر متفق ہیں کہ ایک نابالغ شادی شدہ لڑکی صرف ماں کی ہی تحویل و نگرانی میں رہنی چاہیے، جب تک کہ وہ بالغ نہ ہو جائے۔

۳۔ گارجین اور وارڈس ایکٹ ۱۸۹۰ یہ اس قانون کے تحت جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے علاوہ سب فرقوں پر عائد ہے۔ بچوں کی سرپرستی سے متعلق پہلا حق باپ کا ہے اور کوئی دوسرا سرپرست مقرر نہیں ہو سکتا جب تک باپ نا قابل و معذور نہ ہو۔ نابالغ بچوں کی سرپرستی۔ ان کے والدین کی حاکمیت کا عمل اور طلاق یا زن و شوہر کی علیحدگی کی صورت میں بچوں کی تحویل کے متعلق باپ اور ماں کے درمیان عدم امتیاز۔ ان سب امور کے سلسلے میں مردوں اور عورتوں کے حقوق و فرائض کے متعلق جو سفارشات اس یو این کمیشن نے پیش کی ہیں، جو کہ "عورتوں کی حیثیت" کے متعلق مقرر کیا گیا تھا۔ ان کی تائید و حمایت کرتے ہوئے ہم سفارش کرتے ہیں کہ:

۱۔ ایک نابالغ بچے کی ذات اور جائیداد کے کنٹرول کو الگ نہیں کیا جا سکتا اور یہ کنٹرول ایک ہی فرد کو تفویض ہونا چاہیے۔

۲۔ سرپرستی کے مسئلہ کا فیصلہ کلی طور پر بچے کی فلاح کے نقطۂ نظر سے ہونا چاہیے نہ کہ ماں یا باپ کے اوّل حق کی بنیاد پر۔

۳۔ ماں اور باپ میں سے جس کو سرپرستی حاصل نہیں ہے اس کو بچے تک رسائی حاصل ہونا چاہیے۔

۴۔ خواہ پہلے کچھ بھی فیصلہ کیا جا چکا ہو، یہ ضروری ہے کہ جب بچہ ۱۴ سال کی عمر کو پہنچے تو اپنے سرپرست کے انتخاب کے لیے بچہ کی پسند دریافت کی جائے۔

۴۔ گزارہ (MAINTENANCE)

۱۔ قانون فوجداری ۱۹۷۳ کا نیا (CRIMINAL PROCEDURE CODE) حسب سابق عورتوں کے ساتھ پرانے رویہ کا عکاس ہے اور مطلقہ بیویوں اور مفلس والدین کو گزارہ

کا مطالبہ کرنے کا حق عطا کرتا ہے یہ ذمہ داری صرف مردوں پر رکھی گئی ہے۔ لیکن بدلتی ہوئی سماجی صورتِ حال میں جبکہ بہت سی عورتیں اقتصادی طور پر آزاد و غیر محتاج ہیں یہ بات غیر معقول ہے اس مقصد کے پیشِ نظر کہ شوہر اور زوجہ اور بیٹے اور بیٹی کے درمیان حیثیت میں مساوات حاصل ہو سکے۔ ہم اس قانون میں ایک ایسی ترمیم کی سفارش کرتے ہیں۔ جس کے تحت اقتصادی طور پر آزاد و غیر محتاج عورت کو اس بات پر مجبور کیا جائے کہ وہ اپنے دست تنگ و محتاج شوہر کی کفالت کرے۔ بچوں کی کفالت کے فرض میں اس کا ہاتھ بٹائے اور اپنے بھائیوں کے ساتھ مل کر غریب ماں باپ کی کفالت کے فرض کی ادائیگی میں حصہ لے۔ ہم اس کی بھی سفارش کرتے ہیں کہ گزارے کے لیے پانچ سو روپے کی رقم کی جو زیادہ سے زیادہ حد مقرر کی گئی ہے اس کو ہٹا لیا جائے موجودہ صورت میں قانون میں جو استثنا ہے کہ ان مطلقہ عورتوں کو گزارے کی رقم نہیں ملے گی جن کو "رواجی پرسنل لا" کے تحت واجب ادائیگی کچھ رقم موصول ہو چکی ہے اس کے باعث وہ مسلمان عورتیں اس قانون کے دائرے سے خارج ہو جاتی ہیں جو مطلقہ ہیں۔ اس غیر منصفانہ استثنا کو ختم کر دینا ضروری ہے۔

۲۔ **ہندو قانون** | قانونِ فوجداری (CRIMINAL LAW) کے برخلاف جس میں گزارے کے لیے عورت کا مطالبہ اس بات پر منحصر ہے کہ شوہر کے معاشی وسائل کافی ہوں۔ ہندو لا کے تحت یہ حق مطلق و غیر مشروط ہے اور اس وقت ساقط ہوتا ہے جب زوجہ پاک دامن نہیں رہتی۔ گزارے کی رقم مقرر کرتے وقت عدالت فریقین کی پوزیشن اور حیثیت، زوجہ کی معقول حاجتوں اور شوہر کی ذمے داریوں کو ملحوظ رکھتی ہے۔ وہ زوجہ کے الگ رہنے کے جواز کا بھی اندازہ لگاتی ہے۔ یہ ایکٹ گزارہ و کفالت کی ذمہ داری کو صرف مرد تک محدود بھی نہیں کرتا ہے۔

۳۔ **مسلم قانون** | اگرچہ زوجہ کو گزارہ دینا مسلم لا میں شوہر کی سب سے بڑی ذمہ داری ہے لیکن یہ ضروری ہے کہ زوجہ اپنے شوہر کے لیے قابلِ رسائی ہو اور اس کے معقول احکام کی تعمیل کرے۔ مطلقہ مسلمان عورت کو تین مہینے سے زیادہ شوہر سے گزارہ لینے کا حق نہیں ہے۔ اس امتیاز کا کوئی جواز نہیں ہے اور ہم یہ سفارش کرتے ہیں کہ گزارے کا حق مطلقہ مسلمان بیویوں تک وسیع کر دینا

چاہیے۔

۴۔ پارسی اور عیسائی

عیسائیوں اور پارسیوں کے لیے گزارے کے حقوق یکساں ہیں۔ دونوں ہی یہ حق صرف عورت کو دیتے ہیں۔ گزارے کی رقم کے تعین میں عدالت شوہر کی استطاعت اور بیوی کی اپنی املاک اور فریقین کے طور طریقہ اور چال چلن کو ذہن میں رکھتی ہیں۔ "ہندوستانی طلاق ایکٹ ۱۸۶۹ ۔۔۔۔
(INDIAN DIVORCE ACT) جو عیسائیوں پر نافذ ہوتا ہے۔ عدالت کو یہ اختیار تمیزی دیتا ہے کہ اگر بیوی کی حرامکاری کے سبب سے شوہر نے طلاق حاصل کی ہے تو شوہر یا بچوں کے فائدے کو مدِنظر رکھتے ہوئے بیوی کی جائداد کے بندوبست کا حکم جاری کرے۔ اگر بیوی کے ساتھ حرامکاری کرنے والے مرد کے خلاف عدالت نے یہ حکم دیا ہے کہ وہ شوہر کو ہرجہ ادا کرے تو عدالت بچوں کے فائدے یا بیوی کے گزارہ کے لیے اس پوری رقم کا یا اس کے کچھ حصے کا بندوبست کرنے کا حکم دے سکتی ہے۔

گزارے کی عدم ادائیگی سے پیدا ہونے والے مصائب کو کم سے کم کرنے کے لیے اور یقینی ادائیگی کا پختہ انتظام کرنے کے لیے ہم یہ سفارش کرتے ہیں کہ گزارے کی تمام رقوم کو تنخواہوں اجرتوں وغیرہ میں سے آجر وضع کرے جیسا کہ انکم ٹیکس کے سلسلے میں ہوتا ہے۔ جہاں یہ ممکن نہ ہو وہاں گزارے کی واجب الادا بقایا یا تو زمین کی مالگزاری کی بقایا کی طرح وصول کی جائے یا بذریعۂ جرمانہ وصول کی جائے۔ جس طرح "ضابطۂ قانون فوجداری (CRIMINAL PROCEDURE CODE) کے تحت جرمانے وصول کیے جاتے ہیں۔

اس کا بہترین حل یہ ہے کہ گزارے کا تمام مسئلہ خاندانی عدالتوں جیسی مخصوص عدالتوں کے سپرد کر دیا جائے جو کہ اس نوعیت کے معاملات کو طے کرنے میں اس چیز کا لحاظ رکھ سکتی ہیں کہ زوجین کی آمدنیاں کتنی ہیں اور کس درجہ تک مالی طور پر دوسروں کے محتاج ہیں۔

۵۔ وراثت

(INDIAN SUCCESSION ACT 1925) جو عیسائیوں، یہودیوں، پارسیوں پر اور ان لوگوں پر عائد ہوتا ہے جنہوں نے اسپیشل میرج ایکٹ کے تحت شادی کی ہے۔ کسی فرد کے اس اختیار پر کوئی پابندی نہیں لگاتا کہ وہ وصیت کے ذریعہ اپنی جائداد

کسی کو بھی دیدے اور ایک مسلمان بیوہ کو جائداد کا ایک حصّہ پانے اور ایک ہندو بیوہ کو گزارہ حاصل کرنے کا جو تحفظ حاصل ہے اس سے دوسری بیواؤں کو اس قانون کے تحت محروم کردیا گیا ہے۔ مناسب یہ ہے کہ اپنی جائداد وصیت کے ذریعہ کسی کو دینے کے حق پر کچھ اسی طرح کی پابندی لگادی جائے جیسی مسلم لا کے تحت عام ہے تاکہ بیوہ کو بالکل ہی بے سہارا اور مفلس چھوڑ دیے جانے کے طریقہ کو روکا جاسکے۔

ترمیم شدہ قانون یہ متعین کرتا ہے کہ ایسی حالتوں میں جہاں جانشینی کے متعلق متوفی شوہر کی کوئی وصیت نہیں ہے۔ لاولد بیوہ پوری جائداد کی حقدار ہے۔ اگر اس کی مالیت پانچ ہزار سے زیادہ نہیں ہے اور اگر مالیت اس رقم سے زیادہ ہے، تو پانچ ہزار روپیہ یا اس قیمت کی جائداد کی حقدار ہے اس قانونی دفعہ کا دائرۂ عمل ہندوستانی عیسائیوں اور ہندوؤں۔ بدھ مذہب کے ماننے والوں یا جینیوں تک وسیع نہیں کیا گیا ہے۔ جن کی جائداد کے متعلق جانشینی کا معاملہ بھی اسی قانون کے تحت طے ہوتا ہے۔ چونکہ یہ دفعہ لاولد بیواؤں کو حقوق دیتی ہے اس لیے ان فرقوں کو اس سے محروم رکھنے کے لیے کوئی جواز پیش نہیں کیا جاسکتا۔

۲۔ کیرالہ کے عیسائی۔ کیرالہ کے عیسائیوں پر "ٹراونکور کرسچین سکسیشن ایکٹ ۱۹۱۶ اور کوچین کرسچین، ایکٹ ۱۹۲۱" کا اطلاق ہوتا ہے۔ قانونی گوناگونی کی الجھن پیدا کرنے کے علاوہ یہ قوانین ورثہ میں جائداد غیر منقولہ پانے والی بیوہ یا ماں کو حین حیاتی حق ہی دیتے ہیں جو کہ موت پر یا دوسری شادی پر ختم ہو جاتا ہے۔ بیٹی کا حق صرف "استری دھنم" (STRIDHANAM) تک ہی محدود ہے۔ ان حالتوں میں بھی جبکہ وہ حقدار ہوتی ہے۔ اس کو نسبتاً بہت تھوڑا سا حصّہ ملتا ہے۔ ہم سفارش کرتے ہیں کہ فوری طور پر ایسا قانون بنایا جائے جس سے کیرالہ کی عیسائی عورتیں بھی (INDIAN SUCCESSION ACT 1925) کے تحت آجائیں۔

۳۔ پانڈیچری اور گوا کے عیسائی۔ گوا میں بیوہ کو چوتھے درجہ پر رکھا گیا ہے اور وہ صرف پھلوں اور زرعی اجناس کی حقدار ہوتی ہے۔ پانڈیچری میں جو قوانین نافذ ہیں وہ ایک عورت کو اس سے کم درجہ دیتے ہیں اور ان چند حالتوں میں بھی اس کو پورا مالک قرار نہیں دیتے جبکہ وہ جائداد ورثے

میں پا سکتی ہے۔ ہم یہ سفارش کرتے ہیں کہ ان علاقوں تک ١٩٢٥ کے "انڈین سکسیشن ایکٹ" کے نفاذ کی توسیع کی جائے۔

۴۔ پارسی قانون

پارسیوں میں وصیت کے بغیر جانشینی کے سلسلے میں ان مردوں اور عورتوں کی جائداد سے متعلق قواعد توارث مختلف ہیں جو اپنے بعد کوئی وصیت نہیں چھوڑتے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ماؤں اور بیٹیوں کے خلاف امتیاز برتا جاتا ہے۔ ماں کی جائداد میں بیٹے کا حق بیٹی کے برابر ہوتا ہے۔ لیکن باپ کی جائداد میں یہی حق بیٹی کو حاصل نہیں ہے ایسے میں امتیاز کا کوئی جواز نہیں ہے۔

۵۔ ہندو قانون

آزادی سے پہلے ہندوستان میں جانشینی کے کئی نظام رائج تھے۔ جن میں سے بیشتر میں عورت کی حیثیت دست نگر کی تھی اور اس کو مشکل سے ہی کسی طرح کے مالکانہ حقوق حاصل تھے۔ جہاں ان کو کچھ حقوق حاصل بھی تھے۔ وہاں وہ محض ایک حین حیاتی حق رکھتی تھی نہ کہ پورا حق ملکیت (HINDU SUCCESSION ACT 1956) نے اس سلسلے میں کچھ بنیادی تبدیلیاں کیں جن میں سب سے زیادہ اہم یہ تھی کہ ورثاء کے ایک ہی زمرے کے افراد ذکور و اناث (بھائی اور بہن۔ بیٹا اور بیٹی) کے حقوق جانشینی مساوی ہو گئے۔ اس نے ان مختلف نظاموں کو ختم کر کے جو (MITAKSHA) اور "دیا بھاگ" کے تحت رائج تھے قانون کو سادہ بھی بنا دیا اور جنوبی ہندوستان کے ان لوگوں تک اصلاح شدہ قانون کو وسیع کر دیا جو پہلے مارمک کٹایم (MARUMMAKKTTIEYM) کے تابع تھا۔ اس کی سب سے بڑی ترقی پسندانہ خصوصیت یہ ہے کہ اس نے ورثہ پانے کے سلسلے میں عورتوں کے حق کو تسلیم کیا اور عورت وارثوں کی حین حیاتی جائداد (وہ جائداد جس پر زندگی بھر قبضہ تو ہو مگر اس کو منتقل نہ کیا جا سکے) کو ختم کر دیا۔ ایک مرد کے درجۂ اول کے ورثاء جن کو قطعی مالکان کی حیثیت سے جائداد میں برابر حصہ ملتا ہے وہ ہیں بیوہ۔ ماں۔ بیٹا۔ بیٹی۔ اس بیٹے کی بیوہ جو باپ کی زندگی میں فوت ہو گیا ہو اور ان بیٹوں اور بیٹیوں کے بیٹے اور بیٹیاں جن کا انتقال باپ کی زندگی میں ہو گیا ہو۔

بدقسمتی سے روایتی مزاحمت کے نتیجہ میں اس قانون کی اصل نیت و غایت کے مسئلہ پر کچھ سمجھوتے کر لیے گئے۔ مثلاً بیٹے اور بیٹی کے درمیان جاری رہنے والی عدم مساوات

کے۔ یہ ایک بڑا ذمّہ دار عنصر "متاکشرا" نظام کی مشترکہ وراثت ہے جس کی رکنیت صرف مردوں تک محدود ہے۔ متعدد فیصلے اور قوانین جیسے "ہندو خواتین کا حق جائداد ایکٹ (HINDU WOMEN'S PROPERTY ACT) اور ہندو وراثت ایکٹ HINDU SUCCESSION ACT) مشترکہ وراثت کے تصور پر یورشیں کر چکے ہیں۔ سلیکٹ کمیٹی (SELECT COMMITTEE) کی ترمیمات کے بعد "ہندو کوڈ بل ۱۹۴۸" نے فی الحقیقت مشترکہ وراثت یعنی مرد کے پیدائشی حق کو ختم کر دینے کی تجویز پیش کی تھی۔ لیکن روایتی مزاحمت حد سے زیادہ طاقتور ثابت ہوئی۔ وہ اس مسئلے پر ہونے والا سمجھوتہ جو کہ اب قانون میں شامل ہے اس بات کو یقینی اور پختہ بناتا ہے کہ جو عورتیں مشترک ورثہ کے ایک مرد رکن کی وارث ہوں۔ ان کو اس کی جائداد کا ایک حصّہ ملے جس کا تعین جائداد کی ایک نظری و خیالی تقسیم کے ذریعہ کیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بیٹوں کو مشترکہ وراثت کے اراکین کی حیثیت سے خود اپنا جو حق حاصل ہوتا ہے اس کے علاوہ باپ کی جائداد کا مزید ایک حصّہ ملتا ہے: "دیابھاگ" (DAYABHAGE) نظام کے تحت بیٹوں کے ساتھ بیٹیوں کو برابر کا حصّہ ملتا ہے۔ بیٹوں کا حق پیدائشی نہیں ہے۔ مشترکہ وراثت کے رکن کو حاصل ہے۔ جس کو اکثر ایک عورت وارث کے حصّہ کو ختم کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لیے ہم یہ سفارش کرتے ہیں کہ مرد کے پیدائشی حق کو ختم کیا جائے اور "متاکشر" (MITAKSHARA) نظام والی مشترکہ وراثت کو "دیا بھاگ" والی مشترکہ وراثت میں تبدیل کر دیا جائے۔

"ہندو وراثت ایکٹ ۱۹۵۶ (HINDU SUCCESSION ACT) کی دفعہ ۴ ریاست کے قوانین کے تحت زیر قبضہ زرعی زمینوں پر لگان داروں کے حقوق کی وراثت کو اس ایکٹ کے احاطے سے خارج کرتی ہے۔ اس کے نتیجہ میں بہت سی ریاستوں میں زمین سے متعلق قوانین کے تحت ہندو سکسیشن ایکٹ کے جو فائدہ مند اثرات ہو سکتے تھے وہ نہیں ہوئے۔ کچھ ریاستیں ایسی بھی ہیں، جہاں میعادی حق ملکیت کے بطور ورثہ منتقل ہونے کے لیے مخصوص قانونی دفعات موجود نہیں۔ لیکن بعض ریاستوں میں غالب قدامت پرست گروہوں نے ایسے قوانین کے لیے کوئی بھی خاص معاشی جواز پیش کیے بغیر بیواؤں اور بیٹیوں کو کامیابی کے ساتھ خارج کر دیا ہے۔

اس کی ایک مخصوص مثال ہے "اتر پردیش زمینداری ابالیشن اور لینڈ ریفارم ایکٹ ۱۹۵۰
(ZAMINDARI ABOLITION AND LAND REFORM ACT ہے جس کا اطلاق مقررہ
وقت میں تمام زرعی آراضی پر ہونے کو ہے۔ مختلف ریاستوں میں بھی امتیازی خصوصیات
زمین کی زیادہ سے زیادہ حد کے متعلق قوانین میں نظر آتی ہیں۔ مثلاً کرناٹک، پنجاب
یا مدھیہ پردیش میں۔ قانون میں یکسانیت پیدا کرنے اور اسی کے ساتھ عورتوں کی
سماجی مساوات کے حصول کے لیے ہم یہ سفارش کرتے ہیں کہ ہندو سکسیشن ایکٹ کی
دفعہ (۲) ۴ کو ختم کر دیا جائے۔

ہندو سکسیشن ایکٹ ۱۹۵۶ کی دفعہ ۲۳ کا نتیجہ بھی جس کا تعلق ایک رہائشی گھر
کی وراثت سے ہے۔ غیر شادی شدہ، بیوہ اور شادی شدہ بیٹیوں کے درمیان
کچھ امتیاز کی صورت میں نمودار ہوا ہے۔ اس دفعہ کے اصلی مقصد کی حمایت کرنے کے
باوجود جو فرد کے حق کے خلاف خاندان کے حق کی فوقیت پر زور دیتا ہے اور بٹوارے
پر پابندی لگاتی ہے۔ ہمیں شادی شدہ اور دیگر بیٹیوں کے درمیان یہ غیر منصفانہ
امتیاز اچھا معلوم نہیں ہوتا کیونکہ حق رہائش صرف ان بیٹیوں تک محدود کر دیا گیا
ہے جو غیر شادی شدہ یا بیوہ ہیں اور جن کو ان کے شوہر چھوڑ کر چلے گئے ہیں
یا شوہروں سے علیحدگی ہو گئی ہے۔ اس لیے ہم اس امتیاز کو دور کرنے کی سفارش
کرتے ہیں۔ تاکہ سب بیٹیوں کو ایک ہی سے حقوق حاصل ہوں۔

وصیت کرنے کے غیر محدود حق کا نتیجہ اکثر وارث عورتوں کو حقوق وراثت سے
محروم کر دیے جانے کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ اس لیے ہم ہندو سکسیشن ایکٹ
۱۹۵۶ کے تحت اس حق کو محدود کرنے کی سفارش کرتے ہیں

۶۔ مسلم قانون | اگرچہ مسلم لاء ورثہ میں عورتوں کا حق تسلیم کرتا ہے تاہم ایک ہی درجہ
کے ورثاء میں مردوں اور عورتوں میں امتیاز کرتا ہے اور آخر الذکر
کا حصہ اول الذکر کے حصے کے مقابلے میں نصف ہوتا ہے۔ ہم ایک ایسے قانون بنانے
کی سفارش کرتے ہیں، جس میں بیوہ اور بیٹی کو بھی بیٹوں کے برابر حصہ ملے جیسا کہ
ترکی میں کیا گیا ہے۔

۷۔ عمومی | تحقیق کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ نہ صرف مختلف فرقوں کی بلکہ

ایک ہی فرقہ کی بھی وارث عورتوں کے حقوق وراثت کے متعلق جو قوانین کی مجموعہ کتب
موجود ہے اس میں ایک فوری اصلاح کی ضرورت ہے۔ جو ایسے وسیع اصولوں پر مبنی ہو
جیسے بیٹوں اور بیٹیوں اور بیواؤں کے مساوی حقوق اور حقِ وصیت پر پابندی ہمیں
ایسی بہت سی عورتوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ جو اپنی وراثت کے حقوق سے ناواقف
تھیں اور ان کی کیفیت ایسی ہو گئی تھی کہ انھوں نے اس چیز کے تصور ہی کی مخالفت
کی کہ بہنیں اپنے بھائیوں کو جائداد سے محروم کریں۔ اس لیے مجموعہ اور عام قانون کا مقصد
ہی فوت ہو جائے گا اگر اس کی دفعات کی مناسب اشاعت نہ کی جائے اور عورتوں
کو ان کے حقوق سے واقف نہ کرایا جائے۔ سماجی تحفظ اور روزگار کے کافی مواقع
نہ ہونے کی صورت میں جائداد میں حقوق وراثت' مالی تحفظ فراہم کرتے ہیں اور
عورتوں کو محتاجی و مفلسی میں مبتلا ہونے سے بچاتے ہیں۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ جائداد
کے حقوق سے عورتوں کی ایک محدود تعداد کو فائدہ ہوگا۔ لیکن اس میں بھی کوئی
شک نہیں ہے کہ یہ حقوق عورتوں کو غیر دست نگر اور محتاج بنا دیں گے اور اپنی
حیثیت کو بہتر بنانے میں ان کی مدد کریں گے اور اس احساس پر مؤثر طور پر روک لگا
دیں گے کہ عورتیں خاندان کے لیے ایک بوجھ ہیں۔

۶۔ ازدواجی جائداد

ملک کی موجودہ سماجی معاشی صورتِ حال میں خاندان کی معیشت میں زوجہ جو
حصہ لیتی ہے اس کو تسلیم نہیں کیا جاتا ان میں سے ایک بڑی تعداد روزی کمانے میں
خاندان کی کوششوں میں شریک ہوتی ہے اور ان حالات میں بھی جب کہ وہ ایسا نہیں
کرتیں ان کی اس جدوجہد کو جو وہ گھر چلانے، سب گھریلو ذمہ داریوں کو اپنے سر لینے
اور شوہر کو اس کے کسبِ معاش کے مشغلہ کے لیے آزاد کر دینے کے سلسلے میں کرتی
ہیں۔ قانون میں بلا واسطہ یا بالواسطہ تسلیم نہیں کیا جاتا۔ وہ شادی شدہ عورتیں جن
کا اپنا کوئی الگ ذریعہ آمدنی نہیں ہے یا جو شادی کے بعد اپنا سارا وقت خانگی
ذمہ داریوں پر صرف کرنے کے لیے ملازمت اور روزگار کو ترک کر دیتی ہیں اقتصادی
طور پر اپنے شوہروں کی دست نگر ہوتی ہیں۔ بیشتر حالتوں میں جو جائداد منقولہ یا

غیر منقولہ حاصل کی جاتی ہے، اس کا مالک شوہر ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کی قیمت شوہر کی کمائی میں سے ادا کی جاتی ہے۔ طلاق یا علیٰحدگی کی صورت میں جن عورتوں کے پاس خود اپنی کمائی یا پس انداز کی ہوئی رقم نہیں ہوتی ان کو اس تمام جائداد سے محروم کر دیا جاتا ہے جو زن و شوہر متحدہ طور پر حاصل کرتے ہیں۔ کچھ قوموں میں تو یہاں تک ہوتا ہے، کہ شادی کے وقت جو جائداد ان کو شوہر سے یا اس کے خاندان سے ملتی ہے وہ بھی ان کو نہیں دی جاتی ہے۔ اس طرح جائداد کے مالی طور پر حصّہ لینے کی بنیاد پر ملکیت کے تعین کا اصول غیر منصفانہ طور پر عورتوں کے خلاف کام کرتا ہے اور مالی اور سماجی تحفظ کا خوف ان کو علیٰحدگی یا طلاق کا راستہ اختیار کرنے سے ان حالات میں بھی روک دیتا ہے جبکہ شادیاں مسرور و کامیاب نہیں ہوتی ہیں۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ جائداد کے حصول میں واقعی مالی حصّہ لینے کے فرسودہ و دقیانوسی معیار کو جاری رکھنے کے بجائے ازدواجی جائداد پر ملکیت کے تعیّن کے مقاصد کے لیے جائداد کے حصول میں اس اقتصادی حصّے کو قانونی تحفظ دیا جائے جو کہ ایک زوجہ خانہ داری کے کام کے ذریعے اس سلسلے میں لیتی ہے۔ ہم اس لیے سفارش کرتے ہیں کہ طلاق یا علیٰحدگی کی صورت میں عورت کو ان املاک میں کم از کم ایک تہائی حصّہ ملنا چاہیے۔ جو شادی کے وقت یا شادی کے بعد حاصل ہوئی ہوں۔

۷. خاندانی عدالتیں (FAMILY COURTS)

شادی بیاہ کے معاملے میں جو قانون وضع کیے گئے ہیں وہ فریاد رسی کے لیے اصول مخالف (ADVERSARY PRINCIPLE) پر عمل کرتے ہیں یعنی مدعی دادخواہی کے لیے کچھ الزام لگاتا ہے اور مدعا علیہ اُن کو غلط ثابت کرتا ہے۔ مزید برآں ان وضع کردہ قوانین میں بشتر دلائل نظریہ انقطاع BREAK-DOWN THEORY کے بجائے "اصول قصور" FAULT PRINCIPLE پر مبنی ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان مقدمات میں خاندانی فلاح و بہبود کے بجائے اکثر زور دار وکالت فیصلہ کن عنصر ہوتی ہے۔ شادی بیاہ سے متعلق مقدموں اور دیگر دیوانی کے دعوؤں میں عدم امتیاز کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان کا فیصلہ ہونے میں حد سے زیادہ دیر ہو جاتی ہے جو مصالحت میں ستودلہ

ہو جاتی ہے اور فریقین کے تعلقات اور زیادہ تلخ بنا دیتی ہے ۔ مصالحت جو کہ تمام خاندانی معاملات میں اصلی و خاص قابل لحاظ شے ہونی چاہیے ان کو طے کرنے والے وضع کردہ قوانین میں رہنما اصول نہیں ہوتی ۔ اس لیے ہم پُر زور سفارش کرتے ہیں کہ خاندانی مسائل کے لیے قایم شدہ نظام مخالف (ADVERSARY SYSTEM) کو ترک کردیا جائے اور خاندانی عدالتیں قائم کی جائیں جو سماجی لحاظ سے پسندیدہ نتائج حاصل کرنے کی غرض سے مصالحانہ اور بے ضابطہ و غیر رسمی طریق کار اختیار کریں ۔

۸۔ یکساں سول کوڈ (ضابطہ دیوانی)

آزادی کے ستائیس سال بعد بھی ایک یکساں سول کوڈ کی عدم موجودگی ایک ایسی بے جوڑ چیز ہے جس کا کوئی بھی جواز نہیں پیش کیا جا سکتا، خاص طور سے اس تمام زور کے پیش نظر جو ہم سیکولر ازم و سائنس اور جدیدیت پر زور دیتے ہیں ۔ مختلف قسم کے متعدد پرسنل لا جاری و قائم رکھنا جو کہ مردوں اور عورتوں کے درمیان امتیاز کرتے ہیں ایک ایسا عمل جس سے "بنیادی حقوق" اور "تمہید دستور" کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ جن کے تحت تمام شہریوں کو مساوی مرتبہ و حیثیت دینے کا وعدہ کیا گیا ہے ۔ یہ چیز قومی یک جہتی اور سیکولر ازم کی روح کے بھی خلاف ہے۔ ہم نے موجودہ قوانین میں جن ترمیمات کی سفارش کی ہے وہ ان امور کی سمت محض اشارے ہیں جن میں یکسانیت پیدا کرنے کی ضرورت ہے ۔ ہم اس کی بھی سفارش کرتے ہیں کہ ایک یکساں ضابطہ دیوانی (سول کوڈ) اختیار کر کے دفعہ (ARTICLE 44) کی دستوری ہدایت پر تیزی کے ساتھ عمل درآمد کیا جائے :

۹۔ قانون فوجداری

۱۔ جنسی اختلاط کی رضا جنسی اختلاط کی رضا کا مفہوم سختی کے ساتھ متعین کیا گیا ہے اور اس میں سے وہ رضا خارج کردی گئی ہے، جو عورت جبر یا فریب کے تحت دیتی ہے ۔ جیسا کہ لا کمیشن نے سفارش کی ہے اس میں

سے وہ رضا بھی خارج کر دینی چاہیے جو عورت کی موجودگی میں کسی اور شخص کو ڈرا دھمکا کر حاصل کی جائے۔ ہمارے خیال میں جنسی اختلاط کی مرضی کے لیے لڑکی کا اس سے زیادہ بالغ ہونا ضروری ہے جتنا کہ اسقاط حمل کے لیے۔ اس لیے کہ دونوں حالتوں میں عمر کی ایک ہی حد کا اطلاق ہونا چاہیے۔ ہم یہ سفارش کرتے ہیں کہ رضا کی عمر (جس سے نیچے جنسی اختلاط کے لیے لڑکی کی رضا قانونی طور پہ جائز نہ ہو) ۱۸ سال ہونا چاہیے جس کے متعلق حد کے متصل واقعات میں عدالتوں کو اس امر کا فیصلہ کرنے میں کچھ قانونی لچک کی اجازت ہونا چاہیے کہ لڑکی کافی بالغ ہے یا نہیں۔

۲۔ دو زوجگی اس سلسلے میں موجودہ مروجہ قانون عدالت کے حلقہ اختیار کو اس مقام تک محدود کرتا ہے جہاں دو زوجگی والی شادی عمل میں آئی یا جہاں آخری بار زن و شوہر سکونت رکھتے تھے۔ یہ چیز اس زوجہ کے لیے دشواریاں پیدا کر دیتی ہے جس کو اس کے شوہر نے چھوڑ دیا ہو اور اس کے بعد وہ کسی اور جگہ منتقل ہو گئی ہو۔ ہم یہ سفارش کرتے ہیں کہ کرمنل پروسیجر کوڈ (CRIMINAL PROCEDURE CODE) کے تحت اس امر کی قانونی گنجائش فراہم کی جانی چاہیے کہ دو زوجگی کے متعلق ایک ایسی عدالت کو تحقیق اور مقدمہ کا اختیار ہو جس کے حلقۂ اختیار میں زوجہ سکونت اختیار کیے ہوئے ہے۔

۳۔ حرام کاری ہمارے خیال میں حرام کاری کو ایک ازدواجی جرم قرار دینا چاہیے جس کا تدارک باہمی علیٰحدگی یا طلاق کی صورت میں حاصل کیا جا سکے۔ اس فعل کو ایک جرم فوجداری (CRIMINAL OFFENCE) کے طور پر قائم رکھنا واضح طور پر پچھلی صدی کی اقدار کا غماز ہے۔ جو عورت کو مرد کی ملکیت سمجھتی تھی۔ یہ چیز وکیلوں اور دیگر لوگوں کو بھی مظلوم و مجبور عورتوں کو ضروری امداد بہم پہونچانے سے باز رکھتی ہے۔ ہم سفارش کرتے ہیں کہ حرام کاری کو ایک جرم فوجداری قرار دینے کے سلسلے کو جاری رکھنا فرد کے وقار کے خلاف ہے اور اس کو تعزیرات (PANEL CODE) سے فوراً خارج کر دینا چاہیے۔

۱۰۔ قومیت

شہریت ایکٹ ۱۹۵۵ (CITIZENSHIP ACT) میں ان ہندوستانی عورتوں کے

بارے میں جو غیر ملکیوں سے شادی کر لیتی ہیں کوئی قانونی گنجائش نہ ہونے کے باعث بہت سی عورتیں ایسی ہیں جو کسی مملکت کی شہری نہیں ہیں۔ ہم یہ سفارش کرتے ہیں کہ اس ایکٹ میں ترمیم ہونی چاہیے۔ اس میں غیر ملکیوں سے شادی کرنے والی ہندوستانی عورتوں کے لیے ایک خاص قاعدہ و قانون اس طرح کا شامل ہونا چاہیے کہ ایک غیر ملکی سے شادی کرنے کی حالت میں ہندوستانی عورت اپنی ہندوستانی قومیت سے محروم نہ ہو پائے۔

موجودہ قاعدہ قانون غیر ملکی مردوں سے شادی کرنے والی ہندوستانی عورتوں کے بچوں کو ہندوستان کے شہری سمجھے جانے سے مانع آتا ہے۔ ان حالتوں میں جہاں باپ اور ماں علیحدگی اختیار کر چکے ہیں اور ماں سرپرست ہے۔ اس قاعدہ و قانون کا کوئی جواز نہیں کہ بچے کی قومیت باپ کے وسیلے منتقل کی جائے۔ اس لیے ہم ۱۹۵۵ کے شہریت ایکٹ (CITIZEN SHIP ACT) کی دفعہ (۱) ۴ میں ترمیم کی سفارش کرتے ہیں جو اس طرح ہونا چاہیے "جو شخص ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ کو یا اس کے بعد ہندوستان سے باہر پیدا ہوا ہے وہ اپنی پیدائش کے لحاظ سے ہندوستانی کا شہری ہو گا۔ اگر اس کی پیدائش کے وقت اس کا باپ یا اس کی ماں ہندوستان کی شہری ہو۔"

پانچواں باب

اقتصادی زندگی میں عورتوں کے لیے مواقع، ان کا رول اور ان کے حقوق

عورتوں کے اقتصادی رول اور اقتصادی سرگرمیوں میں شرکت کے لیے ان کے مواقع کا بھی کوئی اندازہ سماج کی منزل ارتقا، خاندان اور وسیع تر سماج میں عورتوں کے رول کے متعلق معاشرتی اور ثقافتی رویوں اور حیثیت و مرتبہ کے بنیادی اجزا، کے متعلق سماجی تصورات کو الگ کر کے نہیں لگایا جا سکتا۔ ارتقا کی بعض منازل پر کام کرنے کی صلاحیت سماجی حیثیت و مرتبہ کا بلند ترین حق فراہم کر سکتی ہے۔ لیکن جب سماج میں مساوات نہ رہے تو کام کے بجائے فرصت سماجی حیثیت و مرتبہ کی نشان دہی کرنے والی چیز بن سکتی ہے۔

عورتوں کے اقتصادی رول کے متعلق اور اقتصادی شرکت کے لیے حقوق اور مواقع کی مساوات کی ضرورت کے متعلق تمام بحث تین دلیلوں پر مرکوز ہے:

۱۔ عورت کی معاشی محکومی دست نگری کی وجہ سے عورت کا استحصال ہوتا ہے اور یہ چیز سماجی انصاف اور اسی نظریے کے تحت حقوق کے منافی ہے۔ کارل مارکس اور مہاتما گاندھی دونوں نے عورت اور مرد کے رول کے درمیان سخت اور بے لوچ امتیاز کی مخالفت کی ہے۔

۲۔ سماج کی ترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس میں آبادی کے تمام حصے پوری شرکت کریں اور عورتوں کی امکانی صلاحیتوں اور قوتوں کے لیے پورے نشوونما کے مواقع حاصل ہوں۔ "عورتوں کے خلاف امتیاز کے خاتمہ کا اعلان" جو یو۔ این۔ او نے کیا ہے اس کا بنیادی تصور یہی ہے۔

۳۔ قومی اعداد و شمار اور سماجی تبدیلیوں میں جو جدید رجحانات نظر آرہے ہیں ۔مثلاً شادی کی بڑھتی ہوئی عمر، زیادہ چھوٹے خاندان ، شہری رنگ میں منتقل ہونے کا رجحان ، نقل مقام ، بڑھتی ہوئی قیمتیں اور زندگی کے معیار اور فیصلے کرنے میں زیادہ شرکت کے لیے چیخ پکار ، یہ سب چیزیں عورتوں کی ذمہ داریوں اور رول میں بڑی تبدیلیاں پیدا کر رہی ہیں ۔ اگر عورتیں اپنی سماجی رکاوٹوں اور درماندگیوں کی وجہ سے ان چیلنجوں کا مقابلہ نہ کرسکیں تو اس کا نتیجہ سماجی بحران کی شکل میں نمودار ہوگا ۔

عورتوں کی بڑھتی ہوئی اقتصادی سرگرمیوں کی مخالفت ان چیزوں سے پیدا ہوتی ہے ۔

۱۔ یہ قدامت پرستانہ نظریہ کہ عورتوں کے رول بے لوچ طور پر متعین حدود کے اندر محدود ہونے ضروری ہیں (دونوں جنسوں کے درمیان اس تقسیم محنت کے نمونے مختلف رہے ہیں نہ صرف معاشروں کے درمیان بلکہ معاشروں کے اندر بھی۔) اور

۲۔ یہ ڈر کہ اگر عورتیں بہت بڑے پیمانے پر محنت کی منڈی میں داخل ہوگئیں تو اس کے نتیجہ میں بیروزگاری مزمن شکل اختیار کرسکتی ہے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معیشت میں عورتوں کے "حاشیائی رول" کے نظریات پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن یہ نظریہ زرعی معاشروں میں ناقابل اطلاق ہے جہاں خاندان پیداوار کی اکائی ہوتا ہے اور مرد، عورتیں اور بچے سب ہی پیداوار کے عمل میں حصّہ لیتے ہیں ۔ روایتی زرعی اور گھریلو صنعت سے جدید منظّم صنعت و خدمات میں تبدیلی اور دیہی علاقوں سے شہری علاقوں میں تبدیلی ایک ایسی چیز ہے جو محنت کی روایتی تقسیم کو تباہ کر دیتی ہے اور افراد خاندان کے باہمی تکمیلی رشتہ کو ختم کرکے افراد کے درمیان محنت کی اکائیوں کی حیثیت سے باہمی مسابقت کا رشتہ پیدا کر دیتی ہے ۔ پیداوار کے طریقوں میں ٹکنیکل تبدیلیوں کی وجہ سے نئی ہنرمندیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان نئی ہنرمندیوں کو حاصل کرنے کے مواقع کے فقدان کی وجہ سے مجبور و معذور عورتیں خود کو نئی معیشت میں غیر مطلوب و غیر ضروری پاتی ہیں۔

یہی وہ صورتِ حال ہے جس کا سامنا آج ہندوستان کی عورتوں کی بڑی

تعداد کو کرنا پڑ رہا ہے ۔ روایتی دیہی معیشت میں کاشتکاروں، کاریگروں اور ادنیٰ قسم کی خدمات ادا کرنے والوں کے درمیان عورتیں پیداوار اور فروخت میں امتیازی اور تسلیم شدہ کردار ادا کرتی ہیں اور ان مقامات پر اب بھی ایسا ہی کرتی ہیں، جہاں روایتی معیشت کے طریقے رائج ہیں ۔ خاص طور سے ان کسانوں کے درمیان جن کے پاس بہت تھوڑی زمین ہے یا بالکل نہیں ہے نیز بشیتر اچھوت ذاتوں اور قبائلی قوموں کے درمیان اور روایتی صنعتوں اور دستکاریوں میں جیسے کپڑا بننا، ٹوکریاں بنانا اور (ہاتھ سے) کھانے پینے کی چیزیں بنانا ۔ اگرچہ عورتوں کے کام کے معیاروں میں علاقائی اختلافات ہیں، ہم روایتی اونچے طبقے کا معیار ۔ وہ معیار جو عورتوں کو خاندان کے حدود سے باہر کام کرنے کی اجازت نہیں دیتا ـــــ ابھی تک اونچی حیثیت کی علامت بنا ہوا ہے اور اس کی تقلید بہت سے لوگوں میں کی جاتی ہے جو سماج میں اپنا رتبہ بڑھانا چاہتے ہیں ۔

ہندوستانی معیشت میں عورت کا زوال پذیر رول

جن قوتوں نے ہندوستانی معیشت میں عورتوں کے رول کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے وہ یہ ہیں ۔ عام طور پر دستکاریوں کا زوال ۔ زراعت پر بڑھتی ہوئی آبادی کا دباؤ ۔ دیہاتی علاقوں میں مفلسی میں اضافہ اور اس کے نتیجے میں نقل مقام ۔ بڑھتی ہوئی ٹیکنیکل ترقی کے ساتھ جدید صنعت کا نشوونما ۔ تعلیم کی اشاعت اور زندگی کے بڑھتے ہوئے مصارف خاص طور سے شہری علاقوں میں ۔ صنعتی ترقی کے ابتدائی مرحلہ میں کپڑے اور جوٹ کی صنعت میں نیز باغوں اور کانوں میں خاندانی شرکت کا نمونہ جاری رکھا گیا اور بڑی تعداد میں عورتوں اور بچوں کو کام پر اس طرح لگایا گیا کہ ان کو اجرت کی نسبتاً کم شرحوں پر غیر ہنرمندانہ یا نیم ہنرمندانہ قسم کے کام تک محدود رکھا گیا ۔ اس کے بعد ٹیکنیکل تبدیلیوں نے ان صنعتوں میں عورتوں کے استعمال و روزگار پر غیر مساعد اثر ڈالا ہے ۔ اسی کے ساتھ دیہی صنعتوں کے انحطاط نے عورتوں کو روز بروز بڑھتی ہوئی تعداد میں اپنی روزی کمانے کے لیے کھیتی باڑی کے کام میں ڈھکیل دیا ہے اور

اس طرح ان کی تعداد اور فیصد اوسط بڑھتا رہا مگر ان کے روزگار اور کام کی سطحیں کم ہوتی رہی ہیں دوسری طرف زندگی کے بڑھتے ہوئے مصارف۔ تعلیم اور شہری علاقوں میں سماجی تبدیلی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ممانعتیں جو اس سے پہلے اونچے طبقات کی عورتوں پر لگادی گئی تھیں۔ اب ہٹ گئی ہیں اور ان میں سے بعض اس قابل ہو گئی ہیں کہ ان نئے پیشے یا کاموں میں جائیں جن کا تعلق تیسرے درجہ کے سیکٹر سے ہے اور جن کے دروازے ان سے پہلے ان پر بند تھے

ترقی و نشوونما کے اس اختلافی اثر کے باعث خالص مقداری پیمانوں میں عورتوں کی اقتصادی شرکت کا ایک تفصیلی تجزیہ پوری داستان بیان نہیں کر سکتا۔ عورت کے معاشی رول کا کوئی بھی اندازہ لگانے کے لیے ضروری ہے کہ مخصوص حصّوں میں مرتب کرنے کے لیے اس کے سب رول الگ الگ کیے جائیں اور معاشی سماجی اور مقامی خصوصیات کی بنیاد پر نیز معاشی عمل کے ساتھ ان کی مطابقت کے درجہ کی بنا پر ان میں فرق و امتیاز کیا جائے۔ اس طرح عورتوں کی شرکت کے مسائل کو سمجھنے میں سب سے بڑی دشواری اس وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ کام کرنے والی عورتوں کو ہم نوع افراد کے ایک گروپ کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے۔ اس مفروضہ نے ان معلومات کو جو نتائج اخذ کرنے کے لیے جمع کی گئیں ان قوانین اور حکمتِ عملیوں کو جو کام کرنے والی عورتوں کی حالت کو سدھارنے کے لیے اختیار کی گئیں اور ان تصورات کو متاثر کیا ہے جو معیشت میں عورتوں کی شرکت کے متعلق عام طور پر لوگوں میں پائے جاتے تھے۔

ایک تفصیلی تجزیہ سے اس امر کا انکشاف ہوتا ہے کہ ۱۹۲۱ سے عورتوں کی معاشی و اقتصادی شرکت انحطاط پر مائل رہی ہے اور یہ انحطاط دونوں طرح سے ہو رہا ہے یعنی عورتوں کی کل آبادی میں کام کرنے والی عورتوں کی فی صد تعداد کے لحاظ سے بھی محنت کرنے والے افراد کی کل جماعت میں ان کی فیصد تعداد کے لحاظ سے بھی اور اگر ایک طرف کام کرنے والی کل عورتوں کی تعداد ۱۹۱۱ میں ۴ کروڑ ۱۸ لاکھ ہو گئی تو دوسری طرف محنت کرنے والے افراد کی کل جماعت میں ان کی فیصد تعداد جو ۱۹۱۱ میں ۳۴،۴۴ فیصدی تھی۔ ۱۹۷۱ میں کم ہو کر ۱۷،۳۵ فیصد عورتوں کی کل آبادی میں کام کرنے والی عورتوں کی تعداد ۱۹۱۱ میں ۳۳،۷۳ تھی جو ۱۹۷۱ میں

صرف ۱۱٫۸۶ فیصد رہ گئی۔ کمی کا یہ رجحان حالیہ چند سالوں میں اور بھی زیادہ بڑھا ہے۔ ۱۹۶۱-۷۱ کے دوران مردوں اور عورتوں کی آبادی بالترتیب ۲۵ فیصد ۲۴ فیصد بڑھی (محنت کرنے والے گروپ میں ۲۰ فیصد اور ۲۱ فیصد) اور محنت کرنے والے مردوں کی تعداد ۱۵٫۱۲ فیصدی بڑھی تو کام کرنے والی عورتوں کی تعداد عورتوں کی تعداد ۴۱٫۴۱ فیصد کم ہو گئی۔

اکثر یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ ان دو مردم شماریوں میں کام کرنے والوں کی تعریف میں جو تبدیلیاں کی گئی ہیں یہ انحطاط ان کا ہی نتیجہ ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ بنیادی طور پر مردم شماریوں میں مردوں کے کاموں اور روزگار کی سطح کو ناپا جاتا ہے اور گھر کی منتظمہ اور سود مند کام کرنے والوں کی حیثیت سے عورتیں جو قابل مبادلہ رول ادا کرتی ہیں ان کو نظر انداز کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ چونکہ ان میں سے بہت سی عورتیں بے تنخواہ کام کرنے والی ہوتی ہیں اس لیے کام کرنے والوں کی تعریف سے ثانوی درجہ کے کام کو خارج کر دینے سے عورتوں کے کام اور روزگار کے اعداد و شمار کا ریکارڈ تیار کرنے پر برا اثر پڑتا ہے۔ ۱۹۷۱ میں جو مردم شماری ہوئی اس میں ایسی ۲۳ لاکھ عورتوں کو کام نہ کرنے والوں کے زمرے میں شمار کیا گیا جس سے درحقیقت کوئی بڑا فرق نہیں پڑتا ہے۔ دوسری طرف یہ عام خیال ہے کہ ۱۹۶۱ کی مردم شماری میں ایک کام کرنے والے فرد کی جو تعریف معین کی گئی تھی وہ بہت وسیع تھی لیکن یہ دیکھا گیا کہ آندھرا پردیش، کرناٹک، اور تامل ناڈو کی ریاستوں کے علاوہ اور کسی جگہ نتائج اخذ کرنے کے لیے جمع کیے گئے اعداد و شمار میں اس سے کوئی زیادہ فرق نہیں پڑا۔ علاوہ ازیں ۱۹۶۱ء کی مردم شماری میں کام کرنے والی عورتوں کی جو شرح ۲۷٫۵ فیصد پیش کی تھی وہ اسی سال کیے گئے نیشنل سیمپل سروے (NATIONAL SAMPLE SURVEY) کی پیش کردہ شرح ۲۷٫۲ فیصد سے مطابقت رکھتی ہے۔ اس لیے بدلتی ہوئی تعریفات کا اثر محض حاشیائی اور معمولی نوعیت کا ہے اور معیشت میں عورتوں کی زوال پذیر شرکت کا رجحان ایک مسلسل رجحان رہا ہے۔

مردکام کرنے والوں کے مقابلے میں کام کرنے والی عورتوں کا تناسب دیہی

علاقوں کے اندر تمام زمروں میں اور شہری علاقوں کے اندر بیشتر زمروں میں کم ہو گیا ہے۔ معیشت میں مردوں اور عورتوں کی شرکت کی شرحیں سب سے کم عمر (یعنی صفر سے ۱۴ سال تک کے) گروپ کے علاوہ باقی تمام عمر کے گروپوں میں بہت وسیع فرق رکھتی ہیں اور یہ فرق دیہی علاقوں کے مقابلہ میں شہری علاقوں میں کہیں زیادہ ہے۔ ۱۹۶۱ سے کام کرنے والی عورتوں کی تعداد میں یہ کمی تمام عمر کے گروپوں میں واضح ہے۔ کام کرنے والی عورتوں کی فیصد تعداد میں یہ ہمہ گیر کمی اور انحطاط تمام ریاستوں کے اندر دیہی اور شہری دونوں طرح کے علاقوں میں نظر آتا ہے، لیکن شہری علاقوں میں یہ انحطاط زیادہ تیز ہے۔ مردم شماری نے کام کرنے والی عورتوں کی نو صنعتی زمروں میں جو تقسیم اختیار کی ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زراعت پر ان کا انحصار بڑھتا جا رہا ہے اور صنعت اور ملازمت دونوں کے سیکٹر میں ایک کمی ہوتی جاتی ہے۔

کام کرنے والی عورتوں کے زُمرے

ہماری تحقیقات نے یہ بات معلوم ہوئی، کہ مردم شماری نے کام کرنے والی عورتوں کے جو زُمرے مقرر کیے ہیں وہ نہ تو معیشت میں عورتوں کی شرکت کی حد اور نوعیت کے مناسب تعین کے لیے درحقیقت مفید ہیں اور نہ اُن کے مسائل اور ان کی معذوریوں کی مناسب تشخیص کے لیے۔ اس لیے ہم نے ان کے کام اور روزگار کے سیکٹروں کے درجہ "تنظیم" اور مسائل کی نوعیت کے مطابق ان کو دو بڑے زمروں میں تقسیم کر دیا یعنی غیر منظم سیکٹر اور منظم سیکٹر۔ ان دونوں سیکٹروں کے درمیان جو فرق ہے وہ کام کا فرق نہیں ہے۔ جیسا کہ زراعت۔ صنعت اور ملازمتوں کے درمیان ہو کیونکہ ہو سکتا ہے کہ یہ کام ان دونوں ہی سیکٹروں میں پائے جاتے ہوں۔ ان میں جو حقیقی فرق ہے وہ مضمر ہے۔ پیداوار تعلقات کی تنظیم میں۔ عوامی کنٹرول اور ضبط و نظم کے درجہ نفوذ دخل میں اور نتائج اخذ کرنے کے لیے اعداد و شمار جمع کرنے والے کارکنوں یا اداروں نیز سائنسی محققین کے ذریعہ تسلیم شدہ ہوتے ہیں۔

منظم سیکٹر جدید پیداواری تعلقات کی خصوصیت کا حامل ہے اور اس کا ضبط و

نظم ایسے قوانین کے ذریعہ ہوتا ہے جو محنت کشوں کی سلامتی اور کام کے حالات کا تحفظ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نیز ایسی مزدور تنظیموں کے ذریعہ جو اجتماعی سودا بازی کرنے کی اہلیت و قوت رکھتی ہیں۔ اس میں ملازمتوں اور صنعتوں کا پورا پبلک سیکٹر بھی شامل ہے اور پرائیوٹ سیکٹر کا وہ حصّہ بھی جو ضابطوں کے تحت کام کرتا ہے۔ غیر منظم سیکٹر جس میں زراعت، اور دوسری مختلف و متعدد صنعتیں اور ملازمتیں شامل ہیں یہ خصوصیت رکھتا ہے کہ اس میں ان تمام حفاظتی تدابیر اور مشینری کا فقدان ہے۔ سماجی معاشی حالات اور کام کے مواقع کے متعلق معلومات بھی اس سیکٹر میں حد سے زیادہ قلیل و ناکافی ہیں۔ ہندوستان میں کام کرنے والی عورتوں کی حیثیت اس حقیقت سے واضح ہے کہ ان میں سے ۹۴ فیصدی عورتیں غیر منظم سیکٹر میں پائی جاتی ہیں اور ۶ فیصدی منظم سیکٹر میں۔

۱۔ غیر منظم سیکٹر کی عورتیں

<u>عمومی</u> | رفتہ رفتہ معیشت کو تجارتی اور جدید رنگ میں رنگنے کا عمل جاری رہا ہے۔ اور کریڈٹ اور مارکیٹنگ کے روایتی اداروں کی جگہ جدید ادارے قائم کرنے، ملکیت کو استحکام دینے اور کم سے کم اجرتوں کو برقرار رکھنے کے لیے حکومت نے بھی کوششیں کی ہیں لیکن یہ چیزیں پیداواری تعلقات کو منظم کرنے یا اس سیکٹر کے اندر زرعی یا غیر زرعی پیشوں میں نسبتاً کمزور طبقوں کے استحصال کی مقدار پر قابو رکھنے میں کسی طرح بھی کامیاب نہیں ہوئی ہیں اور نہ ان سے کم پیداوار، مفلسی، بیروزگاری اور ناکافی روزگار کے مسائل حل ہوئے ہیں۔ اس باہمی آمیزش اور خلط ملط کا نسبتاً زیادہ بڑا اثر عورتوں پر پڑا ہے۔ جن کی اُجرتیں اس سیکٹر میں نسبتاً پست اُجرتوں کے ڈھانچے کے اندر بھی یکساں طور پر مردوں سے کم ہیں۔ ان میں زیادہ تر عورتیں وہ ہیں جو بغیر تنخواہ کے اپنے خاندان کے لیے کام کرتی ہیں اور خاندان کی کمائی میں ان کی مدد اور حصّہ کو تسلیم نہیں کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں جو متعدد تخمینے لگا دیے گئے ہیں۔ وہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ایسی عورتیں محنت کش مردوں کی جماعت کا ۱۵ تا ۱۷ فیصد ہیں اور محنت کش عورتوں کی جماعت کا ۴۱ تا ۹۴ فیصد ہیں۔

اگرچہ ان عورتوں کے متعلق جو کھیتی باڑی کا کام کرتی ہیں۔ نسبتاً زیادہ معلومات مہیا ہیں۔ لیکن ان عورتوں کے متعلق جو زراعت کے علاوہ دوسرے پیشوں میں ہیں۔ تقریباً کچھ بھی قابلِ اعتماد معلومات موجود نہیں۔ مردم شماری نے کام کرنے والی عورتوں کی جو تقسیم اصلی و ابتدائی کام کی بنیاد پر کی ہے وہ زرعی اور غیر زرعی پیشوں کی اس نوعیت کو بھی نظر انداز کر دیتی ہے کہ وہ باہم خلط ملط ہو جاتے ہیں اور اس نوعیت کو بھی کہ یہ پیشے موسمی ہوتے ہیں اور باہم بدلتے رہتے ہیں۔ اس سیکٹر کے اندر روزگار بے روزگاری اور ناکافی روزگار کا اندازہ لگانے میں جو دشواریاں ہیں ان کے باوجود "بے روزگاری کمیٹی" (UN-EMPLOYMENT COMMITTEE) نے تحقیق کرنے پر یہ بات دریافت کی بے روزگاری اور ناکافی روزگار کا شکار عورتیں زیادہ ہیں۔ ۱۹۷۱ میں دیہی علاقوں میں ۳۲ لاکھ بیکار مردوں کے مقابلے میں ۱۵۴ لاکھ بیکار عورتوں کا اندازہ لگایا گیا تھا۔ دیہی علاقوں کے بے روزگار افراد کا تقریباً ۶۰ فیصد اور پورے ملک کے بیروزگار افراد کا تقریباً ۵۷ فیصد عورتیں ہیں۔ چونکہ یہ تخمینہ صرف ان عورتوں کو نظر میں رکھ کر لگایا گیا ہے۔ جو "کام کی متلاشی" کی حیثیت سے درج کی گئی تھیں اس لیے بیکار عورتوں کی اصل تعداد اس سے زیادہ ہو گی کیونکہ عورتوں کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جس کو روزگار کی ضرورت ہے لیکن روزگار کے مواقع معلومات اور تربیت کی عدم موجودگی میں وہ روزگار کی متلاشی نہیں ہوتی۔ اسی طرح ناکافی روزگار والی عورتوں کی تعداد مردوں کے مقابلے میں زیادہ ہو جاتی ہے۔ جب ان کو ایک ہفتہ میں کام کے ۴۲ تا ۲۸ گھنٹے شہری اور دیہاتی دونوں علاقوں میں ملتے ہیں۔ جب عورتوں کے کام کے گھنٹے کم ہوتے ہیں تو ان کا تناسب مردوں کے مقابلے میں کم ہوتا ہے۔

اس سیکٹر میں جو بنیادی مسائل روزگار کے سلسلے میں عورتوں کے رول اور مواقع پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ وہ عورتوں کی معذورانہ محتاجی و دست نگری سے پیدا ہوتے ہیں جو کہ روزگار کے مناسب مواقع کی کمی محدود ہنرمندیوں اور ناخواندگی نقل و حرکت کی محدود اہلیت اور خود اختیاری حیثیت کے فقدان کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ پیشے کے لحاظ سے عورت کی حیثیت خصوصاً دیہی علاقوں میں شوہر یا

باپ کے پیشوں سے منتقل ہوتی ہے۔ پیداآور وسائل پر کنٹرول کا فقدان اور کھیت اور مصارف کے درمیان نمودار ہوتا ہے یہ دونوں چیزیں ان کو سودا بازی کی قوت اور پیشہ ورانہ نقل و حرکت کی اہلیت سے محروم کر دیتی ہے

کوئی ایسی قابل اعتماد معلومات مہیا نہیں ہو سکی ہیں جن سے یہ تخمینہ لگا یا جا سکے کہ کتنی عورتیں مفلسی کی سطح سے نیچے ہیں۔ لیکن عورتوں میں بے روزگاری اور ناکافی روزگار کو دیکھتے ہوئے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مردوں کے مقابلے میں اس سلسلے میں عورتوں کے تعداد کے قوی ہونے کا زیادہ امکان ہے۔ اس وسیع گروپ میں وہ عورتیں بھی شامل ہیں جو غیر ہنرمندانہ کام کرنے والی ہیں بے زمین زرعی مزدور ہیں۔ ان گھرانوں کی اراکین ہیں جن کے پاس بٹے کی بے منافع زمین ہیں اور وہ جو کہ ادنیٰ و خادمانہ قسم کے روایتی کاموں میں لگی ہوئی ہیں۔ ان کی ایک بڑی تعداد دیہی اور گھریلو صنعتوں میں مصروف ہے۔ ہم کو مختلف و متعدد حلقوں سے عورتوں میں بڑھتی ہوئی محتاجی و مفلسی کی رپورٹیں ملیں اگرچہ اس سلسلے میں قابل اعتماد تحقیقی مواد دستیاب نہیں ہے۔

عورتوں کی معاشی و اقتصادی شرکت کے مواقع اور حقوق کے سلسلے میں جو معذوریاں اور محرومیاں موجود ہیں وہ زیادہ غالب طور پر غیر منظم سیکٹر میں ہیں اور ان کے لیے خصوصی توجہ اور مخصوص تدارک کی تدابیر کی ضرورت ہوگی۔ کیونکہ معیشت کے ڈھانچے میں ایسی تبدیلیاں جو اس سیکٹر کے حصے کو کم کر سکیں کچھ اس طرح کی چیزیں ہیں جن کو زیادہ سے زیادہ ایک بہت بعید مقصد ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔

زراعت

۱۹۷۱ کی مردم شماری کے مطابق کام کرنے والی عورتوں کی ۸۰ر۱ فیصد تعداد زراعت میں ہے۔ محنت کش عورتوں کی جماعت میں سے ۸۷ فیصد دیہی علاقوں میں ہیں اور ۱۲ر۵ فیصد شہری علاقوں میں۔

روزگار کے مواقع میں انحطاط

زمینی تعلقات اور محنت کے مصرف و استعمال کا نظام دیہی طبقہ کی درجہ دار ساخت کے ساتھ اندرونی اور قریبی طور پر مربوط ہے۔ جہاں فرد کی حیثیت زمین ذات پات اور معاشی قوت سے وابستہ ہے مردم شماری زرعی کام کرنے والے لوگوں کو صرف

دو زمروں میں تقسیم کرتی ہے اور کاشتکاروں اور مزدوروں دونوں کے مختلف و متعدد
درمیانی زمروں کو نظر انداز کر دیتی ہے ۔ مثلاً غیر موجودہ مالکان اراضی ۔ اراضی کے
پٹہ دار ۔ مختلف زمروں کے اسامی جن میں فصلی حصّہ دار اور حاشیائی چھوٹے موٹے
کسان شامل ہیں ۔ موقع بہ موقع روزانہ اُجرت پر کام کرنے والے مزدور اور مستقل
طور پر وابستہ مزدور جن میں وہ مزدور بھی شامل ہیں جو ٹھیکہ پر کام کرتے ہیں اور وہ
بھی جو مکفول ہیں ۔ ان زمروں کی حد بندی واضح طور پر کرنا مشکل ہے ۔ کیونکہ اپنی
آمدنی کی حالت زمین کی قیمتوں ، منافع کی شرحوں اور قرضداری کی کیفیتوں میں
تبدیلیاں ہونے کی وجہ سے ان لوگوں میں ایک زمرے سے دوسرے زمرے میں آنے
جانے کا ایک عمل جاری رہتا ہے ۔ اگرچہ ایک بہت چھوٹی سی اقلیت میں یہ نقل و
حرکت ایک خاص حد تک اوپر کی طرف پائی جاتی ہے جس کی وجہ بہتر پیداوار
زمین کی بڑھتی ہوئی قیمتیں اور زمین کی ملکیت ہوتی ہے ۔ تاہم چھوٹی زمینوں پر
بڑھتے ہوئے خاندانوں کا زیادہ بڑھتا ہوا دباؤ اور قرضداری کے نتیجہ میں زمین سے
محرومی ایسی چیزیں ہیں جو کہ اکثریت کے لیے نقل و حرکت اور تبدیلی کا رخ عام
طور پر نیچے کی طرف موڑ دیتی ہے ۔ اس عمل کا اثر کسان عورتوں کی تعداد میں تیز
انحطاط سے نمایاں ہے جو ۱۹۵۱ میں ایک کروڑ ۳۰.۸ لاکھ تھی اور ۱۹۷۱ میں
۹۲ لاکھ رہ گئی ۔ اس انحطاط کو جن حالات سے منسوب کیا جا سکتا ہے وہ ہیں بڑھتی
ہوئی ناداری کے نتیجہ میں زمین سے محرومی اور خاندانی مزرعوں پر پیداآور کام کے
مواقع میں ناکافی اضافہ کے نتیجہ میں عملی کاشت کاری سے عورتوں کی علٰحدگی زرعی
مزدور عورتوں کی تعداد بڑھ رہی ہے ۔ ۱۹۵۱ میں ایک کروڑ ۲۷. لاکھ تھی ۱۹۷۱
میں ایک کروڑ ۵۰.۷ لاکھ ہو گی ۔ یعنی ان کی تعداد پہلے مزدور عورتوں کی کل جماعت
کے ایک تہائی سے کم تھی اور یہ تعداد اب اس کے نصف سے زائد ہو گی ۔ زرعی
مزدور عورتوں کی تعداد میں یہ اضافہ روزگار کے بڑھتے ہوئے مواقع کا مظہر نہیں
بلکہ بڑھتی ہوئی غریبی اور روزگار کی سطح کے انحطاط کی سب سے بڑی علامت ہے
پہلی (۱۹۵۰-۵۱) اور دوسری (۱۹۵۶-۵۷) "زراعتی لیبر انکوائری" اور "دیہی لیبر
انکوائری" (۱۹۶۴-۶۵) اور دیہاتی خاندانوں کے چند عمیق مطالعے (۱۹۶۷-۷۰) یہ ظاہر

کرتے ہیں کہ عورتوں میں بے روزگاری کی سطح مردوں کے مقابلے میں کافی اونچی ہے۔

اجرتوں میں امتیاز

مزرعوں میں کام کرنے والی عورتوں کی اجرت کی شرحوں میں کمی کا سبب روزگار کی غیر منظم نوعیت خاندان کے محنت کرنے والوں کی جگہ کرایہ کے مزدوروں کی فراہمی میں آسانی اور عورتوں کی اجارہ داری کے طور پر بعض کاموں کی روایتی درجہ بندی ہے۔ اجرت مقرر کرنے کا نظام اور کم سے کم اجرتوں کے قانون" (MINIMUM WAGES ACT) کے تحت" کم سے کم اجرتوں کا نفاذ "یکساں نہیں ہے اور بہت سے علاقے" ابھی تک اس قانون کے دائرہ عمل کے اندر نہیں لائے گئے ہیں۔ مزرعوں کے مزدور خصوصاً عورتیں جن کے لیے ان کی مفلسی۔ ناخواندگی۔ قانون سے لاعلمی اور روزگار کی غیر مستقل و اتفاقیہ نوعیت سنگ راہ ثابت ہوتی ہے ان طریقوں کو اختیار کرنے سے معذور ہوتی ہیں جو کہ اب صنعتی مزدوری میں عام ہیں۔ اجرت مقرر کرنے والا نظام کچھ ریاستوں میں ایک ہی قسم کے کاموں کے لیے عورت اور مرد کی اجرت میں امتیازات و تفریقات کو برقرار رکھتا ہے اور ان کاموں کی اجرت کی شرح کم مقرر کرتا ہے جو روایتی طور پر صرف عورتیں ہی کرتی ہیں۔ عورتوں کی اجرت میں کمی کی ایک اور وجہ یہ رواج ہے کہ کام کا دن ۸تا ۹ گھنٹوں کے برابر سمجھا جاتا ہے جو عورتیں گھریلو ذمہ داریوں کی وجہ سے آدھ گھنٹہ بھی دیر سے آئیں تو ان کو صرف آدھے دن کی مزدوری دی جاتی ہے۔

اگرچہ "کم سے کم اجرتوں کے قانون" کا نفاذ ناکافی ہوا ہے! لیکن پھر بھی کچھ ریاستوں میں اجرت کے امتیاز کو کم کرنے میں اس سے مدد ضرور ملی ہے اور بعض ریاستی حکومتوں مثلاً بہار نے بعض کاموں کے لیے مختلف اجرت کی شرحیں مقرر کرنے کا طریقہ حال ہی میں بند کر دیا ہے۔

معذوریاں اور استحصال

دیہی اور گھریلو صنعتوں کے زوال اور اس کے باعث متبادل روزگار اور ہنرمندیوں کے ختم ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ پیشہ ورانہ عدم نقل وحرکت کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے جو کہ عورتوں کے لیے ایک معذوری و مجبوری کی حیثیت رکھتی ہے۔ دیہی کاموں کے پیداگاہوں سے وہاں

کے لوگوں کی کم مدت کی ضروریات پوری ہو سکتی ہیں ۔ لیکن ان کے اثرات مسلسل نہیں رہ سکتے ہیں نہ تو روزگار کی ایک مستقل سطح برقرار رکھنے میں اور نہ نئی نئی قسم کی ہنرمندیاں پیدا کرنے میں مزدوری کا کام کرنے والی عورتیں خود اپنے گاؤں میں یا گھر سے تھوڑے فاصلے پر روزگار کو ترجیح دیتی ہیں ۔ اس محدود پیشہ ورانہ نقل و حرکت کے اختیاری اسباب کے علاوہ اس کی بنا سماجی نفسیاتی وجوہات اور گھریلو ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ بہت سی عورتوں کے لیے یہ فیصلہ بے اختیاری بھی ہوتا ہے جس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان کو اسی جگہ کام کرنا ہوتا ہے جہاں ان کے شوہر یا بیٹے مستقل طور پر کام پر لگے بندھے ہوتے ہیں ۔ اس صورت میں ایک عورت پر نقصان و مضرت کی زد پڑنے کا امکان اور بھی زیادہ ہو جاتا ہے کہ جب اس کے شوہر کی حیثیت ایک مجبور و مکفول مزدور کے درجہ تک گر جاتی ہے ۔ نیشنل کمیشن برائے محنت" NATIONAL COMMISSION ON LABOUR نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ یہ نظام ان قبائلی اور نیم قبائلی فرقوں کی شدید مفلسی اور معذوری سے پیدا ہوا ہے جو کہ ایسی معیشت کی گرفت میں ہیں جس میں روزی کی حالت بے اختیاری اور پُرخطر ہوتی ہے ۔ اس طبقے کی پستی کے کئی متعدد اسباب تھے جیسے بٹہ کی بے منافع زمینیں ۔ حق ملکیت کا عدم تحفظ ۔ لگان کا بارِ گراں ۔ اداروں کے وسائل سے ملنے والے قرضوں کی ناکافی مقدار اور اس کے ساتھ ہی کھپت اور آمدنی کے درمیان وسیع خلا کا مسئلہ ۔ ہماری توجہ اس چیز کی طرف مبذول کرائی گئی کہ مکفول یا زرخرید مزدوروں کا جو نظام ہے اس کی وجہ سے بعض اوقات عورتوں کا طرح طرح سے استحصال کیا جاتا ہے ۔ یوپی کے پہاڑی علاقوں کے بعض حالیہ مطالعوں سے اس امر کا انکشاف ہوا ۔ مکفول یا زرخرید مزدوروں کے واقعات اور ایسے خاندانوں کی عورتوں کو بیوپار کے طور پر استعمال کرنے کے واقعات ایک قریبی تعلق ہے ۔

اگرچہ زرعی نظام میں سماجی حیثیت اور اقتصادی پوزیشن کے درمیان متعین کیت کا تعلق ثابت کرنا بہت مشکل ہے لیکن ایسی علامات موجود ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کھیتوں میں مزدوری کرنے والی عورتوں کی ایک بڑی تعداد ان کی ہے جو مندرجہ فہرست ذاتوں اور مندرجہ فہرست قبیلوں کے سماجی طور پر پست فرقوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ ۱۹۷۱ میں اوّل الذکر فرقہ کی کام کرنے والی

عورتوں میں ۱۹٫۴۴ فیصد اور آخرالذکر کام کرنے والی عورتوں میں ۳۳٫۱۱ فیصد زرعی مزدور تھیں ایک اور مسئلہ جو زراعت میں عورتوں کی شرکت پر اثر انداز ہوتا ہے کاشتکاری کے جدید طریقوں کا رواج ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ رفتہ رفتہ عورتوں کو ہٹایا جا رہا ہے اور ان کی سرگرمیاں سمٹتی جا رہی ہیں اس صورت حال کا سبب زرعی توسیع کے کارناموں کی عصبیت اور عملی ذہنیت ہے جو صرف مردوں ہی کو نئے طریقے سکھاتے ہیں اور اس طرح اُن تبدیلیوں کی رفتار تیز کر دیتے ہیں جو عورتوں پر ایک مضرت رساں اثر ڈالیں گی۔

زرعی محنت کشوں کے استحصال کا بنیادی حل زمین کی تقسیم نو میں مضمر ہے لیکن اس مقصد کے لیے قانون سازی اب تک بری طرح غیر موثر رہی ہے۔ اس سے بھی خراب بات یہ ہے کہ زمین کی زیادہ سے زیادہ حد مقرر کرنے والے بعض قانون عورتوں کے خلاف امتیاز برتتے ہیں۔ پنجاب، مدھیہ پردیش اور کرناٹک کے زمین کی زیادہ سے زیادہ حد مقرر کرنے والے قوانین میں ایک بالغ بیٹا زمین کی خاندانی حد کے باہر زمین کی ایک یونٹ کا حقدار ہوتا ہے۔ لیکن ایک شادی شدہ یا غیر شادی شدہ بالغ بیٹی کے لیے ایسی کوئی دفعہ نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کھیتوں میں کام کرنے والے مزدوروں کو منظم کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ ان کی سودا بازی کی طاقت کو بڑھایا جا سکے اور استحصال اور قلیل اجرتوں کے سلسلے کو روکا جا سکے۔

<u>غیر زرعی پیشے</u> کچھ موٹے موٹے تخمینوں کے علاوہ جو ۱۹۶۱ کی مردم شماری پر مبنی ہیں۔ اس غیر متشکل اور غیر منظم گروپ کے روزگار کی مقدار، حجم اور خصوصیات کے متعلق کوئی قابل اعتماد معلومات دستیاب نہیں جو کہ بے ضابطہ صنعتوں اور ملازمتوں میں برسرکار ہے۔ ان دور دور بکھرے ہوئے اور چھوٹے چھوٹے اداروں میں جن میں قلیل سرمایہ لگا ہوا ہے۔ روایتی دیہی اور گھریلو صنعتیں۔ خاندانی اور چھوٹے پیمانے کی صنعتیں اور ایسی بے ضابطہ ملازمتیں یا خدمات شامل ہیں جیسے جاروب کشی۔ مہتروں یا گھریلو نوکروں کے کام۔ یہ صنعتیں ناقص فنی طریقوں۔ کم پیداواری صلاحیت اور ناکافی ادارتی کریڈٹ کی خرابیوں

میں مبتلا ہیں ۔ کارخانوں کے بنائے ہوئے مال کے ساتھ ایک غیر مساویانہ مسابقہ کے نتیجہ میں گھریلو اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کا زوال بہت پہلے سے شروع ہو گیا تھا لیکن خاندانی صنعت میں عورتوں کی شمولیت کے متعلق معلومات صرف ۱۹۶۱ اور ۱۹۷۱ کی مردم شماریوں سے دستیاب ہوتی ہیں ۔ اس عشرۂ سال میں گھریلو دستکاریوں میں عورتوں کی تعداد ۲۶.۰ لاکھ سے گھٹ کر ۱۳.۰ لاکھ ہو گئی ۔ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں اور دیگر غیر منظم ملازمتوں میں روزگار کے متعلق کسی طرح کی قابل اعتماد معلومات نہ ہونے کی وجہ سے اس سیکٹر میں کام کرنے والی عورتوں کی تعداد کا اندازہ محض استخراجی اور قیاسی ہے ۔ ۱۹۷۱ کی مردم شماری نے جن تین کروڑ دس لاکھ عورتوں کو کام کرنے والی عورتوں کی فہرست میں دکھایا تھا ان میں سے دو کروڑ ۵۰ لاکھ زراعت میں تھیں اور تقریباً ۲۰ لاکھ منظم سیکٹر میں ۔ اس لیے ہم نے یہ تخمینہ لگایا ہے کہ باقی ۴۰ لاکھ عورتیں غیر زرعی پیشوں میں غیر منظم سیکٹر میں تھیں اور روزگار کے عدم تحفظ، کم سے کم معیاری اجرت کے فقدان، حد سے زیادہ کام کرکے اوقات اور فلاح و بہبود کی سہولتوں کی قطعی عدم موجودگی کا شکار تھیں ۔ ان کی مجبوریوں کا اصلی سبب ان کی تنظیم کی کمی اور ان کی حفاظت کرنے میں باضابطہ عوامی خدمات (PUB.REG-SERVICES) کی ناکامی ہے ۔ جو عورتیں مختلف صنعتوں کے لیے گھر پر کام کرتی ہیں وہ اور بھی زیادہ مختلف قسم کے استحصال کی زد میں ہیں ۔ ان صنعتوں میں جو کم سے کم اجرتیں اور کاموں کے لیے مقرر ہوئی تھیں ان پر بھی عمل نہیں ہوا ہے ۔ ابھی حال میں حکومت نے اس سیکٹر میں (CONTRACT LABOUR REGULATION AND ABOLITION ACT 1970) بیڑی اور سگریٹ (شرائط روزگار ایکٹ ۱۹۶۶ اور مختلف " ریاستی قوانین " کے ذریعہ دکانوں اور تجارتی اداروں میں کام کے حالات کو باضابطہ بنانے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ صرف طاقتور مزدور تنظیموں اور ایک ہوشیار و مستعد نفاذی مشینری کی مدد سے ہی موثر ہو سکتی ہیں ۔

ان صنعتوں میں عورتوں کی معذوریوں کا مظہر ہے ۔ ان کی جہالت ، روزگار حاصل کرنے کے لیے درمیانی لوگوں پر ان کا مجبورانہ انحصار اور ان ایجنسیوں یا قوانین سے ناواقفیت

جو ان کو تحفظ عطا کر سکتے ہیں اور ان کے ساتھ منصفانہ سلوک کر سکتے ہیں۔ ان صنعتوں کی تنظیم کے نمونوں کا تنوع (جن کا سلسلہ ورک شاپوں سے لیکر ان افراد تک پھیلا ہوا ہے جو مختصر مدت کے روزگار کے تحت کام کرتے ہیں اور مقررہ مدت میں بڑی تیزی سے مال کی تیاری کرتے ہیں) مختلف قسم کے مزدوروں کو منظم کرنے میں ہی نہیں بلکہ ان کی تمیز وشناخت میں بھی دشواریاں پیدا کرتا ہے۔ ان مزدور عورتوں کی زندگی جو روٹی کی سطح پر قائم ہوتی ہے اور ان کی یہ کیفیت کہ وہ اپنے آقاؤں یا ٹھیکہ داروں کی مقروض رہتی ہیں۔ یہ ایسی چیزیں ہیں جو ان کو تمام اقسام کے استحصال کی زد پر رکھتی ہیں۔

ان مسائل کا کوئی باقاعدہ یا جامع مطالعہ نہ ہونے کی صورت میں ہم صرف اتنا کر سکتے ہیں کہ مندرجہ ذیل پیراگرافوں میں پیش کردہ چند مثالوں کے ذریعہ اس سیکٹر کی اجیر اور ذاتی روزگار کرنے والی عورتوں کے بعض خصوصی مسائل کا ایک تجزیہ کرنے کی کوشش کریں۔

تعمیرات کی صنعت تعمیرات کی صنعت جس میں ٹھیکہ کے مزدوروں کی حیثیت سے عورتوں کی ایک بڑی تعداد روزگار حاصل کرتی ہے۔ ان کام کرنے والی عورتوں کے حالات کی ایک خاص مثال فراہم کرتی ہے۔ جن میں زیادہ تر وہ عورتیں ہیں جو ہاتھ کی غیر ہنر مندانہ محنت کرنے والوں کی حیثیت سے کام پر لگائی جاتی ہیں۔ دو مطالعے جو ہماری تحریک پر دہلی اور بہار میں لیے گئے ان کی رپورٹ سے یہ معلوم ہوا کہ عورتوں اور مردوں کی اجرت میں امتیاز برتا جاتا ہے۔ ادائیگیوں میں تاخیر اور ٹال مٹول ہوتی ہے۔ عام طور پر ٹھیکہ دار یا منشی ٹھیکہ دار کوئی وجہ بتائے بغیر جرمانے کرتے ہیں اور اجرت میں سے وضع کر لیتے ہیں۔ نیز یہ کہ مزدور عورتیں ان لوگوں کی بہت مقروض رہتی ہیں۔ یہ عورتیں زیادہ تر دیہی غریب طبقے سے متعلق ہوتی ہیں اور ان کی کمائی خاندان کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ ہوتی ہے۔ ہم نے نمونے کے طور پر جن عورتوں کو لیا تھا ان میں سے تقریباً ۸۰ فیصد عورتیں نو عمر اور ۲۵ سال سے نیچے تھیں۔ جنھوں نے بچپن کے ابتدائی ایام سے ہی اجیر مزدوروں کی حیثیت سے اپنی محنت کشانہ زندگی شروع کی تھی اور ان میں سے

۹۸ فیصد عورتیں ناخواندہ تھیں ۔ ان میں سے بیشتر کی شادی بچپن میں ہو گئی تھی ۔ اس طرح کی مزدور عورتوں میں شیرخوار بچوں کی موت کی شرح بہت اونچی ہے ۔ زچگی کے زمانے کی راحت اور صحت کے متعلق قلیل ترین سہولتیں بھی موجود نہ ہونے کی حالت میں اور اس کے ساتھ ساتھ مسلسل ناقص غذا کی وجہ سے ان محنت کش عورتوں کی متوقع عمر اب بھی کم ہی ہے ۔ اس مطالعہ سے یہ امر بھی معقول و منصفانہ اجرتوں ۔ رہائشی انتظامات اور صحت و صفائی کی خدمات نیز بچوں کی پرورش گاہوں جیسی فلاحی سہولتوں کے متعلق ٹھیکہ دار لوگ حکومت کے سامنے اپنی ذمہ داریاں تو قبول کر لیتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان چیزوں کو فراہم کرنے کی تقریباً کچھ بھی کوشش نہیں کی جاتی ۔ حکومت نے بھی جس نے ٹھیکہ میں ان شرائط پر اصرار کیا تھا کوئی عمل درآمد کرانے والا ذریعہ فراہم نہیں کیا ہے ۔

۲۔ بیڑی کی صنعت ہندوستان میں بیڑی کی صنعت کاریگروں کا سب سے زیادہ خون چوسنے والی صنعتوں میں بدنام ہے ۔ ورک شاپوں اور اپنے گھروں دونوں ہی جگہ کام کرنے والی عورتوں اور بچوں کے حالات کو دیکھ کر کمیٹی دہشت زدہ ہو کر رہ گئی ۔ اکثر ان کی اجرت مختلف ترکیبوں سے کاٹ لی جاتی ہے سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے کا خیر مقدم کرتے ہوئے "بیڑی اور سگرٹ ایکٹ" اور زچگی کے زمانے کی راحت کے متعلق قانونی دفعات کو گھر پر کام کرنے والی کاریگر عورتوں پر بھی قابل اطلاق قرار دیا گیا ہے ۔ ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس مقصد کے لیے ایک خاص مشینری یا نظام تخلیق کرنا ضروری ہے جس کے بغیر اس فیصلے کو نافذ کرنا ناممکن ہو گا ۔

۳۔ چکن کی صنعت اس صنعت میں کام کرنے والوں میں تقریباً ۹۷ فیصد عورتیں ہیں اور ان میں وہ عورتیں شامل ہیں جو ٹھیکے پر کام کرتی ہیں (۸ ، ۹۵) فیصد) ، جو ذاتی روزگار اور ٹھیکہ کا ملا جلا کام کرتی ہیں (۶ ، ۳ فیصد) اور مٹھی بھر وہ عورتیں جو براہ راست ملازم ہیں اور زیادہ تر درمیانی لوگوں کے ذریعہ بھرتی کی گئی ہیں ۔ چکن کا کام کرنے والی زیادہ تر مسلمان جاہل عورتیں ہیں ، جن کا پردہ درمیانی لوگوں پر ان کے انحصار کا باعث ہوتا ہے ۔ ان کاریگر عورتوں کی اکثریت

مفلسی کی سطح سے نیچے زندگی بسر کرتی ہے ان میں ایک بڑی تعداد ان عورتوں کی ہے، جو بیوہ ہیں۔ یا جن کی شوہر سے علٰحدگی ہوگئی ہے۔ اور وہ اپنے خاندان کا بار اٹھا رہی ہیں۔ درمیانی لوگ جن کا پیداوار اور بازاری خرید و فروخت پر کنٹرول ہے روایتی مہاجن ہوتے ہیں۔ تھوک کے بیوپاریوں کو منافع ۶۰ فیصد سے ۷۰ فیصد تک ہوتا ہے۔ سرکاری ایجنسیوں کی طرف سے اجرتیں ادا کی جاتی ہیں اور وہ اجرتیں جو تھوک کے بیوپاری دیتے ہیں ان کے درمیان ۲۰ فیصدی سے ۳۰ فیصدی تک کا فرق ہوتا ہے ہم نے جن عورتوں کا انٹرویو لیا انھوں نے ہم سے یہ شکایت کی ہے کہ ان کی اجرتوں میں کٹوتی نہ صرف درمیانی لوگ ہی کرتے ہیں بلکہ کواپریٹو سوسائٹیاں اور رضاکار تنظیمیں تک بھی ایسا کرتی ہیں جو ان کی بنائی ہوئی چیزوں کی بازاری فروخت کرتی ہیں۔ ذاتی روزگار کے لیے ان کی خواہش سرمایہ اور تعلیم کے فقدان اور بازار کے نا قابل رسائی ہونے کی وجہ سے پوری نہیں ہو سکتی جو کہ اب اعلیٰ درجہ کا دباری نظام اختیار کر گیا ہے۔*

۴۔ ذاتی روزگار پیداوار اور بازاری فروخت دونوں کے کاروباری نظام میں داخل ہو جانے اور درمیانی لوگوں کے ابھر آنے کی وجہ سے ان عورتوں کی ایک بڑی تعداد کو مصیبت و صعوبت پہنچی ہے جو کہ اس سے پہلے مال تیار کرنے والوں یا خردہ فروشوں کی حیثیت سے ذاتی روزگار میں مصروف تھیں۔ بیروزگاری کے تیز رفتار اضافہ کے نتیجہ میں ذاتی روزگار کو فروغ دینے کی ضرورت پر زور دیا جانے لگا ہے اور حکومت بھی تربیت اور قرض کی سہولتوں کے ذریعہ امداد فراہم کرتی ہے۔ ہمارا تجربہ یہ ہے کہ خود اپنے طور پر روزگار یا مزدوری کرنے کا طریقہ صرف وہاں کامیاب ہو سکتا ہے جہاں عورتیں خود اپنی بنائی ہوئی چیزیں بازار میں لانے کی پوزیشن میں ہیں جیسے سنی آپور میں جہاں اس چیز کو عورتوں کی مارکٹ کے ذریعہ

---

* اصل رپورٹ میں جمعداروں، جنتروں، گھریلو نوکروں سلے سلائے کپڑے کی صنعت کے کاریگروں روزانہ اجرت پر کام کرنے والوں، یا کبھی کبھی مزدوری کرنے والوں کے متعلق بھی ایسی ہی مثالیں دی گئی ہیں۔ لیکن جگہ کی کمی کی وجہ سے ان کو یہاں نقل نہیں کیا گیا ہے۔

ایک ادارے کا رنگ دیدیا گیا ہے۔ کہیں بھی وہ اس مقصد کے لیے درمیانی لوگوں کی محتاج ہوجاتی ہیں۔ ان کا منافع بہت ہی حقیر رہ جاتا ہے۔ سڑنے سے محفوظ رہنے والی اشیائے خوردنی۔ دستکاریوں کی چیزیں۔ لباس وغیرہ جیسے مال کی تیاری میں ذاتی روزگار کو ترقی دینے کے لیے فلاحی تنظیموں کی کوششیں اکثر فروخت بازاری کے نظام پر کنٹرول کے فقدان کے باعث ناکام ہوجاتی ہیں۔ ناخواندگی، وسائل کی کمی اور بازاری فروخت کے نئے طریقوں اور بکری بڑھانے کی ٹکنیک سے واقفیت کی بنا پر ذاتی روزگار کے سلسلے میں عورتوں کی کوششیں اچھے نتائج پیدا نہیں کرسکتیں بنک جیسی قرض دینے والی ایجنسیاں عورتوں کے خلاف امتیاز برتتی ہیں کیونکہ ان کے لیے خطرہ مول لینے میں نقصان کا تصور کیا جاتا ہے۔ ہماری رائے میں عورتوں کے درمیان ذاتی روزگار پیدا کرنے کے ایک پروگرام کے لیے یہ ضروری ہے کہ تربیت، مال کی تیاری اور بازاری فروخت کے ایک باہم پیوستہ نظام پر مبنی ہو۔ اور اس پروگرام کو وسایل اور بازاری فروخت کے امکانات کی مناسبت سے تیار کرنا چاہیے موجودہ پروگرام ایک شہری جائداد کی نمایش کا رجحان رکھتے ہیں۔ ان عورتوں کی روزگاری ضروریات کو پورا نہیں کرسکتے۔ جو گردو درگردہ دیہات اور چھوٹے شہروں میں رہتی ہیں۔

۳۔ منظم سیکٹر کی عورتیں

عمومی۔ اس سیکٹر میں سب سرکاری سیکٹر کے ادارے اور غیر زرعی نجی سیکٹر کے ادارے شامل ہیں جن میں دس یا اس سے زیادہ لوگ کام کرتے ہیں۔ یہ سیکٹر قوانین اور ضابطوں کے تحت کام کرتا ہے اور ان میں کام کرنے والے لوگوں کے بارے میں مفصل معلومات وزارت محنت پابندی کے ساتھ جمع کرتی ہے۔ اس سیکٹر میں کام کرنے والی عورتوں کی تعداد جو ۱۹۶۲ میں ۱۳لاکھ ۷۰ ہزار تھی۔ بڑھ کر ۱۹۷۲ میں ۲۱لاکھ ۴۰ہزار ہوگئی ہے۔ یعنی اس میں ۵۶ء۳ فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔ اگرچہ یہ اضافہ اس سیکٹر میں روزگار کے مجموعی اضافہ سے زیادہ تیزی سے ہوا۔ لیکن مجموعی روزگار میں عورتوں کا تناسب اس مدت کے دوران ۱۱فیصد پر تقریباً مستقل طور

سے قائم رہا ہے۔ اس سیکٹر کا سائز مستقل بڑھ رہا ہے۔ برسرِ روزگار عورتیں ۱۹۷۱ میں کام کرنے والی عورتوں کی کل تعداد کا صرف ۶ فیصد تھیں جن میں سے ۲۶ء۷ فیصد صنعتوں میں اور ۴۳ء۳ فیصد دوسرے پیشوں اور ملازمتوں میں تھیں۔ پبلک یا سرکاری سیکٹر میں کام کرنے والی عورتوں کی تعداد ۱۱۰ء۱۴ فیصد بڑھ گئی۔ لیکن نجی سیکٹر میں یہ اضافہ صرف ۲۶ء۹ فیصد ہی ہوا۔ اس مدت کے دوران سرکاری یا پبلک سیکٹر میں عورتوں کا تناسب ۳۵ فیصد سے بڑھ کر ۴۷ فیصد ہو گیا ہے۔ جبکہ نجی یا پرائیویٹ سیکٹر میں ان کا حصہ ۶۵ فیصد سے کم ہو کر ۵۲ء۸ فیصد ہو گیا۔ پبلک سیکٹر میں ان کے روزگار کا حصہ ریاستی حکومتیں، مقامی انتظامی جماعتیں اور پبلک ادارے فراہم کرتے ہیں۔ مرکزی حکومت میں ان کی حالت کچھ زیادہ اطمینان بخش نہیں ہے۔

صنعت۔ اگرچہ فیکٹریوں میں کام کرنے والوں کی مجموعی تعداد برابر بڑھ رہی ہے تاہم اس سیکٹر میں کام کرنے والی عورتوں کی تعداد ۱۹۶۴ سے کم ہو گئی ہے۔ چنانچہ ۱۹۵۱ میں ان کا حصہ ۱۱ء۴۳ فیصد تھا۔ جو ۱۹۷۱ میں ۹ء۱۰ فیصد رہ گیا۔ یعنی ۲۱ء۷ فیصد کی کمی ہو گئی۔ کانوں میں ۱۹۵۱ اور ۱۹۷۱ کے دوران کام کرنے والی عورتوں کی تعداد ۱۰۹۰۰۰ سے کم ہو کر ۷۵۰۰۰ رہ گئی۔ جبکہ کل کام کرنے والوں کی تعداد ۵۴۹۰۰۰ سے بڑھ کر ۷۳۴۰۰۰ ہو گئی۔ روزگار میں عورتوں کا حصہ ۲۱ء۱ فیصد سے کم ہو کر ۱۱ء۹ فیصد رہ گیا۔ یعنی ۴۷ء۴ فیصد کی کمی ہو گئی اور سب سے زیادہ یہ کمی کوئلے کی کانوں میں ہوئی۔ یعنی ۵۵۰۰۰ سے ۲۰۰۰۰۔ چائے وغیرہ کے باغات جن میں مخصوص مقاصد کے لیے مزدور عورتوں کی ضرورت ہوتی ہے، اس واحد سیکٹر کی حیثیت رکھتے ہیں جس میں عورتوں کا روزگار ایک مقام پر برقرار رہا ہے یا اس مدت کے دوران خفیف سا اضافہ ہوا ہے۔ (۱۹۵۴ اور ۱۹۶۲ کے درمیان چائے کے باغات میں عورتوں کی تعداد ۲۵۰۰۰۰ سے بڑھ کر ۲۷۰۰۰۰ ہو گئی جس سے ان باغات میں مزدوروں کی کل تعداد کے ۴۲ء۱۱ فیصد سے لیکر ۴۹ء۲۲ فیصد تک کا اضافہ ظاہر ہوتا ہے۔ اسی طرح کے حاشیائی اضافے قہوہ اور ربڑ کے باغات میں بھی ہوئے ہیں)۔

صنعتوں اور کارخانوں میں عورتوں کے کم ہوتے ہوئے روزگار کا رجحان عام طور پر جن چیزوں سے منسوب کیا جاتا ہے وہ عورتوں کے لیے محنت و مزدوری کے حفاظتی قوانین کے مضرت رساں اثرات ۔ اجرتوں کو مساوی بنانے کی پالیسی اور معیشت کے ڈھانچے میں تبدیلیاں ۔جن کے نتیجے میں پیداوار کے طریقوں کو جدید رنگ دینے اور قومیانے پر زور دیا جانے لگا ہے ۔ ہم نے ان مفروضوں کی صحت کو بہت کچھ تفصیل کے ساتھ کچھ خاص صنعتوں کے واقعی حالات لے کر جانچا اور پرکھا ہے ۔ ہمارے خیال میں پہلے دو مفروضے بے بنیاد ہیں اور صرف عورتوں کو روزگار نہ دینے کا جواز پیش کرنے کی کوشش سے پیدا ہوئے ہیں ۔ تحقیق سے یہ پتہ چلا ہے کہ زچگی کے زمانے کے بھتے وظیفے وغیرہ یا بچوں کی پرورش گاہیں اور جداگانہ صحت و صفائی کی سہولتیں ایسی چیزیں ہیں جن کو مستقل کام کرنے والی عورتوں کے لیے قانون ضروری قرار دیتا ہے لیکن ادارے کے بجٹ میں ان چیزوں پر خرچ کی جو رقم رکھی جاتی ہے ، وہ ناقابل لحاظ حد تک قلیل اور برائے نام ہوتی ہے ۔ علاوہ ازیں ان علاقوں میں جو "ملازمین کی سرکاری بیمہ اسکیم" (EMPLOYEE'S STATE INSURANCE SCHEME) کے تحت آتے ہیں زچگی کے زمانے کے بھتوں ، وظیفوں وغیرہ کا بار اب مالکوں اور آجروں پر نہیں پڑتا ہے ۔ ایک مطالعہ نے جو کچھ آئی ۔ ایل ۔ او (I L O) اور نیشنل کمیشن "برائے محنت" نے کیا ہے ، اس دلیل کو رد کر دیا کہ صنعتوں میں عورتوں کی تخفیف کا سبب زچگی کے بھتوں ، وظیفوں وغیرہ پر ہونے والا خرچ ہے ۔ اسی طرح یہ دلیل کہ رات کے وقت کام پر پابندی لگنے سے عورتوں کے روزگار پر خراب اثر پڑا ہے ۔ صرف ان چند صنعتوں پر قابل اطلاق ہو سکتی ہے ، جنہوں نے کئی کئی شفٹوں والا نظام اختیار کیا ہے ۔ اس سلسلے میں وہ دو مختلف رائیں ہمارے سامنے آئیں ۔ کچھ مالکوں اور ٹریڈ یونینوں کے تھوڑے سے نمائندوں نے یہ تجویز کیا کہ کام کے اوقات ۱۰ بجے رات تک بڑھانے کی اجازت اگر تمام صنعتوں کے لیے قابل حصول کر دی جائے تو اس سے عورتیں دو شفٹوں پر کام کر سکیں گی اور عورتوں کی تخفیف کرنے کا موجودہ عذر دور ہو جائے گا ۔ دوسرے نقطۂ نظر نے جو کہ ٹریڈ یونینوں ، لیبر افسروں اور ماہروں

نے پیش کیا، یہ بیان کیا کہ کارخانوں میں جو کام عورتیں کرتی ہیں ان میں سے بیشتر کام حتیٰ کہ کپڑا تیار کرنے والی جیسی صنعتوں میں بھی دن کے وقت کیے جاتے ہیں۔ چونکہ کام کا وقت دس بجے رات تک بڑھانے کی اجازت ریاستی حکومتیں مخصوص صنعتوں کو ان کی درخواست پر دیدیتی ہیں۔ اس لیے اس میں تقریباً کچھ بھی شک وشبہ نہیں کہ یہ قانون کی پابندی عورتوں کو روزگار دینے کی راہ میں ایک سنگین رکاوٹ کی حیثیت نہیں رکھتی۔ اگرچہ خطرناک کاموں خصوصاً بوجھ اٹھانے پر لگی ہوئی ممانعت نے ایک خاص حد تک جوٹ کی صنعت میں عورتوں کے روزگار کو متاثر کیا ہے۔ یہ رائے کہ زیر زمین کام پر لگی ہوئی ممانعت کانوں میں عورتوں کے روزگار کے انحطاط کا ذمہ دار ابتدائی و بنیادی عنصر ہے قبول نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ کانوں میں مزدور عورتوں کی تعداد میں تخفیف اس قانون کے بننے سے بہت پہلے شروع ہوگئی تھی۔

سرکاری ایجنسیاں اس کا اعتراف کرتی ہیں کہ اس چیز کا کوئی اندازہ اور یقین نہیں کیا گیا ہے کہ مساوی اجرت کے اصول کا نتیجہ کسی حد تک مزدور عورتوں کی علیحدگی کی صورت میں نمودار ہوا ہے۔ لیکن مختلف صنعتوں کو جانچنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ اجرتوں کو مساوی کرنے کے اصول پر زیادہ تر صنعتوں پر عمل نہیں ہوا ہے۔ جوکہ مسلسل طور پر بالواسطہ یا بلا واسطہ طریقوں سے اجرت میں تفریقات کو برقرار رکھتے ہوئے ہیں۔ اس کا ثبوت وزارت محنت کے "پیشہ ورانہ اجرتوں کے جائزوں"[5] OCCUPATIONAL WAGE SURVEYS میں دستیاب ہوتا ہے۔ جوکہ یہ بتاتے ہیں کہ بیشتر صنعتوں میں عورتیں جو کچھ کماتی ہیں اس کی کم سے کم، زیادہ سے زیادہ اور اوسط مقدار میں فرق پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ اس مطالعہ نے یہ رپورٹ پیش کی کہ ایک ہی ادارے میں ایک ہی قسم کے کاموں کے لیے مردوں اور عورتوں کو روزگار نہ دے کر مالکان اس اصول سے پہلو تہی کرتے ہیں تاہم ہمیں بعض حالات میں تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ اجرتوں کی تفریقات ایک ہی ادارے میں معلوم ہوئیں۔ اس اصول سے بچنے کا زیادہ کامیاب طریقہ یہ ہے کہ کچھ کاموں تک عورتوں کو محدود کر دیا جاتا ہے اور ان کاموں کی اجرت کی شرح کم مقرر کردی جاتی ہے۔ نمونے کے طور پر ۲۰۰ پرائیوٹ[6] اور پبلک سیکٹر[7] کے اداروں کو لے کر ہم نے ایک

مطالعہ کرایا تو یہ انکشاف ہوا کہ زیادہ تر غیر ہنرمندانہ اور نیم ہنرمندانہ کام میں
مال کی تیاری کی پست تر سطحوں پر عورتیں مرکوز تھیں۔ ہنرمندانہ سطح پر وہ صرف
بعض انجینئری، دواسازی، الیکٹرانک اور کپڑے کی صنعتوں میں پائی گئیں۔ پبلک
سیکٹر میں عورتیں نگرانی کی سطح پر بعض اعلیٰ تکنیکی صنعتوں جیسے بجلی ٹیلی کمیونی
کیشن وغیرہ میں پائی جاتی ہیں، لیکن پرائیوٹ سیکٹر میں ان کو نگرانی کی سطح پر
اپنی عدم موجودگی کا نمایاں امتیاز حاصل ہے۔ عورتوں کو معدودے چند محدود کاموں
تک پابند کر دینا جن چیزوں کا مظہر ہے وہ یہ ہیں۔ (۱) ان کی صلاحیتوں اور
فطری میلانات کے بارے میں عام سماجی رویے (۲) مالکوں اور آجروں کی مزاحمت
(۳) عورتوں کو اعلیٰ ہنرمندیوں کے سلسلے میں تربیت کے مواقع نہ دینا۔ (۴) جو
مواقع ان کو حاصل ہیں، ان کے متعلق بیشتر عورتوں کی لاعلمی۔ اس امر کے تعین
کے لیے کوئی مقررہ پالیسی یا معیار نہیں ہے کہ کون سے کام عورتوں کے لیے مناسب
یا نامناسب ہیں۔

عورتوں کی صلاحیت کا کوئی سائنسی و علمی اندازہ لگائے بغیر ان کی کم پیداآوری
اہلیت کی بنیادوں پر اجرت میں امتیاز کو قایم رکھا جاتا ہے۔ ہمیں صرف چند صنعتوں
میں زیادہ تر پبلک سیکٹر میں عورتوں کے طبعی میلان اور پیداآوری اہلیت کا
سائنسی و علمی اندازہ لگانے کا کوئی نظام نظر آیا ہے۔

اُن مخصوص صنعتوں میں صورتِ حال کا اندازہ لگانے کے بعد جہاں عورتوں
کے روزگار میں سب سے زیادہ انحطاط ہوا ہے مثلاً کپڑے اور جوٹ کی صنعتوں اور
اور کانوں کا ہمیں یہ علم ہوا ہے کہ اس انحطاط کا سب سے اہم سبب جدید کاری کے
طریقوں اور نوعیت ہے۔ جن صنعتوں نے ایک اعلیٰ تر نوعیت کی سرمایہ طلب
ٹیکنالوجی کو اختیار کر لیا ہے اور اس کے نتیجہ میں ان کو مزدوروں کو ہٹانے کی ضرورت
پڑی ہے۔ انھوں نے مردوں کے مقابلے میں عورت مزدوروں کو ہٹانا زیادہ آسان
پایا ہے۔ اس چیز کو انھوں نے اس بنیاد پر جائز قرار دیا ہے کہ عورتوں میں ہنرمندیوں
کا فقدان ہوتا ہے اور وہ جاہل ہوتی ہیں اور کام کرنے کے جدید طریقوں کو سیکھنے
پر رضامند نہیں ہوتیں۔ عام طور پر اگرچہ کام کے دوران تربیت کا موقع عورتوں

کو نہیں دیا جاتا۔ تاہم ایسا ثبوت موجود ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس طرح کی تربیت فراہم کی گئی ہے۔ وہاں عورتوں نے نئی ہنرمندیاں حاصل کرنے کا خود کو اہل ثابت کیا ہے اور چند نے تو مردوں سے بھی زیادہ باصلاحیت ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ (جیسے چند نئی صنعتوں میں) چائے وغیرہ کے باغات جیسی زیادہ محنت طلب صنعتوں میں عورتوں کو الگ نہیں کیا گیا ہے۔ اگرچہ تفریقات پھر بھی برقرار رکھے جاتے ہیں جو خالص سماجی تعصبات کی وجہ سے ہیں۔ ہم اس عام طور پر دی جانے والی دلیل کو قبول نہیں کر سکتے کہ پیشوں اور لباس کے معاملات میں عورتیں روایت پرست ہوتی ہیں۔ کیونکہ یہ دلیل جدید صنعتی مزدور عورتوں پر منطبق نہیں ہوتی، جن میں شہری اثرات اور عوامی ذرائع اثر و خبر (MASS MEDIA) کے باعث روایت پرستی کا رجحان اس سے بہت کم ہو گیا ہے جتنا کہ موجودہ صدی کے آغاز میں صنعتی مزدوروں میں پایا جاتا تھا

جہالت، روزگار کے متبادل مواقع سے لاعلمی اور تربیت کے مواقع کی عدم موجودگی کے علاوہ عورتوں کے روزگار کے انحطاط کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ملک میں عام بیروزگاری کی سطح اونچی ہوتی جارہی ہے۔ عورتوں پر نقل و حرکت کی جو پابندیاں ہیں ان سے بھی عورتوں کی مسابقت کی اہلیت متاثر ہوتی ہے۔ ان مسائل کو حکومت، مالکوں اور آجروں اور ٹریڈ یونینوں کی خاص توجہ اور خیال کی ضرورت ہو گی۔

ملازمتیں اور پیشے | وہ فوری عوامل جن کی وجہ سے عورتیں آزادی کے بعد کے دور میں غیر روایتی ملازمتوں اور پیشوں کے میدان میں نمودار ہوئی ہیں یہ ہیں:

۱۔ دستور کی طرف سے روزگار کے سلسلے میں عدم امتیاز اور مواقع کی مساوات کی ضمانت۔

۲۔ عورتوں کی تعلیمی ترقی اور اس کے نتیجہ میں تعلیم اور ملازمتوں کے ان میدانوں میں ان کا داخلہ جن پر اب تک مردوں کی اجارہ داری تھی۔

۳۔ بڑھتے ہوئے اقتصادی دباؤ کی وجہ سے شہری متوسط طبقے کے درمیان عورتوں

کے اجرت پر کام کرنے کے متعلق سماجی اقدار میں ایک بتدریج تبدیلی۔
۴۔ آزادی کے بعد کے زمانے میں جو ترقی ہوئی اس کے براہ راست نتیجے میں پبلک سیکٹر میں پیشہ ورانہ، ٹکنیکی اور استانیوں کو ملا کر متعلقہ کام کرنے والی عورتوں کے زمروں میں بر سر روزگار عورتوں کی تعداد ۱۹۶۰ سے مسلسل طور پر بڑھ رہی ہے حالانکہ کل کام کرنے والوں میں ان کا تناسب کم و بیش مستقل رہا ہے۔ انتظامیہ، عاملانہ اور منیجری کا کام کرنے والی عورتوں کی تعداد جو ۱۹۶۰ میں ۱۰،۰۰۰ تھی ۱۹۶۶ میں بڑھ کر ۱۲،۰۰۰ ہو گئی۔ لیکن ۱۹۶۸ میں اس میں کمی کا رجحان ظاہر ہوا۔ کلرکی اور اسی طرح کے دوسرے کام کرنے والوں کے زمرے میں عورتوں کی تعداد جو ۱۹۶۰ میں ۳۰،۰۰۰ تھی ۱۹۶۸ میں بڑھ کر ۷۹،۰۰۰ ہو گئی ہے۔ اسی زمانے میں کام کرنے والوں کی کل جماعت میں ان کا تناسب ۴۲،۲ فیصد سے بڑھ کر ۷،۶ فیصد ہو گیا ہے۔ ذرائع نقل و حمل، ذرائع ترسیل و رسائل اور مال گوداموں میں عورتوں کی تعداد اپنی جگہ قائم رہی ہے۔ لیکن سرکاری ملازمتوں، کھیلوں اور تفریحی مشاغل میں ان کی تعداد ۶۸-۱۹۶۰ کے دوران ۵،۰۰۰ سے بڑھ کر ۱۳،۰۰۰ ہو گئی ہے (۱،۱ فیصد سے بڑھ کر ۴،۲ فیصد ہو گئی) لیکن اس زمرے میں عورتیں خادماؤں، باورچنوں، گھر کا انتظام کرنے والی ملازماؤں کا صفائی کرنے والیوں اور چوکیدارنیوں کی حیثیت سے کام کر رہی تھیں۔ غیر ہنرمندانہ دفتری کام کرنے والی عورتوں کی تعداد ۲۵،۰۰۰ سے کم ہو کر ۱۶،۰۰۰ رہ گئی ہے۔
پرائیویٹ سیکٹر میں جن زمروں میں عورتوں کی تعداد اور ان کا تناسب دونوں ہی میں ایک مستقل اضافہ ظاہر ہوا ہے وہ یہ ہیں:
کام کرنے والے خدمت گاری۔ کھیل کود اور تفریحی قسم کا کام کرنے والے اور ابتدائی اور مڈل اسکولوں کے ٹیچر۔ ۱۹۶۳ میں تمام زمروں میں عورتوں کے روزگار میں ایک عام سرد بازاری نازل ہوئی۔ یہ انحطاط جن زمروں میں زیادہ نمایاں ہوا۔ وہ یہ تھے۔ انتظامیہ۔ عاملانہ اور منیجری کا۔ کام کرنے والی عورتیں (۵،۰۰۰ سے کم ہو کر ۱،۰۰۰ رہ گئیں) اور پیشہ ورانہ ٹکنیکل اور اسی سے متعلق کام کرنے والی عورتیں (۵۵،۰۰۰ سے کم ہو کر ۳۱،۰۰۰ رہ گئیں)۔ کچھ نئی

صنعتوں جیسے اشتہاری کمپنیوں۔ بازاری ریسرچ۔ ہوٹل کے انتظام اور کاٹج انڈسٹری میں عورتوں کو انتظامیہ عملے میں دکھا جا رہا ہے۔ روایتی صنعتوں میں عورت کو اس سطح پر ابھی تک قبول نہیں کیا گیا ہے۔

اگر چہ ملازمتوں اور پیشوں میں کام کرنے والی عورتوں کے متعلق ایک صحیح اور اعداد و شمار پر مبنی تصویر پیش کرنا مشکل ہے تاہم اس سلسلے میں جو بھی معلومات دستیاب ہیں۔ ان پر نظر ڈالنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے، کہ عورتوں کے روزگار کے مقررہ طریقہ و نمونے میں ایک تبدیلی ہو رہی ہے۔ دو قسم کے رجحان نمایاں ہیں۔

(الف) معلمی اور ڈاکٹری کے پیشوں میں عورتوں کا مرکوز ہونا اور (ب) کلرکی یا دفتری ملازمتوں میں بعض کم درجے کے کاموں کو عورتوں کے لیے خاص طور سے موزوں تسلیم کرنا ہیں۔

۱۔ معلمات ۱۔ ۱۹۷۰ء میں پیشہ ورانہ ٹیکنیکل اور متعلقہ کام کرنے والوں کی تعداد کا صرف ۷ا فیصد عورتیں تھیں جن میں سے تین چوتھائی استانیاں تھیں سائنس دانوں کے درمیان ایک بڑا حصہ سماجی سائنس دانوں کا تھا کیونکہ تحقیق کا کام اور سماجی کام عورتوں کے لیے نئے موزوں مشاغل کی حیثیت سے اب سامنے آرہے ہیں۔ منتخب پیشوں میں مردوں کے مقابلے میں عورتوں کے تناسب یہ ہیں۔

ڈاکٹر اور سرجن ۷ء۱۱ فیصد۔ وکلاء ۱ء۱ فیصد ٹیچر ۳ء۲۰ فیصد۔ نرسنگ اور صحت کی ٹیکنیکل ماہرین ۲ء۲۷ فیصد اور سائنس دان ۹ء۱۰ فیصد

استانیوں کی ۷ا فیصد تعداد ابتدائی اسکولوں میں ہے۔ اس کے بعد ہائر سکنڈری اسکولوں کا نمبر ہے۔ (۲۱ فیصد) معلمی میں عورتوں کا مرکوز ہونا مواقع اور ترجیحات دونوں ہی کا آئینہ دار ہے۔

مروجہ سماجی نظام کی خصوصیات میں عورتوں کے لیے ایک لمبی مدت کی پیشہ ورانہ تربیت جس کی انجنیری، ڈاکٹری جیسے پیشوں کے لیے ضرورت ہوتی ہو ابھی تک صرف بلندتر متوسط طبقے کی ایک چھوٹی سی اقلیت کی رسائی اس تک ہے۔ معلمی کو سماج عورتوں کے واسطے پسند کرتا ہے کیونکہ اس کے ساتھ وہ اپنے

گھریلو رول کو آسانی سے متحد کر سکتی ہیں ۔

۲۔ ڈاکٹر :- ۱۹۶۷-۶۸-۷۰ کی مدت میں طبی کام کرنے والوں کی مجموعی جماعت میں ۱۲۱۰۰۰ ڈاکٹر تھے جن میں ۱۲۰۰۰ عورتیں شامل تھیں ۔ جبکہ ۱۹۷۱ کی مردم شماری (۱ فیصد نمونے کی معلومات) کے مطابق سو مردوں کے مقابلے میں ۲۵ عورتیں اہل ڈاکٹر تھیں ۔ ان عورتوں کا تناسب جو ڈاکٹروں اور سرجنوں کی حیثیت سے برسر روزگار ہیں ۔ سو مردوں کے مقابلے میں ۲۰۱ ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکٹر عورتوں کو ان کی تعداد سے کم کام پر لگایا جارہا ہے اور یہ بھی کہ وہ روزگار کی تلاش میں دوسرے ملکوں میں چلی گئی ہیں ۔ چونکہ ان کے مریضوں میں عورتوں کی اکثریت ہوتی ہے اس لیے وہ وضع حمل کے فن اور نسوانی امراض کے علم میں خصوصی مہارت حاصل کرتی ہیں ۔ اگرچہ حالیہ زمانے میں وہ دوسرے میدانوں میں بھی داخل ہو چکی ہیں ۔ مثلاً پیڈیا ایٹرکس (PAEDIA TRICS) سرجری، پیتھالوجی (PATHOLOGY) یا ریڈیالوجی (RADIOLOGY) ان میں ۳۰ تا ۴۰ فیصد شہری علاقوں میں مرکوز ہیں ۔

۳۔ نرسیں : پچھلی چند دہائیوں میں نرسوں، مڈ وائفوں اور ہیلتھ وزیٹرز کی تعداد میں بڑی توسیع ہوئی ہے ۔ حکومت کی یقین دہانیوں کے باوجود اس پیشے کی شادی شدہ عورتوں کے خلاف امتیاز اب بھی جاری ہے ۔ خاص طور سے فوج میں جو نہ تو ان کو بھرتی کرتی ہے اور نہ زچگی کے زمانے کے بھتے وظیفے وغیرہ شادی شدہ نرسوں اور ڈاکٹروں کو دیتی ہے ۔

۴۔ وکلاء :- اگرچہ وکیل عورتوں کی تعداد بڑھ گئی ہے ۔ تاہم صرف ایک عورت ہائی کورٹ کی جج مقرر ہوئی ہے ۔ وکیل عورتوں کو عدلیہ میں مواقع کی کمی کی شکایت ہے ۔

۵۔ سماجی کارکن :- یہ نیا پیشہ ورانہ تربیت یافتہ سماجی کارکن عورتوں کی اکثریت ان اداروں اور محکموں میں کام کرتی ہے جو سماجی فلاح و بہبود کے کام میں مصروف ہیں ۔ ان میں رضا کارانہ طور پر چلنے والے ادارے بھی شامل ہیں اور سرکاری ادارے بھی ۔ ۱۹۶۸ کے ایک مطالعے کے مطابق سماجی خدمت میں

گریجویٹ نوجوانوں کی تعداد ۴۲۱۵۰ تھی جو ۱۹۷۱ میں بڑھ کر ۴۰۰۰ ہوگئی۔ جائزے میں نمونے کے طور پر جو نوجوانوں لیے گئے تھے۔ ان میں ۳۰ فیصد عورتیں تھیں۔ اس پیشے میں عورتوں کو مردوں کے مقابلے میں زیادہ آسانی سے روزگار مل جاتا ہے کیونکہ اس پیشے کی طرف اپنا ذاتی رجحان ہونے کی وجہ سے وہ اس معاملے میں انتخاب دلپسند کو کم دخل دیتی ہیں کہ ان کو کس قسم کا کام دیا جارہا ہے۔ اور کیونکہ ان میں سے زیادہ تر ابتدائی قسم کی سماجی خدمت (سوشل ورک) اور "کیمونٹی آرگنائزیشن" میں خصوصی مہارت حاصل کرتی ہیں اس پیشے میں مرد مزدوروں اور صنعت کے تعلقات پر مرکوز ہوتے ہیں جن میں روزگار ملنے کے مواقع کافی نہیں ہیں۔ اس کے باوجود کہ اس پیشے میں عورتیں بڑی تعداد میں ہیں۔ صرف چند عورتیں کلیدی عہدوں پر ہیں۔

کلرکی اور اس کے متعلق کام اس سلسلے میں تمام معلومات جو دستیاب ہیں وہ یہ ظاہر کرتی ہیں کہ استقبال کرنے والوں، کلرکوں، اسٹینو گرافروں اور ٹائپ کرنے والوں جیسے لوگوں کے کام عورتوں کو روز بروز زیادہ جذب کررہے ہیں۔ مختلف وزارتوں اور مرکزی حکومت کی دیگر ایجنسیوں سے جو معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ ان سے یہ ظاہر ہوا کہ عورتوں کی سب سے بڑی تعداد درجہ سوم کی سطح پر یعنی دفتری اور متعلقہ عملہ میں مرکوز ہے۔ اس سطح پر عورتوں کی تعداد میں اضافہ پبلک سروسوں کی کسی بھی دوسری سطح کے مقابلہ میں زیادہ تیزی سے ہوا ہے۔ وزارتوں کے موصول ہونے والے جوابات سے ایک عجیب رجحان جو نمایاں ہے وہ یہ ہے کہ سائنسی وزارتوں مثلاً ایٹمی توانائی، محکمہ سائنس اور ثقافت اور تعلیم اور سماجی فلاح و بہبود کی وزارتوں نے مختلف سطحوں پر زیادہ عورتوں کو روزگار دیا ہے جبکہ زیادہ پرانی وزارتوں نے بہت کم عورتوں کو ملازمت دی ہے۔ پبلک اور پرائیویٹ سیکٹروں کے ۲۰۰ اداروں سے جوابات موصول ہوئے ان سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ کلرکی کے یا دفتری کام میں عورتیں بڑی تعداد میں مرکوز ہیں۔ پبلک سیکٹر میں کلرکی کے کاموں میں عورتوں کا تناسب پیداوار کی سطح پر۔ ان کے تناسب سے آگے

بڑھ گیا ہے ۔ اگر ایک طرف پرائیویٹ سیکٹر میں منیجری کی سطح پر ان کی موجودگی ناقابلِ لحاظ ہے ۔ تو دوسری طرف پبلک سیکٹر میں چند عورتوں کو یہ عہدے ملے ہیں ۔

۲۔ مرکزی ملازمتیں

مرکزی ملازمتوں میں جو کہ عورت امیدواروں کو مسابقت کے لیے مساوی مواقع دیتی ہیں ۔ عورتوں کی تعداد مستقل بڑھ رہی ہے ۔ آئی ۔ اے ، ایس / آئی ۔ پی ۔ ایس / آئی ۔ الیف ۔ ایس کے امتحانات میں عورتوں اور مردوں کا تناسب جن کے تقرر کی سفارش کی گئی ۱۹۶۰ء میں ۱:۸۱۴ تھا جو کہ ۱۹۷۲ میں بڑھ کر ۱:۷۶۶ ہو گیا ۔ لیکن دوسری سروسوں جیسے کی سروس " اعداد و شمار کی سروس " " انجینیری کی سروس " میں ان کا تناسب پہلے کی طرح بہت کم ہی چلا آتا ہے ۔ غیر سرکاری طور پر ہمیں مطلع کیا گیا کہ وزارت ریلوے کی درجہ اول کی ملازمتوں میں عورتوں کو صرف حسابات (ACCOUNTS) کی اور طبی سروسوں میں قبول کیا جاتا ہے اور ٹریفک یا دوسری سروسوں میں داخل ہونے کے مواقع ان کو نہیں دیے جاتے ۔

مرکزی ملازمتوں میں عورتوں سے متعلق ایک اہم مسئلہ جو سامنے آیا وہ آئی اے ایس میں بھرتی کے قواعد کے قاعدہ (۳) ۵ کے دستوری جواز کی بابت تھا جو کہ حکومت کو اس چیز کا اختیار دیتا تھا کہ ۔ وہ کارکردگی کی بنیاد پر ایک شادی شدہ عورت افسر سے استعفیٰ طلب کر سکتی ہے ۔ اس قانون کا حوالہ ۱۹۶۷ میں ایک دواساز کمپنی نے سپریم کورٹ میں خود اپنے قواعد ملازمت کی تائید میں پیش کیا تھا جن کے تحت عورتوں کی ملازمتیں شادی کے بعد خود بخود ختم ہو جاتی تھیں ۔ عدالت نے اگرچہ متذکرہ کمپنی کے اس قاعدہ کو کالعدم کر دیا لیکن آئی ۔ اے ، ایس کے قاعدہ کی حمایت کی ۔ جس کو بہر حال بعض افسر خواتین کی مانگ کے نتیجے میں ۱۹۷۲ء میں ان قواعد سے خارج کر دیا گیا

دفتر داری کی بلند تر سطحوں پر عورتوں کے تناسب میں جو عدم مساوات کی صورتیں موجود ہیں ۔ ان کا سبب تعصبات بھی ہیں اور بھرتی کی امتیاز و تفریق کرنے والی پالیسیاں بھی اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ عورتوں میں اپنی روِشِ حیات کی

سمت کا تعین کرنے اور پابندی و ذمہ داری قبول کرنے کی اہلیت کا فقدان ہے
بہت سے پرائیویٹ اداروں اور خود پبلک سیکٹر کے بعض اداروں نے بھی ہمارے
سوالنامے کے جواب میں تسلیم کیا کہ بطور پالیسی وہ مینجری کی سطح پر عورتوں
کو بھرتی نہیں کرتے ہیں۔

اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ عورتوں کے لیے روزگار کے مواقع
تیسرے سیکٹر میں وسیع ہو گئے ہیں تاہم ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس صورت
حال کا ایک واقعہ اس تیز رفتار بالیدگی و افزائش کا پرتو ہے جو تیسرے
سیکٹر میں خصوصاً رونما ہوئی ہے اور جس کا سبب ترقی اور نشوونما کے عمل کی
تمام سطحوں پر حالیہ برسوں میں حکومت کی وسیع شدہ کارفرمائی ہے۔ وسایل کی
بڑھتی ہوئی مجبوریوں کے ساتھ غیر پیداآوری سیکٹر کی افزایش و بالیدگی ناگزیر طور
پر مستقبل قریب میں بہت سست ہو جائے گی۔ چونکہ عورتوں کے روزگار
کے لیے مواقع میں سب سے زیادہ اضافہ اسی سیکٹر میں ہوا ہے اس لیے اس
کا امکان ہے کہ اس کی افزایش پر بالیدگی کی رفتار سست ہو جانے کا نتیجہ
عورتوں کے روزگار کی تخفیف کی شکل میں ظاہر ہو گا۔ اگر عورتوں کے روزگار
کے مواقع پیداآوری سیکٹر میں نہ بڑھے تو عورتوں کے روزگار میں انحطاط
کے رجحانات کو روکنا یا موجودہ عدم توازن کو کم کرنا ممکن نہ ہو گا۔

۴۔ زیریں و بنیادی ڈھانچہ

عورتوں کے روزگار کے رجحان کا سیکٹروار جائزہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ عورتوں
کے روزگار کو متاثر کرنے والی بڑی بڑی قوتیں معیشت کے اندر مجموعی طور پر
ساخت کی تبدیلیوں سے پیدا ہوتی ہیں۔ (مثلاً روایتی بازاری معیشت کا جدید
بازاری معیشت میں بدلنا۔ سرکاری عدم مداخلت کی جگہ حکومت کے ذریعہ
آزاد منصوبہ بند ترقی۔ غیر منظم پیداوار کے بدلے منظم پیداوار۔ پیداوار کے
بے ضابطہ تعلقات کا باضابطہ تعلقات میں تبدیل ہونا۔ یا محنت طلب ٹکنالوجی
کے بدلے سرمایہ طلب ٹیکنالوجی۔) نیز سماجی معاشی نابرابریوں کے شدید ہو جانے

سے پیدا ہوتی ہیں۔

چونکہ عورتیں جن کو نسبتاً کم مواقع حاصل ہیں ایک غیر محفوظ نقصان پذیر گروپ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس لیے ان پر مردوں سے زیادہ خراب اثر پڑا ہے۔ اس صورت حال میں کچھ اصلاح ہوگی یا مزید خرابی، یہ بات منحصر ہے اس زیریں و بنیادی ڈھانچے کی سطح اور وسعت پر جو کہ فراہم کیا جائیگا۔ اس میں تعلیم پیشہ ورانہ اور تکنیکی تربیت اور دوسری کئی اہم اور خصوصی تدابیر شامل ہوں گی جن کا مقصد یہ ہوگا کہ گھرستنوں اور ماؤں کی حیثیت سے عورتوں کی جو خصوصی ضروریات ہوتی ہیں ان کے ساتھ عورتوں کے روزگار میں مطابقت پیدا کی جا سکے اور امتیاز و استحصال کو روکا جا سکے۔ ان میں سے نسبتاً زیادہ اہم چیزوں پر مندرجہ ذیل پیراگرافوں میں بحث کی گئی ہے:۔

تعلیم پیداوار، سرمایہ کاری، بازارکاری اور منصوبہ بندی کے جدید طریقوں کی پیچیدگی، علم اور ہنرمندیوں کی ایک زیادہ بلند سطح کا مطالبہ کرتی ہے اور تعلیم کی اہمیت میں اضافہ کرتی ہے۔ آزادی کے بعد تعلیمی مواقع میں جو اضافہ ہوا ہے جس کی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے۔ وہ عورتوں کے درمیان خصوصاً ابتدائی اور ثانوی سطح پر نسبتاً کمتر رہا ہے۔ ثانوی اور اعلیٰ تر تعلیم عملی طور پر شہری متوسط طبقے تک محدود ہے۔ ناخواندہ مردوں کے مقابلے میں ناخواندہ عورتوں کی تعداد کہیں زیادہ ہوگئی۔ اور بلا قید و بند بڑھتی چلی گئی۔ تعلیمی ترقی کا انداز ناگزیر طور پر ان کے معاشی مواقع پر اثرانداز ہوا۔ اگر تعلیم یافتہ عورتوں کے لیے روزگار کے مواقع بڑھ گئے تو اسی کے ساتھ ساتھ ناخواندہ اور نیم خواندہ عورتوں کی شرکت کی شرح میں ایک منفی رجحان پیدا ہوا، جن کا روزگار میں حصہ کم ہو گیا۔ ۱۹۶۱ء اور ۱۹۷۱ء کے درمیان ناخواندہ عورتوں کی کام میں شرکت کی شرح شہری علاقوں میں ۸۱ر۱ فیصد سے گھٹ کر ۶۵ر۸ فیصد اور دیہی علاقوں میں ۹۵ر۶ فیصد سے کم ہوکر ۹۲ر۱ فیصد ہو گئی۔ یہ چیز کام کرنے والی عورتوں کے درمیان تعلیم کی بلند ہوتی ہوئی سطح کی علامت نہیں ہے۔ کیونکہ تعلیم کسی بھی اہم طریقے پر ان مانع

ناخواندہ عورتوں کے زبردست گروہوں میں نفوذ پانے میں ناکام رہی ہے جن کا تعلق آبادی کے اس غریب ترین طبقے سے ہے جہاں روزگار ایک ہولناک اور ناگزیر ضرورت ہے۔ دوسری طرف محنت کش عورتوں کی جماعت کی تعلیمی ساخت و ترکیب میں یہ تبدیلی ظاہر کرتی ہے کہ عورتوں کا یہ طبقہ زیادہ تر غیر منظم صنعتوں اور دوسرے غیر زرعی پیشوں سے الگ ہو گیا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ جدید تکنیکی منڈیوں کی بڑھتی ہوئی مانگ کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے کہ ڈپلوما حاصل کرنے والوں کی شرکت کی شرح ۷.۱ فیصد سے بڑھ کر ۳.۲ فیصد ہو گئی ہے۔ تکنیکی طور پر اہلیت یافتہ عورتوں کی اکثریت برسر روزگار پائی جاتی ہے اور صرف ۱.۲ فیصد عورتیں اپنے طور پر کام کرتی ہیں۔ ڈگری یافتہ اور تکنیکی کام کرنے والی عورتوں میں صرف ۴.۵ فیصد خود اپنے طور پر کام کرتی ہیں۔ ۵۰ فیصد پبلک سیکٹر میں برسر روزگار ہیں اور ۶.۴ ، ۳۶ فیصد پرائیویٹ سیکٹر میں

جو عورتیں ڈاکٹری اور معلمی کے شعبوں میں استعداد حاصل کرتی ہیں۔ وہ اسے اپنا ذریعۂ معاش بناتی ہیں اور ایسی عورتوں اور ان کی ہی قسم کے مردوں کے درمیان شرکت کی شرح میں ۲۰ فیصد سے زیادہ فرق نہیں ہے۔ وہ عورتیں جو اسکولی معلمی محنت اور سماجی فلاح۔ مہتمم کتب خانہ اور مہتمم محافظ خانہ۔ دیہی افسران اور ڈاکٹر اور سرجن کے پیشوں میں برسر روزگار ہوتی ہیں۔ ان میں مردوں کے مقابلے میں زیادہ صلاحیت و قابلیت پائی جاتی ہے

ایمپلائمنٹ ایکسچینج کے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۶۸ اور ۱۹۶۴ کے درمیان روزگار تلاش کرنے والی عورتوں کی تعداد ۷۱ فیصد بڑھی ہے جبکہ مردوں کی صرف ۱۴ فیصد بڑھی ہے۔ میٹرک پاس یا اعلیٰ تعلیم یافتہ روزگار کے متلاشیوں میں یہ اضافہ عورتوں کی تعداد میں ۱۱۶ فیصد اور مردوں میں ۴۷ فیصد تھا۔ تعلیم یافتہ روزگار کے متلاشیوں کے تمام زمروں میں عورتوں کی بے روزگاری کی مدت مردوں کے مقابلے میں زیادہ طویل ہے سوائے نرسنگ اور ڈاکٹری کے جہاں پوسٹ گریجویٹ استعداد کے مردوں کی مدت انتظار عورتوں سے زیادہ ہے۔

"سائنسی اور صنعتی تحقیق کی کونسل" (I.C.S.& I.R.)
نے* ۱۹۷۱ء میں ایک مطالعہ کیا تھا جس نے یہ انکشاف کیا تھا کہ ۲۳،۰۰۰ ڈگری یافتہ عورتوں میں سے صرف ۱۵،۰۰۰ عورتیں برسرروزگار تھیں جو کہ ملک میں کل کام کرنے والی عورتوں کا صرف ۳ فیصد ہوئیں۔ اس گروپ کی تقریباً ۴۲ فیصد عورتیں ۵۰۰ روپے ماہانہ سے کم کماتی تھیں اور ۱۷ فیصد ۵۰۰ روپیہ اور ۱۰۰۰ روپیہ ماہانہ کے درمیان۔ کل گریجویٹ بیکار عورتوں میں سے صرف ۱۱،۰۰۰ تلاش معاش میں تھیں۔ ان عورتوں میں جو روزگار کی متلاشی نہیں تھیں۔ ۵۵ فیصد غیر سائنسی گریجویٹ، ۱۰ فیصد سائنس گریجویٹ ۱۸ فیصد ٹکنیکی اور انجینرنگ کی گریجویٹ اور ۹ فیصد دیگر پیشہ ورانہ نصابات میں گریجویٹ تھیں۔

یہ چیز عورتوں کی تعلیم اور روزگار کے باہمی تعلق میں ایک الٹی اور متناقص کیفیت پیش کرتی ہے۔ اگر ایک طرف جہالت و ناخواندگی بہت سی ضرورت مند عورتوں کو روزگار سے باہر دھکیل دیتی ہے تو دوسری طرف تعلیم اُن کو لازمی طور پر روزگار کی طرف نہیں لے جاتی۔ ایک ایسی معیشت جس کی کام کرنے کے قابل عمر رکھنے والے مردوں کو جذب کرنے کی صلاحیت پر حد سے زیادہ بوجھ پڑا ہوا ہو۔ اس بات کی حوصلہ افزائی نہیں کرتی کہ عورتوں کی اقتصادی سرگرمی کے خلاف امتیاز و تفریق کی روایتی شکلوں کو ختم کردیا جائے۔ پورے اور مکمل پیداور اور آزادی کے ساتھ انتخاب کیے ہوئے روزگار کے لیے کافی مواقع کی نیز سہارا دینے والے اداروں کی غیر موجودگی میں بہت سی عورتیں مسابقت کے دباؤ سے گریز کرنے کو ترجیح دیتی ہیں اور عورتوں کی اقتصادی سرگرمی کے خلاف موجودہ امتیازی رویوں کو تقویت پہونچاتی ہیں۔ چونکہ تعلیم یافتہ عورتوں کی اکثریت متوسط طبقوں کے خاندانوں سے آتی ہے جہاں عورتوں کے روزگار کے متعلق سب سے زیادہ سخت پابندی آمیز رویہ قائم تھا اس لیے تعلیم یافتہ عورتوں کے ایک بڑے طبقے نے ان رویوں کو قبول کرنے کا سلسلہ جاری رکھا ہے اگرچہ بڑھتے ہوئے

---

* کمیٹی کی رپورٹ میں بیکاری کے سلسلے میں اس کا حوالہ دیا گیا ہے۔

اقتصادی دباؤ نے ان بہت سے افراد کے ذہن و فکر میں ایک تبدیلی پیدا کردی ہو
جو متوسط طبقہ کے اقتصادی طور پر کم محفوظ حصّے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان سہارا
دینے والے اداروں کی عدم موجودگی نے جو کہ گھرستنوں اور ماؤں کی حیثیت سے
عورتوں کے فرائض پر توجہ دیتے ہیں عورتوں پر ایسی مجبوریاں اور معذوریاں مسلّط کر
دی ہیں جن کو تنہا تعلیم دور نہیں کر سکتی۔

پیشہ ورانہ اور تکنیکی تربیت

ماہرین کی جماعتیں جیسے "آئی۔ ایل۔ او"، "دی نیشنل
کمیشن آف لیبر" "دی آل انڈیا کمیشن کونسل
فار ٹکنیکل ایجوکیشن" اور "ایجوکیشن کمیشن" بار بار اسی پر زور دے چکی ہیں کہ تعلیم اور
خصوصاً پیشہ ورانہ تربیت میں اور روزگار کے واقعی مواقع اور نفری طاقت کی
ضروریات میں تعلق پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ معیشت میں ساخت اور تکنیک
کی تبدیلیوں کے ذریعہ عورتوں کی اس سے وسیع پیمانے پر علیحدگی کو روکنے کے لیے
ان کی پیشہ ورانہ تربیت پر زور دینا ایک ایسی ضرورت ہے جو بالکل بدیہی ہے
اور ماہرین کی متعدد مختلف جماعتیں اس کی طرف توجہ دلا چکی ہیں۔ تاہم یہ بات
قابلِ افسوس ہے کہ ادھر چند سالوں میں عورتوں کے لیے تربیت کی جو سہولتیں پیدا کی گئیں ہیں،
ان میں چند مخصوص پیشوں کے لیے عورتوں کی موزونیت کے متعلق موجود سماجی عصبیت کا اظہار
ہوتا ہے اور ان کے نتیجے میں عورتوں کا حد سے زیادہ اجتماع نصابات کے ایک محدود گروپ میں ہوجاتا ہے۔

۱۔ روزگار کے ساتھ تربیت

بعض جدید صنعتیں جیسے الیکٹرانک، سادہ
انجینئرنگ اور ٹیلی کمیونی کیشن، نسبتاً بلند تر
تعلیمی استعداد کی عورتوں کو تربیت دورانِ روزگار فراہم کرتی ہیں۔ اس سب
کے باوجود عورتوں اور مردوں کے تربیت کے مواقع میں مجموعی طور پر عدم مساوات
بہت نمایاں ہے۔[۹] "اپرینٹس ایکٹ" ۱۹۶۱ء کے تحت جن ۵۲,۵۰۰ کار آموزامید
واروں کو تربیت دی گئی ہے ان میں صرف ۱۰۴۰ عورتیں ہیں اور وہ ۱۱ پیشوں میں
محدود ہیں، جن میں سے اکثریت جلد سازی۔ چھاپے کے حروف کی دستی تربیت
اور عام دفتری کاموں میں مرکوز ہے۔ ٹریڈ یونینوں کے نمائندوں نے یہ بتایا ہے
کہ نئی مشینوں کو استعمال کرنے کی جو تربیت مختلف صنعتوں میں کام کرنے والوں

کو فراہم کی جاتی ہے وہ عورتوں کو شاذو نادر ہی دی جاتی ہے ۔

۲۔ قبل روزگار تربیت | غیر انجینئرنگ پیشوں میں عورتیں زیر تربیت افراد کا ۷۰٫۴۴ فیصد ہیں اور ان کا بھاری اجتماع خیاطی اور کٹائی کے کام زردوزی اور سوزن کاری ۔ تیلیوں سے بنائی اور اسٹینو گرافی میں ہے پہلے دو کاموں کی تربیت میں تعلیمی اداروں میں بھی عورتوں کی مکمل اجارہ داری ہے ۔ انجینئرنگ سے متعلق پیشوں میں وہ زیر تربیت افراد کی کل تعداد کا ۷۰٫۰ فیصد ہیں ۔ نئے مواقع سے واقفیت بڑھانے کے لیے اور قومی معیشت کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کے واسطے عورتوں کو تربیت دینے کے لیے وزارت تعلیم نے جو ۲۴ پولی ٹکنک ادارے قائم کیے ہیں ان میں تحقیق سے یہ معلوم ہوا ہے کہ جو کورسس کاروباری عمل اسٹینو گرافی ۔ تفریحی ضرورتیں پورا کرنے کے کام اور غذائی ٹکنالوجی سے متعلق ہیں ۔ ان میں داخلے اداروں کی منظوری کردہ صلاحیت سے زیادہ ہوتے ہیں ۔ جبکہ دیگر پیشوں کی تربیت میں جتنی نشستیں مہیا ہیں ان سے کم داخلے ہوتے ہیں ۔ تمام کورسوں میں تربیت پاکر نکلنے والی عورتوں کی تعداد داخلوں سے کم ہوتی ہے ۔ روزگار دلانے کے سلسلے میں کافی امداد نہ ہونے کے باعث بہت سی عورتیں بے روزگار ہی رہ جاتی ہیں ۔ تربیت کے نصابات ہمیشہ مقامی علاقہ کے روزگاری امکانات کی مناسبت سے مرتب نہیں کیے جاتے ۔

خیاطی اور سوزن کاری جیسے نصابات میں عورتوں کا حد سے زیادہ اجتماع حصول روزگار کے مواقع کو کم کر دیتا ہے ۔ "آل انڈیا کونسل فار ٹکنیکل ایجوکیشن" نے طالبات کے لیے پیداوار کے مراکز اور روزگار مشاورتی سروس بنانے کے لیے جو سفارشات پیش کی تھیں ان پر عمل درآمد نہیں کیا گیا ہے ۔ آخری بات یہ ہے کہ "پانچویں منصوبے" میں ان اداروں کو مرکزی امداد ملنا بند ہو گئی ۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ریاستی حکومتوں نے ان کی کفالت میں غفلت سے کام لیا ہے ۔ تدریسی اور دیگر سہولتوں کی ناکافی فراہمی ان اداروں میں داخلوں کے انحطاط کا راز بتاتی ہے ۔ بعض پرائیوٹ اداروں نے جو کہ ان اقسام ہی کی تربیت دیتی ہیں اور جن میں تربیت یافتہ افراد کو روزگار دلانے کا بھی انتظام ہے ۔ اس امر کا اظہار کیا ہے کہ نصابات کو علاقہ کے روزگاری

امکانات سے ہم آہنگ کرنا بڑے شہروں میں بہت کامیاب چیز ثابت ہوا ہے۔ اس قسم کے اداروں کی سرگرمیاں گزشتہ چند سال میں تیزی کے ساتھ وسعت اختیار کر چکی ہیں اور یونیورسٹی کی ڈگریاں رکھنے والی طالبات تک کو اپنی طرف کھینچ رہی ہیں۔

موجودہ سماجی اقتصادی نظام میں عورتوں کے ذاتی روزگار کے لیے اس سے کہیں زیادہ کی ضرورت ہے کہ ایک خاص کام یا پیشہ کی تربیت حاصل کر لی جائے۔ بازار کے نظام کا علم وسائل سرمایہ تک رسائی نہ ہونے کی صورت میں تنہا تربیت ہی عورتوں کو مسابقت کا سامنا کرنے میں مدد نہیں دے سکتی۔ سرمایہ اور خام مال حاصل کرنے میں جو دشواریاں تھیں، عورتوں کو قرض دینے میں بینکوں کے تامل کے باعث اور شدید ہو گئی ہیں اور منڈیوں میں مال بیچنے سے متعلق مسائل — اور بعض بڑی بڑی رکاوٹیں جو ان کے ذاتی روزگار کی راہ میں حائل ہیں۔

۴۔ ترقیاتی ایجنسیوں کے اختیار کردہ تربیت جو ایجنسیاں عورتوں کی فلاح و بہبود کے کاموں کی ذمہ دار ہیں۔ خواہ وہ حکومت سے متعلق ہوں یا رضا کارانہ طور پر کام کر رہی ہیں۔ انھوں نے عورتوں کی کسبِ معاش کی صلاحیت کو بہتر بنانے کے لیے خصوصاً کم آمدنی والے گروپ میں۔ بے ضابطہ اور غیر رسمی تربیت پر زور دیا ہے "مرکزی سماجی فلاحی بورڈ"..... (CENTRAL SOCIAL WELFARE BANK) چھوٹے پیمانے کی صنعتوں۔ دستکاریوں اور زیادہ بڑے صنعتی اداروں کی ماتحت ضمنی یونٹوں میں ایسے مرکزوں کی مدد کرتا رہا ہے جو تربیت کے مرکز بھی ہیں اور پیداوار کے بھی۔

ترقیاتی کام کے لیے خصوصاً دیہات میں عورتوں کے مختلف نوعیت کے کارکن عملوں کی وزارت نے "وزارت زراعت و کمیونٹی ترقی" نے اور "وزارت صحت" نے تربیت دی ہے۔ بہت سی وزارتوں نے زیادہ تر سلائی، زردوزی، خیاطی اور دستکاریوں کی تربیت کے ذریعہ عورتوں کی روزی کمانے کی صلاحیت کو بہتر بنانے کی غرض سے فلاح و بہبود کے مراکز قائم کیے ہیں۔ ہم نے ان مرکزوں کا معائنہ کیا اور یہ مشاہدہ کیا کہ مال کی تیاری اور بازار کاری کے ساتھ ایک منصوبہ بند

تعلق کے بغیر بڑی حد تک اس تربیت کا انجام لاحاصل ہی ثابت ہوتا ہے۔ روایتی یا گھریلو دستکاریوں کا بازار وسعت کے لحاظ سے محدود ہے اور چونکہ بازار کاری درمیانی لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ اس لیے تربیت کا نتیجہ کچھ زیادہ پیداآور روزگار کی شکل میں ظاہر نہیں ہوتا۔ اسکیموں کی گوناگونی اور انتظامیہ کاموں کی کئی گنا غیر ضروری طوالت میں وسائل کی بربادی ان پروگراموں کی وسعت کو محدود کردیتی ہیں اور اس طرح یہ پروگرام عورتوں کی روزگاری ضروریات پر صرف ایک حاشیائی اثر ہی ڈال سکتے ہیں۔ آخری بات یہ کہ ان پروگراموں کی درجہ بندی اقتصادی ترقی کے بجائے فلاح و بہبود کے تحت جو ان کو پبلک فنڈ سے وسائل حاصل کرنے سے روک دیتی ہے۔ اگر منصوبہ بندی کچھ اور زیادہ کردی جائے اور مختلف ایجنسیوں کے درمیان تال میل بڑھا دیا جائے۔ نیز ذمہ داریوں کی تقسیم نو کی جائے تو اس سے عورتوں کی کسب معاش کی قوت میں اضافہ کرنے کے سلسلے میں ان پروگراموں کی اہلیت بہتر ہو جائے گی۔

خاص مسائل تعلیم اور پیشہ ورانہ تربیت کے علاوہ عورتوں کی روزگاری ضرورتوں کو معیشت کے بدلتے ہوئے نقشہ کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کا معاملہ اس چیز کا بھی مطالبہ کرتا ہے کہ گھرستنوں اور ماؤں کی حیثیت سے عورتوں کے جو خصوصی مسائل ہیں، ان کو حل کیا جائے۔ اس نقطۂ نظر سے امور ذیل قابل توجہ ہیں۔

۱۔ عورتوں کے لیے جزوقتی روزگار کے مواقع کی فراہمی۔ اس کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہوگی وہ یہ ہیں۔ تمام ممکن مواقع کی تحقیق۔ غیر منظم سیکٹر میں مروجہ جزوقتی روزگار کے تمام موجودہ نمونے اور استحصال کے خلاف قانونی اور سماجی تحفظ

۲۔ خاندانی وجوہات پر روزگار سے کنارہ کش ہونے کے بعد عورتوں کو دوبارہ روزگار میں داخل ہونے کی اجازت دینا۔

۳۔ ان عورتوں کے لیے امداد اور مشورے جو ایک بعد کے کام کی متلاشی ہوتی ہیں۔

۴۔ روزگار کا کام کرنے والی عورتوں کے لیے بچوں کی دیکھ بھال کا انتظام۔

۵۔ روزگار کا کام کرنے والی عورتوں کی رہائش اور ان کے تحفظ کے مسائل کو حل کرنے کے لیے امدادی تدابیر۔

۶۔ ملازمت کے حالات کو بہتر بنانا خصوصاً ذریعۂ آمدورفت فراہم کرنے اور غیر ضروری تبادلوں سے گریز کرنے کے سلسلے میں۔

ہمارے خیال میں تمام سطحوں پر بالیدگی و ترقی کے عمل میں عورتوں کو ضم کرنے کا قومی مقصد اور ان کو دی گئی دستوری ضمانتوں کا تقاضہ یہ ہے کہ گھر ستنوں، ماؤں اور سماجی و اقتصادی لحاظ سے پیداآور افراد کی حیثیت سے عورتیں جو متعدد رول ادا کرتی ہیں ان کو سماج میں تسلیم کیا جائے۔ اس لیے یہ بالکل واجب ہے کہ سماج عام طور پر اور ریاست خاص طور پر ضروری حالات و امداد عورتوں کو اپنے مختلف رول ادا کرنے کے قابل بنانے کے لیے فراہم کرے۔ شادی اور مادریت کو جو کہ قوم کے وجود کے تسلسل کو قائم رکھنے میں حصہ لیتی ہیں اقتصادی عمل میں عورتوں کی سود مند شرکت کے لیے معذوریاں اور مجبوریاں نہیں بن جانا چاہیے۔ ان سہارا دینے والی سروسوں اور امدادی وسایل کے اداروں کے بغیر جن کے لیے یہاں تجویز پیش کی گئی ہے یہ دوہرے رول' عورتوں کے جسمانی اور ذہنی وسائل پر زبردست بوجھ ڈالتے رہیں گے اور بچوں کی فلاح و بہبود اور نشوو نما کو متاثر کریں گے۔ اس لیے ہم ایک بہت واضح پالیسی کو ایک "گورنمنٹ رزولیشن" کے ذریعہ اختیار کرنے کی سفارش کرتے ہیں۔ ایک ایسی پالیسی جس کا مقصد یہ ہو کہ دستور کی ہدایتوں کو پورا کیا جائے اور قومی ترقی میں عورتوں کی بھرپور شمولیت کے متعلق حکومت کے طویل المدت مقصد کی تکمیل کی جائے۔ اس پالیسی پر احتیاط کے ساتھ عمل درآمد کرنا پڑے گا تاکہ نا اہلیت و ناموزونیت کی بنیاد واضح طور پر متعین کیے بغیر عورتوں کو کسی پیشے سے الگ نہ کیا جائے سوائے ان پیشوں کے جو قانونی لحاظ سے ان کے لیے ممنوع ہیں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ عورتوں کے مسائل سے نمٹنے کے لیے "وزارت محنت و روزگار" (MINISTRY OF LABOUR AND EMPLOYMEN) میں مرکزی اور ریاستی دونوں سطحوں پر ایک جداگانہ شعبہ بنایا جائے۔ اس کے علاوہ ہم مندرجہ ذیل اہم کارروائیوں کی بھی سفارش

کرتے ہیں۔

ا۔ میٹرنٹی بینفٹس ایکٹ ۱۹۶۱ء: (ا) اس ایکٹ کو سب صنعتوں پر عائد ہونا چاہیے اور زچگی کے فوائد یعنی بھتّوں، وظیفوں کی یقینی ادائیگی کا انتظام کیا جانا چاہیے اس طرح کہ مالکوں اور آجروں پر امدادی رقوم عائد کر کے ایک مرکزی فنڈ قائم کیا جائے۔ اس فنڈ کا انتظام "ایمپلائز اسٹیٹ انشورنس اسکیم" کے نمونے پر ہونا چاہیے۔

(ب) یہ ایکٹ زرعی مزدوروں پر بھی محیط ہونا چاہیے۔ اس کے نفاذ میں سہولت پیدا کرنے کے لیے "مرکزی فنڈ" کے واسطے ایک رقم زرعی فارموں پر بھی عائد کرنا چاہیے جس میں چھوٹی زمینوں پر مناسب تخفیف کر دی جائے۔ جیسا کہ "زرعی آراضی ٹیکس" کے لیے "زرعی دولت و آمدنی ٹیکس کمیٹی" نے سفارش کی ہے۔

(ج)۔ عورتوں کی تخفیف کے خلاف ایک دفعہ اس ایکٹ میں شامل کرنی چاہیے۔

(د)۔ جن عورتوں کی تخفیف تھوڑی مدتوں کے لیے کی جائے اور دوبارہ ان ہی جگہوں پر ملازم رکھا جائے۔ ان کو زمانۂ زچگی کے فوائد کا اہل سمجھنا چاہیے۔ تین ماہ کی ملازمت پر محنت کش عورتوں کو ان فوائد کا مستحق بن جانا چاہیے۔

(ہ) سب صنعتوں میں گھر پر بیٹھ کر کام کرنے والی عورتوں کو زچگی کے زمانے کے فوائد فراہم ہونے چاہئیں۔

(و) زمانۂ زچگی کے فوائد کے لیے درخواستوں کی جانچ پڑتال انتظامی جماعت اور ٹریڈ یونین کے نمائندوں کی ایک کمیٹی کو کرنا چاہیے۔ کمیٹی کے نمائندوں کی ایک کمیٹی کو کرنا چاہیے۔ بہتر یہ ہے کہ اس قانون کی تعمیل سے گریز کرنے پر اور زیادہ سخت سزائیں ہونا چاہئیں۔

(ح) زمانہ زچگی کے فوائد سے متعلق بھتّوں۔ وظیفوں کی ادائیگی مجموعی یکمشت رقم کے بجائے مقررہ میعادوں کے حساب سے ہونا چاہیے۔

(ط) سب ریاستوں میں مؤثر طور پر اس ایکٹ کا نفاذ ہونا چاہیے۔

<u>(۲) بچوں کی پرورش گاہوں کی فراہمی۔</u>

(ا) اس سہولت کی فراہمی کے لیے کارکن عورتوں کی تعداد کی حد ۲۰ قبول کرنی چاہیے۔

غیر مستقل اور اتفاقی طور پر کام کرنے والی عورتوں کو اس فائدہ میں حصہ پانے کا حقدار ہونا چاہیے۔

(ج) کام کرنے والی عورتوں کے دوسرے گروہوں کے مطالبہ میں بہت چھوٹے بچوں کو رکھنے کے لیے ایک گنجائش فراہم کرنی چاہیے۔

(د) جہاں تک ممکن ہو بچوں کی پرورش یا دیکھ بھال کے ادارے قرب وجوار میں ہی قائم کرنے چاہئیں۔

۳۔ کام کے اوقات:۔

دس بجے رات تک کام کرنے کی اجازت ملنی چاہیے۔ بشرطیکہ سواری اور حفاظت کے انتظامات کر لیے جائیں۔

۴۔ بیمہ:۔

"ایمپلائیز انشورنش ایکٹ" کو بڑھا کر بہت علاقوں میں نافذ کر دینا چاہیے۔

۵۔ مساوی اجرت:۔

دستور کی دفعہ ۳۹ (د) یعنی برابر کام کے لیے برابر اجرت ابھی تک صرف ایک پالیسی کی صورت میں ہے۔ اس کو مجلس آئین ساز کی منظوری حاصل ہونا چاہیے اور "کم سے کم اجرت ایکٹ" (MINIMUM WAGES ACT) میں اس کو شامل کر دینا چاہیے۔

۶۔ تربیت اور روزگار کا دوش بدوش فروغ:۔

(الف) عورتوں کے لیے ایک قطعی کوٹا صنعت کے اندر تربیت کے لیے محفوظ رکھنا چاہیے۔

(ب) "قومی اپرنٹس ایکٹ" کے تحت بھی اسی طرح کا کوٹا مخصوص و محفوظ ہونا چاہیے۔

(ج) پیشہ ورانہ تربیت کے پروگراموں کو صنعتوں سے قریبی تعلق کے ساتھ فروغ دینا چاہیے اور اس علاقہ میں وسائل دریافت کرنا چاہیے جس کا روزگار دینے والی ممکنہ ایجنسیوں سے کوئی رشتہ ہو۔

(د) ریاست کی چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے محکموں کی مدد سے عورتوں کے لیے پیداواری کلنک اور اداروں میں

مال کی تیاری کا مرکز بھی شامل کرنا چاہیے۔

(ہ) ذاتی روزگار کی ہمت افزائی کے لیے اور بازار کی تنظیم کے سلسلے میں تربیت کے پروگراموں کو فروغ دینا چاہیے۔

(و) ناخواندہ اور نیم خواندہ عورتوں کے لیے پیشہ ورانہ تربیت کو فروغ دینا چاہیے۔

(ز) شہری اور دیہی علاقوں میں چھوٹے پیمانے کی کاٹیج انڈسٹریز میں ایسے مرکز قائم ہوں جہاں عورتوں کو ٹریننگ بھی ملے اور چیزیں بھی تیار ہوں۔

۷۔ جزوقتی روزگار:

ہم سفارش کرتے ہیں کہ بھرتی کے قواعد اور ملازمت کی شرائط پر مناسب نظر ثانی کرکے عورتوں کے جزوقتی روزگار کے لیے خصوصی انتظامات کیے جائیں۔ سرکاری اور نیم سرکاری دونوں قسم کی ایجنسیوں کی طرف سے ان موجودہ راہوں اور علاقوں کے متعلق تفصیلی تحقیق کی جائے۔ جہاں جزوقتی روزگار پیدا کیا جا سکتا تھا۔

۸۔ روزگار سے متعلق معلومات:

دی نیشنل ایمپلائز سروس کو بڑھا کر دیہی علاقوں میں پھیلا دیا جائے اور اس میں عورتوں کا ایک عملہ تیار کیا جائے جو عورتوں کو ملازمتوں سے متعلق معلومات اور امداد فراہم کرے۔

۹۔ دوبارہ داخلے کا انتظام:

ایک ایسی قانونی گنجائش ہونی چاہیے جس کے تحت عورتوں کو پانچ سال کی (بغیر تنخواہ) رخصت مل جائے۔ لیکن ایسی رخصت کے دوران ملازمت میں عورت کے حق قانونی کا تحفظ کرنا چاہیے۔

۱۰۔ کام کرنے والی عورتوں کا تحفظ کرنے والے قوانین کا نفاذ:

مختلف محکمہ جات محنت کے انسپکٹوری کے دفتر میں کام کرنے والی عورتوں اور ویلفیئر افسر عورتوں کی تعداد میں اضافہ ہونا چاہیے۔

۱۱۔ ہم مزید یہ سفارش کرتے ہیں کہ زراعت کے میدان اور دیگر غیر منظم سیکٹروں میں محنت کشوں کی انجمنوں کی تنظیم کرنے کے لیے موثر اقدامات ہونے چاہئیں اور عورتوں کے مسائل کی دیکھ بھال کرنے اور ٹریڈ یونین کی سرگرمیوں میں ان

کی شرکت کو مؤثر بنانے کے لیے تمام ٹریڈ یونین جماعتوں میں ایسی شاخیں قائم کرنا چاہئیں، جو صرف عورتوں پر مشتمل ہوں۔

چھٹا باب

تعلیمی ترقی

تعلیم کو بذات خود ایک مقصد بھی سمجھا گیا ہے اور دوسرے مقاصد کے حصول کا ایک ذریعہ بھی۔ یہ افراد کی شخصیت کو نشوونما دیتی ہے۔ انھیں بعض اقتصادی، سیاسی اور ثقافتی کاموں کو انجام دینے کا اہل بناتی ہے اور اس طرح ان کی سماجی اقتصادی حیثیت کو بہتر بناتی ہے۔ اس کو ایک ایسا بڑا آلۂ کار تسلیم کیا گیا ہے جس کو انسانی معاشرے تغیر اور ترقی کے عمل کو مطلوبہ مقصدوں اور منزلوں کی سمت لے جانے کے لیے استعمال کرسکتے ہیں۔ یہ عمودی نقل و حرکت کی صلاحیت بہم پہونچاتی ہے اور اس طرح مختلف سماجی سطحوں سے تعلق رکھنے والے افراد کے درمیان مساوی درجہ قائم کرنے میں مدد دے سکتی ہے۔ "انسانی حقوق کا عالمی اعلان" (THE UNIVERSAL DECLARATION OF HUMAN RIGHTS) اس کو ہر ایک فرد انسانی کے بنیادی حقوق میں سے ایک حق قرار دیتا ہے۔

عورتوں کی حیثیت کو بہتر بنانے کے لیے جو تحریک پوری دنیا میں چل رہی ہے اس نے سماج میں عورتوں کی محکومانہ حیثیت کو بدلنے کے لیے اہم ترین آلۂ کار کی حیثیت سے تعلیم پر ہمیشہ ہی زور دیا ہے۔ انیسویں صدی کے ہندوستانی سماجی مصلحین نے بھی اس نقطہ نظر کو مانا تھا۔ تاہم ان کا مطمح نظر عورتوں کو بیویوں اور ماؤں کی حیثیت سے اپنے روایتی کردار ادا کرنے کے زیادہ قابل بنانے کے لیے

تعلیم کو استعمال کرنا تھا نہ کہ سماجی اقتصادی یا سیاسی ترقی کے عمل میں ان کو اور زیادہ اہل اور سرگرم اکائیاں بنانا۔ نوآبادیاتی اہل اقتدار نے عورتوں کی تعلیم کے اسی محدود نقطۂ نظر کی حمایت کی۔ لیکن بیسویں صدی میں تعلیم اور صحت کے محکموں کی توسیع نے تیزی کے ساتھ لیڈی ڈاکٹروں اور استانیوں کی ضرورت پیدا کر دی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ دو غیر سرکاری پیشے عورتوں کی تعلیم کے لیے بنائے گئے پروگراموں میں شامل کر لیے گئے۔

آزادی کے حصول اور مساوات کی دستوری ضمانتوں نے نئے ابعاد پیدا کر دیے جن کے ساتھ عورتوں سے حالات کا مطالبہ پیدا ہوا کہ وہ نظام سیاست، معیشت اور سماج میں گوناگوں کردار ادا کریں۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد والے برسوں میں بین الاقوامی ایجنسیوں نے بھی ایک ایسے آلۂ کار کی حیثیت سے تعلیم کے رول پر زور دیا جو عورتوں کو نئے سماجی نظام کی تعمیر کرنے کے لیے ضروری خصوصیات سے آراستہ کر سکتا ہے۔ لیکن تعلیم پر اس نئے زور کے باوجود ہندوستان میں عورتوں کی تعلیم کے متعلق جو رویے اختیار کیے گئے انھوں نے بہ یک وقت دو طرفہ رجحان کا اظہار کیا ہے جس میں ایک طرف روایتی محدود زاویۂ نظر تھا، اور دوسری طرف وسیع نیا تصور اور یہی دو طرفہ رجحان ہے جس نے مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے تعلیمی منصوبہ بندی وسائل کے تعین اور سماج میں اقدار کے ارتقا کو متاثر کیا ہے۔

تعلیم نسواں کی ترقی: مقداری پہلو

ہم نے عورتوں کی تعلیمی ترقی کا جائزہ دو طرح لیا ہے — یعنی (۱) مقداری علامات کے ذریعے جیسے اداروں میں طالبات کی مندرجہ تعداد۔ فارغ التحصیل طالبات کی تعداد۔ تعلیمی سہولتیں۔ خواندگی کی شرحیں اور تعلیم یافتہ عورتوں کی کل تعداد اور (۲) اس بنیادی قومی مقصد کی روشنی میں کہ عورتوں کو مردوں کے ہم رتبہ افراد کی حیثیت سے قومی ترقی کے تمام پہلوؤں میں ضم کیا جائے۔

(۱) طالبات کی مندرجہ تعداد (ENROLMENT)۔ دستور کی اس ہدایت پر کہ سب بچوں کو چودہ سال کی عمر تک لازمی مفت تعلیم دی جائے۔ اب تک عمل نہیں ہو سکا۔ ماہرین تعلیم اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ اس ناکامی کا خاص سبب لڑکیوں کی

تعلیمی ترقی کی سست رفتار ہے۔ مندرجہ فہرست ذاتیں اور مندرجہ فہرست قبائل۔ چوتھے منصوبہ کی مدت کے خاتمہ پر ۶ تا ۱۱ سال کی عمر کے گروپ میں صرف ۶۲ فی صد لڑکیاں اسکولوں میں پڑھ رہی تھیں ۱۱ تا ۱۴ سال کے گروپ میں یہ تعداد صرف ۲۲ فی صد تھی۔ ان ہی دو گروپوں میں لڑکوں کی تعداد بالترتیب ۱۰۰ فی صد اور ۴۸ فی صد تھی۔

لیکن جب آزادی سے قبل کے دور میں ہونے والی عورتوں کی تعلیمی ترقی کے ساتھ مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آزادی کے بعد کے دور میں تعلیم نسواں کی ترقی حیرتناک طور پر غیر معمولی ہوئی ہے۔ عورتوں کی تعلیم کی توسیع جو ، ابتدائی دور میں ہوئی زیادہ تر اسی منزل تک محدود رہی۔ ۱۹۴۷ء میں پرائمری اسکولوں میں مندرجہ تعداد (۲۴،۹۱،۹۵۰) تعلیمی نظام میں درج شدہ تمام لڑکیوں کی تعداد کا ۸۲ فی صد تھی۔ مڈل اسکولوں میں صرف ۳،۲۱،۰۰۰ لڑکیوں کے نام درج تھے جو کہ کل پڑھنے والی لڑکیوں کی ۹ فی صد تھیں۔ ثانوی اسکولوں میں پڑھنے والی لڑکیاں ۲،۸۱،۰۰۰ تھیں۔ جو کل پڑھنے والی لڑکیوں کی ۷ فیصد تھیں اور اس کے باوجود بھی ہندوستانی یونیورسٹیوں نے مغربی یونیورسٹیوں کے مقابلے میں لڑکیوں کو داخلہ دینے میں خود کو زیادہ کشادہ دل ثابت کیا تھا۔ اعلیٰ تر تعلیم کے کورسوں میں ان کے یہاں طالبات کی تعداد (۲۳،۰۰۰) صرف کل پڑھنے والی لڑکیوں کے ایک فی صد کے نصف سے کم تھی۔ ۱۹۴۶-۴۷ء میں مختلف سطحوں پر ۱۰۰ لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں کی تعداد پرائمری سطح پر ۳۲۔ مڈل سطح پر ۲۲۔ ثانوی سطح پر ۱۴ اور یونیورسٹی سطح پر ۱۹ تھی۔

۱۹۷۳-۷۴ء تک مختلف مرحلوں پر اداروں میں درج شدہ لڑکیوں کی تعداد میں نیز لڑکوں کے ساتھ ان کے تناسب میں زبردست اضافہ ہوچکا تھا۔ پرائمری سطح پر اسکولوں میں درج شدہ لڑکیوں کی تعداد ۲ کروڑ ۴۴ لاکھ سے زیادہ تھی۔ (۱۰۰ لڑکوں کے مقابلے میں ان کا تناسب ۶۲) مڈل سطح پر ۴۵ لاکھ سے زیادہ (تناسب ۴۳) ثانوی سطح پر ۲۳ لاکھ سے زیادہ (تناسب ۳۶) اور کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تقریباً ۹ لاکھ (تناسب ۳۱)۔ اس مدت کے دوران

تعلیمی نظام کے مختلف مرحلوں کے درمیان تمام درج شدہ لڑکیوں کی تقسیم میں بھی تبدیلی ہوئی ہے۔ ۱۹۷۰-۷۱ء تک ۷۳ فی صد پرائمری اسکولوں میں ۱۴ فیصد مڈل اسکولوں میں ۳ء۷ فی صد ثانوی اسکولوں میں ۳ء۲ فی صد کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اور ۲ء۳ فی صد پیشہ ورانہ اسکولوں میں ہوگئی تھیں۔

اس بے مثال ترقی کے باوجود مجموعی صورت حال میں بہت کچھ مطلوبہ چیزوں کی ضرورت باقی رہ گئی۔ اس صورت حال کی بعض بڑی بڑی کمزوریاں حسب ذیل ہیں:—

۱۔ پہلے سے پانچویں جماعتوں میں تین میں سے ایک لڑکی اسکول میں داخل نہیں ہے۔ پڑھائی چھوڑ دینے والی لڑکیوں کی شرح بھی بہت زیادہ ہے۔ پہلی جماعت میں داخلہ لینے والی ۱۰۰ لڑکیوں میں سے صرف ۲۰ لڑکیاں پانچویں جماعت تک پہونچتی ہیں۔

۲۔ پانچویں سے آٹھویں تک کی جماعتوں میں پانچ میں سے صرف ۱ لڑکی اسکول میں داخل ہے۔ ۶ تا ۱۱ سال عمر کے گروپ میں اسکول میں داخل شدہ لڑکیوں کی تعداد آبادی کا ۶۶ فیصد ہے، جو ۱۱ سال تا ۱۴ سال عمر کے گروپ میں ایک دم گھٹ کر ۲۲ فی صد رہ جاتی ہے۔ اس سے پرائمری اور مڈل مرحلوں کے درمیان پڑھائی چھوڑ دینے والی لڑکیوں کی زبردست تعداد کا اظہار ہوتا ہے۔

۳۔ ثانوی تعلیم کے مرحلہ پر ۱۴ تا ۱۷ سال عمر کے گروپ میں اسکول میں داخل شدہ لڑکیوں کا تناسب گر کر آبادی کا صرف ۱۲ فی صد رہ جاتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ۸ میں سے صرف ۱ لڑکی اسکول میں داخل ہے۔ ثانوی تعلیم اب تک شہری علاقوں میں اونچے اور متوسط طبقوں تک محدود ہے۔ دیہی علاقوں میں صرف خوشحال گھرانے اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں خصوصاً وہ جو متوسط طبقے سے متعلق ہیں۔ ۱۹۶۵ء کے "تعلیمی جائزے" (Educational Surveys) کے مطابق ثانوی اسکولوں میں دیہاتی بچوں کے ۱۷ فی صد سے کم لڑکیاں تھیں۔

۴۔ یونیورسٹی میں بی۔اے سے نیچے کی سطح کے مقابلے میں لڑکیوں کا تناسب بی۔اے سے اوپر کی سطح پر زیادہ ہے۔ پیشہ ورانہ تعلیم میں عورتوں کی

ایک کافی بڑی تعداد، معلمی، ڈاکٹری اور فنون لطیفہ میں ہے لیکن کامرس، قانون، زراعت یا انجینئرنگ میں ان کی تعداد بے حد کم ہے۔ عورتوں کی اعلیٰ تعلیم اور بھی زیادہ شہری متوسط اور اونچے طبقات تک محدود ہے۔

۵۔ عورتوں کی تعلیم کی نیشنل کمیٹی (۵۹-۱۹۵۸ء) نے لڑکے اور لڑکیوں کی تعلیم کے درمیان بڑھتے ہوئے خلا پر تشویش کا اظہار کیا تھا اور اس خلا کو ممکن ترین مدت میں پُر کرنے کے لیے خاص پروگراموں اور کوششوں کی سفارش کی تھی۔ خصوصی کوششوں کے نتیجے میں اداروں میں داخل شدہ لڑکیوں کی تعداد ۱۹۶۰ء سے زیادہ ہونے لگی۔ لیکن ہمیں افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ ۱۹۶۶ء کے بعد یہ کوششیں سست پڑ گئیں۔ اداروں میں داخل شدہ لڑکیوں کی تعداد میں پنج سالہ افزائش کی شرح پرائمری مرحلہ پر ۶۶-۱۹۶۱ء میں ۵۶ر۱ فی صد تھی جو ۷۱-۱۹۶۶ء میں ۷ر۳۰ فی صد رہ گئی۔ ثانوی تعلیم کے مرحلہ پر یہ انحطاط ۷ر۶۰ فی صد سے ۵ر۳۰ فی صد تک ہوا۔ لیکن یونیورسٹی مرحلہ پر یہ انحطاط مقابلۃً کم ہوا یعنی ۹ر۱۰۴ فی صد سے ۷ر۴۲ فی صد۔ اسپشل اور پیشہ ورانہ اسکولوں میں یہ انحطاط ۶ر۴۲ سے ۶ر۲۴ فی صد تھا۔ یہ ایک گہری تشویش کی بات ہے۔

۶۔ اگرچہ رجسٹر میں درج شدہ طلبا کی تعداد تعلیمی ترقی کی پیمائش کرنے کے لیے عموماً خاص پیمانہ سمجھی جاتی ہے تاہم اس میں تعلیم کی ضائع ہوجانے والی اور بے مصرف و بے عمل رہ جانے والی مقدار کے مسائل بعض حدود عائد کردیتے ہیں۔ اسکولی نظام کے مختلف مرحلوں پر پڑھائی چھوڑ دینے والوں کا کل بند اوسط لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں کا ہمیشہ زیادہ رہا ہے۔ "تعلیمی کمیشن" نے یہ معلوم کیا تھا کہ نچلی پرائمری جماعتوں میں یہ اوسط ۶۲ فی صد تھا جبکہ لڑکوں کا یہ اوسط ۵۶ فی صد تھا۔ اونچے پرائمری مرحلہ پر یہ اوسط ۴۴ فی صد تھا جس کے مقابلے میں لڑکوں کا ۴۲ فی صد تھا۔ ایک بعد کے مطالعے* سے معلوم ہوا کہ پرائمری اور مڈل اسکولوں میں تعلیم

---

* "پرائمری اور مڈل اسکولوں میں تعلیم کا ضائع ہوجانے اور بے مصرف و بے عمل رہ جانے والی مقدار" ۔ مصنفہ ثریا اور سبرا۔ این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی ۱۹۷۰ء

کی ضائع ہوجانے والی اور بے مصرف و بے عمل رہ جانے والی مقدار کی شرح لڑکوں میں ۶۲٫۳۰ فی صد اور لڑکیوں میں ۳۰٫۱۰ فی صد تھی اور سب سے زیادہ فرق پہلی اور دوسری جماعتوں میں تھا۔

۲۔ فارغ التحصیل طلباء :- (OUT-TURN) : اسکولوں اور یونیورسٹی کی تعلیم سے فارغ ہوکر نکلنے والوں کی تعداد میں سب سے زیادہ اہم اور معنی خیز خصوصیات یہ ہیں کہ فی ہزار لڑکوں کے مقابلے میں ان لڑکیوں کے اضافہ کی شرح زیادہ سست ہے جو ہائر سکنڈری اور میٹرک کے امتحانات پاس کرتی ہیں، اور یونیورسٹی کی سطح پر خاص طور سے پہلی ڈگری کی سطح پر یہ اضافہ کی شرح کہیں زیادہ تیز ہے۔ اسکول کی سطح کے مقابلہ میں اعلیٰ تعلیم یافتہ عورتوں اور مردوں کے درمیان فرق زیادہ تیزی سے کم ہورہا ہے۔ چونکہ ہندوستان میں عورتوں کی اعلیٰ تعلیم ابھی تک ایک چھوٹی سی اقلیت تک محدود ہے۔ اس لیے مجموعی طور پر اس رجحان کا اثر عورتوں کی تعلیمی ترقی پر حاشیائی و معمولی نوعیت کا ہے۔ ۴۸-۱۹۴۷ء سے ۶۶-۱۹۶۵ء تک کی مدت کے دوران میٹرک پاس کرنے والی لڑکیوں کی تعداد فی ہزار لڑکوں کے مقابلے میں ۱۲ سے بڑھ کر ۲۱ ہوگئی۔ پہلی ڈگری کی سطح پر یہ اضافہ ۱۸ سے ۳۲ ہوا ہے۔ دوسری ڈگری کی سطح پر ۱۴ سے ۲۰ اور ڈاکٹریٹ کی ڈگریوں میں ۴.۴ سے ۱۹.۰۔ پیشہ ورانہ ڈگریوں میں یہ اضافہ ۵۱-۱۹۵۰ء میں ۹ سے ۶۶-۱۹۶۵ء میں ۱۹ تھا۔

پیشوں کی تعلیم میں عورتوں کے لیے آزادی سے پہلے جو کورس کھلے ہوئے تھے وہ یہ تھے ـــ ڈاکٹری۔ تعلیم۔ نرسنگ اور قانون۔ ٹیکنالوجی اور انجینیرنگ میں عورتوں کا داخلہ صرف ۱۹۴۸ء کے بعد سے ممکن ہوا۔ آغاز کی اس تاخیر کے پیش نظر ان کورسوں میں عورتوں کی کامیابی بہت اہم رہی ہے اگرچہ دوسرے پیشوں کے میدان میں ان کی نمائندگی اب بھی بہت کم ہے۔ اسی طرح ریسرچ میں عورتوں کا داخلہ بھی زیادہ تر آزادی کے بعد کا ارتقا ہے اور اس سطح پر ان کی ترقی کی رفتار اطمینان بخش ہے۔ اس سے پہلے یہ عام عقیدے تھے کہ لڑکوں کے مقابلے میں اعلیٰ تعلیم کے لیے لڑکیوں میں کم ذہانت اور فطری موزونیت ہوتی ہے خاص طور سے ایسے مضامین میں جیسے ریاضیات یا سائنس اب ان عقیدوں کو

لڑکیوں کی کامیابی نے غلط ثابت کردیا ہے جو کہ مختلف و متعدد امتحانوں میں لڑکوں کی کامیابی سے آگے نکل جاتی ہے۔

۲۔ **اداروں کی تعداد میں اضافہ**۔ تعلیم نسواں کی قومی کمیٹی نے لڑکیوں کے لیے علیحدہ اداروں کے قیام کی وکالت کی تھی تاکہ ان کی تعلیم کے خلاف جو تعصب قائم ہے اس کو توڑا جاسکے۔ ۱۹۷۰-۷۱ء کے بعد کے دور میں لڑکیوں کے لیے علیحدہ و مخصوص اداروں کی تعداد بڑی تیزی سے بڑھی۔ ۱۹۴۷-۴۸ میں ایسے ادارے تعلیمی اداروں کی کل تعداد کا صرف ۱۰.۱۳ فی صد تھے۔ ۱۹۷۷-۷۸ تک وہ کل تعداد کا ۲۹ فی صد ہوگئے، اور ان کی تعداد ۱۲۹۵۱ سے ۲۳۰۳۲ ہوگئی۔

عورتوں کے درمیان تعلیم کی اشاعت کے لیے اداروں کی سہولتوں میں اضافہ کا خیر مقدم کرنے کے ساتھ ساتھ ہمیں اس تیز اضافہ کی بعض خراب و مضرت رساں خصوصیات کی طرف بھی توجہ دلانا ضروری ہے۔ ایسے بہت سے اسکول ہیں جن میں صرف ایک استانی ہوتی ہے اور اس کی غیر حاضری کی صورت میں وہ اکثر و بیشتر بند کردیتا ہیں جس کی وجہ سے لڑکیوں کو اسکول بھیجنے میں بہت سے والدین کو تامل ہوتا ہے۔ لڑکیوں کے بہت سے مڈل اور ثانوی اسکولوں میں ناکافی تدریسی سہولتیں اور پست معیار ہیں خاص طور سے ایسے مضامین میں جیسے ریاضیات اور سائنس اور اس کے باعث طالبات کے لیے مضامین کا انتخاب محدود ہوگیا ہے۔ عورتوں کے کالجوں کے بیحد تیز رفتار اضافے کے باعث (جن کی تعداد ۱۹۵۳-۵۴ء میں ۸۱ تھی جو ۱۹۶۱-۶۲ء میں ۳۲۵ ہوگئی) بہت سے ایسے ادارے قائم ہوگئے ہیں جن میں طالبات کی تعداد بہت کم ہے (۲۵۰ کالجوں میں ۵۰۰ سے کم اور ۵۵ کالجوں میں ۱۰۰ سے کم)، ان کی مالی حالت بھی اچھی نہیں اور تدریس کا معیار بھی بہت پست ہے۔ یہ صورت حال اس پالیسی کے باعث پیش آئی کہ اداروں کو تسلیم کرنے کے لیے جو شرائط اہلیت تھیں ان کو نرم کرکے اور یونیورسٹیوں اور حکومت کی طرف سے خصوصی مالی امداد فراہم کرکے عورتوں کے کالجوں کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ ہمارا یہ خیال ہے کہ کم معیاری یا محدود تعلیم کی اشاعت مساوی مواقع کے حصول میں مددگار نہیں ہوگی

اور خود عورتوں کی تعلیم کے داعیہ کو نقصان بھی پہونچا سکتی ہے۔ معیاروں کے متعلق نگرانی بہت ضروری ہے اور اس کو حوصلہ افزائی اور امداد کی پالیسی کا ایک حصہ ہونا چاہیئے۔

۴۔ **معلّمات:** یہ بات ہمیشہ ہی تسلیم کی گئی ہے کہ معلمات کی تعداد کو بڑھانا تعلیم نسواں کی ترقی کے لیے ایک لازمی شرط ہے۔ ۱۹۴۷ء میں اسکول ٹیچرز کا صرف ۱۲٫۴۰ فی صد عورتیں تھیں۔ ۱۹۷۳-۷۴ء میں یہ تناسب بڑھ کر پرائمری اسکولوں میں ۲۶ فی صد۔ مڈل اسکولوں میں ۲۷ فی صد اور ثانوی اسکولوں میں ۳۰ فی صد ہوگیا تھا۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں میں یہ تناسب ۱۹۵۰-۵۱ء میں ۵٫۵۰ فی صد تھا جو ۱۹۷۰-۷۱ء میں بڑھ کر ۱۵ فی صد ہوگیا اور معلّمات کی سب سے زیادہ تعداد تعلیم کے مضمون میں (۲۲٫۹۰ فی صد) آرٹس میں (۱۹٫۷۰ فی صد) اور ڈاکٹری میں (۱۲٫۲۱ فی صد) تھی۔ وہ یونیورسٹی کے علاوہ اساتذہ کا ۱۳٫۶۰ فی صد سائنسوں میں اور ۱۰٫۸۰ فی صد قانون میں تھیں اور دیگر شعبوں میں ان کی تعداد ناقابل لحاظ تھی۔ پرائمری اسکولوں کے اساتذہ میں ان کے کم تناسب کا خاص سبب وہ مشکلات ہیں جن کا سامنا عورتوں کو دیہی علاقوں میں ملازمت کرنے میں کرنا پڑتا ہے اور جن کی وجہ ان کے خاندان کی مزاحمت، دیہات میں عدم تحفظ کا خوف اور اس قسم کی جسمانی راحتوں اور سہولتوں کا فقدان ہوتا ہے جیسے جائے رہائش، سامان کی فراہمی، آمدورفت کے لیے سواری کا انتظام اور طبّی سہولتیں۔ ہمارے خیال میں مندرجہ بالا دشواریوں کو اولیت کی بنیاد پر دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ تاکہ شہری اور دیہی علاقوں کے درمیان تعلیم نسواں کی ترقی میں جو موجودہ عدم توازن ہے اس کو کم کیا جاسکے اور تربیت یافتہ باستعداد استانیوں میں بڑھتی ہوئی بے روزگاری کو روکا جاسکے۔ ہمیں یہ بھی اطلاع دی گئی کہ خواتین انسپکٹروں کی ناکافی تعداد معلّمات کے لیے بعض دشواریاں پیدا کر دیتی ہے خاص طور سے ان اسکولوں میں جہاں صرف ایک استانی ہوتی ہے کچھ ریاستوں میں جہاں خواتین انسپکٹروں کا ایک مستقل حلقہ نہیں ہے معلّمات نے مرد انسپکٹروں کے خراب سلوک، بلیک میل یا استحصال کی شکایات کی ہیں۔

خواندگی

اس تمام توسیع کے باوجود جو باضابطہ تعلیمی نظام میں ہوئی ہے ہندوستان کی عورتوں کی بہت بڑی اکثریت کی تعلیم تک رسائی نہیں ہے۔ سے اور ناخواندہ ہے۔ اگرچہ عورتوں کی خواندگی کی شرح جو ۱۹۰۱ء میں ۰٫۶۹ فیصد تھی۔ ۱۹۷۱ میں بڑھ کر ۱۸٫۷۲ فی صد ہوگئی اور فی ہزار مردوں کے مقابلے میں خواندہ عورتوں کی تعداد ۶۸ سے بڑھ کر ۴۳۵ تک پہونچ گئی تاہم ناخواندہ عورتوں کی تعداد بھی جو ۵۱-۱۹۵۰ء میں ۱۲ کروڑ ۱۹ لاکھ تھی بڑھ کر ۷۱-۱۹۷۰ء میں ۲۱ کروڑ ۵۳٫۰ لاکھ ہوگئی۔ اس کے مقابلے میں ناخواندہ مردوں کی تعداد ۱۰ کروڑ ۹۹ لاکھ سے بڑھ کر ۱۴ کروڑ ۲۰ لاکھ ہوئی۔ ۱۵ تا ۲۴ سال عمر کے گروپ میں ۲ کروڑ ۹۸ لاکھ یا ۶۷٫۵ فی صد عورتیں ناخواندہ ہیں۔ ۲۵ سال اور اس سے اوپر عمر کے گروپ میں یہ تعداد بڑھ کر ۹ کروڑ ۵۴ لاکھ یا ۸۸٫۱۹ فی صد ہوجاتی ہے۔ عمر کے ان دونوں گروپوں میں جو تھوڑی سی تعداد پڑھی لکھی عورتوں کی ہے اس میں ایک بڑی اکثریت کو صرف پرائمری اور مڈل سطح کی تعلیم حاصل ہے۔

آنے والے برسوں میں تعلیمی ترقی میں اولیت کے اقدامات اور ترجیحات کا تعین کرتے وقت ناخواندگی کے اس وسیع ہوتے ہوئے خلا کے چیلنج کو ذہن میں رکھنا پڑے گا۔ اس رسمی و باضابطہ تعلیمی نظام کے تقاضوں کو جو صرف ایک اقلیت اور زیادہ تر نو عمر نسل کی ضروریات کا سامان بہم پہونچاسکتا ہے بالغ عورتوں کے اس گروپ کی تعلیمی ضروریات کے ساتھ متوازن کرنا ہوگا جو سماج کی کارکنوں اور ماؤں پر مشتمل ہے۔

تعلیم نسواں کے متعلق مختلف رویے

لڑکیوں کی تعلیم کے متعلق سماجی رویے قبولیت و پسندیدگی سے لے کر قطعی بے توجہی تک مختلف نوعیت کے ہیں۔ ہمارے جائزے کے مطابق ہمارے سوالات کے جواب دینے والوں میں صرف ۱۱٫۸ فی صد یہ محسوس کرتے تھے کہ لڑکیوں کو کوئی بھی تعلیم نہیں دینا چاہیے اور ۶۴٫۵ فی صد نے اس رائے کا اظہار کیا کہ لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کرنی چاہیے خواہ وہ بہت ذہین ہی کیوں نہ ہوں۔ مردوں اور عورتوں دونوں میں تقریباً ۷۷٫۵ فی صد نے آٹھویں جماعت تک لڑکیوں

کی لازمی تعلیم کی حمایت کی۔ ماہرین تعلیم اور انتظامیہ کے عملے کے لوگ عام طور پر
اس مقصد کے لیے جبر و زبردستی کے حق میں تھے۔ لڑکیوں کی تعلیم کے متعلق قبولیت و
پسندیدگی کا دائرہ بھی شہری علاقوں میں کہیں زیادہ وسیع نظر آیا اور یہ پسندیدگی
متوسط طبقات میں سب سے زیادہ تھی۔ متمول خاندانوں کا ایک چھوٹا سا گروپ روایتی
وجوہات کی بنا پر اب تک اس کی مخالفت کرتا ہے۔ لیکن اس دوسرے گروپ
سے ایک وصف و کمال اور جدیدیت کی ایک علامت سمجھتے ہیں۔ نچلے متوسط طبقے
کا ایک بڑھتا ہوا بڑا حصہ اب اقتصادی ضرورت کی بنا پر لڑکیوں کی تعلیم کے
لیے بہت کافی قربانی کرنے کو تیار ہے۔ لیکن ایک بہت بڑا حصہ سماجی اور اقتصادی
مشکلات کی وجہ سے ابھی تک ایسا کرنے سے معذور ہے۔ مفلسی کی سطح سے نیچے
زندگی بسر کرنے والے لوگوں کی اکثریت میں غربت و افلاس ہی وہ غالب و طاقت ور
عنصر ہے جو عورتوں کی تعلیم کے بارے میں ان کے رویہ پر حکومت کرتا ہے۔ ۸ سال
کی عمر کو پہونچنے تک لڑکیوں کی ایک بڑی اکثریت کو خانہ داری کے کام کرنے
پڑتے ہیں جن میں ننھے بچوں کی نگہداشت بھی شامل ہوتی ہے۔ ان کی ایک بہت
بڑی تعداد اپنے خاندان کے لیے روزی بھی کمانے میں لگ جاتی ہے۔ ہم نے دیکھا کہ
پانچ برس کی عمر سے لڑکیاں ماں باپ کے ساتھ بیڑی کی فیکٹریوں اور غیر منظم سیکٹر کی
دوسری صنعتوں میں روزانہ ۱۰ گھنٹے کام کرتی ہیں اور گھریلو کام میں مددگار کی حیثیت
سے اپنی ماؤں کا ہاتھ بھی بٹاتی ہیں۔ ۱۲ تا ۱۶ سال کی بعض لڑکیاں بیمار اور بے
روزگار والدین کے پورے خاندانوں اور ننھے بچوں کی کفالت تنہا اپنی کمائی سے
کر رہی تھیں۔ یہ بات ذہن نشین کرنی چاہیے کہ خاندان کا بے اجرت کام کرنے
والوں میں لڑکیوں کا تناسب پورے ملک میں مقابلتاً زیادہ ہے اور ان کے
اسکول نہ جانے کی ایک بڑی وجہ بھی رہی ہے۔ لڑکیوں کی تعلیم کے متعلق اس
مخالفانہ رویہ کی دیگر سماجی وجوہات کم سنی کی شادیاں یا سگائیاں ہیں اگرچہ بہار،
اڑیسہ، مدھیہ پردیش، راجستھان اور اتر پردیش کی تعلیمی لحاظ سے تسلیم شدہ پسماندہ
ریاستوں کے علاوہ ہر جگہ یہ رواج اب زوال پر ہیں۔ تاہم شادی کے
بعد تعلیم جاری رکھنے کے متعلق لڑکیوں پر لگی ہوئی سماجی قید و بند اب کافی کم ہے

لڑکیوں کی تعلیم میں سدّراہ دیگر وجوہات جو ہمیں بتائی گئیں وہ یہ ہیں۔ ناکافی سہولتیں خاص طور سے اسکولوں کا فاصلہ، غیر متعلق اور بے تُکا تعلیمی مواد اور والدین کا یہ خوف کہ لڑکیاں پڑھ لکھ کر اپنے ماحول سے بیگانہ ہوجائیں گی۔

لڑکیوں کی تعلیم کو سبسے زیادہ طاقت در حمایت شادی کے بازار میں اپنی بڑھتی ہوئی مانگ سے حاصل ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے جواب دینے والوں میں سے تقریباً ۴۳ر۰ فی صد لوگوں نے بتایا کہ لڑکی کی شادی کے امکانات کو بہتر بنانے میں تعلیم مدد کرتی ہے لیکن تعلیم میں اور شادی کے بہتر مواقع میں جو باہمی تعلق ہے وہ مختلف طریقوں سے کام کرتا ہے چونکہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ پڑھی لکھی لڑکیوں کے لیے ان سے زیادہ تعلیم یافتہ لڑکے ڈھونڈھنا ضروری ہیں اس لیے لڑکیوں کی تعلیم جہیز میں ایک اضافہ کا سبب بن جاتی ہے اور یہ دوہرا خرچ لڑکیوں کی تعلیم پر ایک روک کا کام کرتا ہے۔ بہت سے والدین نے ہمیں بتایا کہ یہی سبب ہے جس کی بنا پر وہ اپنی لڑکیوں کو پرائمری جماعتیں پاس کرنے کے بعد اسکول سے اٹھا لیتے ہیں۔

<u>تعلیمی ترقی میں دیگر اقسام کے عدم توازن</u> | تعلیم ایک دودھاری آلہ ہے جو سماجی معاشی نابرابریوں کو ختم کرسکتا ہے لیکن جو افراد اس سے لیس ہیں اور جو اس سے لیس نہیں ہیں ان کے درمیان ایک نئی قسم کی نابرابری پیدا بھی کرسکتا ہے۔ ناخواندہ عورتوں کی تعداد میں شدید اضافہ اور شہری اور دیہی علاقوں کے درمیان تعلیمی ترقی کے فرق سے قطع نظر ترقی یافتہ اور پسماندہ طبقوں کے درمیان اور خطّہ جات کے درمیان تعلیمی ترقی میں شدید قسم کے عدم توازن موجود ہیں۔ عورتوں کی تعلیم اور خواندگی میں یہ عدم توازن خطّہ واری نابرابریوں کا نتیجہ ہیں جن میں عورتوں کے متعلق خطّہ واری رویّوں کے تنوعات کا عکس نظر آتا ہے۔ مختلف سطحوں پر عورتوں کی تعلیم کی ریاست وار ترقی کے ایک تفصیلی تجزیہ سے یہ انکشاف ہوا کہ اگرچہ ان سب ہی نے بڑی تیز ترقی کی ہے تاہم اس ترقی کی شرح مختلف ریاستوں میں ناہموار رہی ہے۔ اگر ایک طرف بہار اور راجستھان تمام سطحوں پر یکساں پست ترین کارگزاری کا نمونہ پیش

کرتے ہیں تو دوسری طرف آندھرا پردیش، آسام، مہاراشٹر، کرناٹک، اتر پردیش، ہماچل پردیش۔ منی پور اور تری پورہ نے پرائمری سطح پر تعلیم کے زیادہ اونچی شرح حاصل کی ہے۔ جن ریاستوں میں پرائمری اور مڈل دونوں سطحوں پر طالبات کی تعداد میں ترقی مساوی طور سے اونچی رہی ہے وہ صرف جموں اور کشمیر، کیرالا، ناگالینڈ، دہلی اور تامل ناڈو ہیں۔ مغربی بنگال کا معاملہ بالکل منفرد ہے کیونکہ اس نے اس مدت کے دوران پرائمری سطح پر اپنی تعلیمی پوزیشن کو صرف برقرار رکھا ہے اور مڈل سطح پر پیچھے ہٹ گیا ہے۔ ثانوی سطح پر صرف کیرالا، تامل ناڈو اور دہلی نے یقینی طور پر ترقی دکھائی ہے۔ یونیورسٹی کی سطح پر زیادہ تر ریاستوں میں ایک نمایاں ترقی ہوئی ہے۔ مگر پیشہ ورانہ ٹیکنیکی کورسوں میں اسکول کی سطح پر ترقی کی رفتار سست رہی ہے اور آسام، مہاراشٹر اور دہلی کے علاوہ بہت سی ریاستوں میں تو اس میں کوئی بھی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ یونیورسٹی کی سطح پر ٹیکنیکی اور پیشہ ورانہ تعلیم کی ترقی کی رفتار سب ریاستوں میں برائے نام ہے۔ یہ صورت حال عورتوں کی تعلیم میں بوقلمونی پیدا کرنے اور تعلیم یافتہ عورتوں کے روزگار کے مواقع کو بہتر بنانے میں معاون نہیں ہوسکتی۔ اگرچہ ہم نے لڑکیوں کی تعلیم کی ترقی اور عورتوں کی خواندگی کی شرح کے درمیان ایک معنی خیز باہمی تعلق پایا لیکن ایسا کوئی بھی وہ ربط لڑکیوں معنی خیز باہمی تعلق لڑکیوں کی تعلیم اور (۱) ریاست کی فی کس آمدنی (۲) آبادی کی گنجانی اور (۳) جنسی تناسب کے درمیان قائم نہیں کیا جاسکا۔ مگر عورتوں کی خواندگی کی شرح پر آبادی کے ترکیبی اجزا کا بڑا اثر پڑتا ہے۔ جن شہروں اور خطوں میں مسلمانوں یا مندرجہ فہرست ذاتوں اور قبیلوں کا تناسب زیادہ ہے وہاں خواندگی کی شرحیں کم ہیں جبکہ ان علاقوں میں جہاں عیسائیوں کا تناسب نسبتاً زیادہ ہے خواندگی کی شرح زیادہ ہے۔ اگرچہ شہری اور دیہی خواندگی کی شرحوں میں بہت فرق ہے تاہم مجموعی طور پر جنوبی ریاستوں نے عورتوں کی خواندگی کی نسبتاً اونچی شرح ہمیشہ برقرار رکھی ہے۔

مسلمان عورتوں میں خواندگی کی کم شرح کے علاوہ اقلیتی فرقوں کے متعلق

ہمارے جائزے سے یہ انکشاف ہوا کہ جن مسلمان عورتوں نے کوئی بھی رسمی اور باضابطہ تعلیم نہیں پائی ہے ان کی تعداد پہلے کی طرح اب بھی بہت زیادہ ہے ان ریاستوں میں بھی جو اور باتوں کے لحاظ سے تعلیم نسواں کو فروغ دینے کے سلسلے میں بہت آگے بڑھ چکی ہیں (مثلاً کیرالہ)۔ اسی طرح مندرجہ فہرست ذاتوں اور مندرجہ فہرست قبیلوں کی عورتیں اب بھی خواندگی اور تعلیم دونوں میں دوسری عورتوں اور خود اپنے فرقوں کے مردوں سے پیچھے ہیں۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق مندرجہ فہرست ذاتوں کی ناخواندہ عورتوں کا تناسب دیہی علاقوں ان کی عورتوں کی کل آبادی میں ۹۰۵ فی ہزار اور شہروں میں ۹۰۰ فی ہزار تھا (اور اس کے مقابلے میں ناخواندہ مردوں کا تناسب ۸۲۲ اور ۶۹۶ فی ہزار تھا) اس چھوٹے سے خواندہ گروپ میں بڑی اکثریت ان عورتوں کی ہے جو خواندہ تو ہیں لیکن تعلیمی سطح پر ان کی کوئی حیثیت نہیں۔

عورتوں کی تعلیم پر ان عمرانی عناصر کا جو اثر پڑتا ہے وہ تعلیمی ترقی کا اندازہ لگانے میں قومی یا ریاستی اوسطوں کی قدر و قیمت کو کم کر دیتا ہے۔ ایک ہی ریاست کے مختلف ضلعوں میں عورتوں کی خواندگی کی شرحیں مختلف ہیں اور بعض اوقات ان میں ۶٫۴ سے ۲۹٫۵ فی صد (آندھرا پردیش)، ۲٫۸ سے ۳۳٫۸ فی صد (اتر پردیش) اور ۹.۰ فی صد سے ۳۱٫۴ فی صد (مدھیہ پردیش) تک کا فرق پایا جاتا ہے۔ ہماری رائے میں ایسے تعلیمی منصوبے جو ان سماجی اور علاقائی عدم توازنوں کا لحاظ نہیں کرتے۔ آبادی کے مختلف حصوں کے درمیان نابرابریوں کو شدید بنا دیں گے۔ یہ ضروری ہے کہ جو عناصر ان کے ذمہ دار ہیں ان کو شناخت کیا جائے اور خاص پروگراموں کی مدد سے ان کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔

مخلوط تعلیم ہندوستانی تعلیم کے میدان میں مخلوط تعلیم کا مسئلہ طویل مدت سے ایک بحث و مباحثہ کا موضوع بنا ہوا ہے۔ اگرچہ اس کے دفاع میں جو دلیلیں وسائل اور معیشت سے زیادہ بھرپور فائدہ اٹھانے کے نقطۂ نظر سے دی جاتی ہیں وہ رفتہ رفتہ میدان فتح کرتی جا رہی ہیں تاہم تعلیم نسواں کے حامیوں نے اس پر اس خیال کے تحت اعتراض کیا ہے کہ تعلیم نسواں کے خلاف

سماجی بدظنی کو زیادہ آسانی سے دور کیا جاسکتا ہے اگر لڑکیوں کو علیحدہ اداروں میں تعلیم دی جائے۔ اس سلسلے میں اپنی تحقیق کے دوران ہمیں نقطۂ نظر کے اس اختلاف کی شہادت مسلسل ملتی رہی۔ وہ فرقے جن میں پردہ کا رواج ہے فطری طور پر لڑکیوں کے لیے جداگانہ اسکولوں کا مطالبہ کرتے ہیں۔ (لیکن کشمیر میں اس قسم کا کوئی مطالبہ نہیں ہے) کچھ علاقوں میں مخلوط تعلیم کی یہ مزاحمت ہندؤں میں مسلمانوں سے زیادہ ہے۔ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ یہ مزاحمت شہری متوسط طبقے کے ایک مظہر کی حیثیت زیادہ رکھتی ہے۔ جس کی وجہ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں نظم و ضبط کی بڑھتی ہوئی کمی اور ہنگامہ خیزی ہے۔ لیکن کم تعلیم یافتہ طبقوں کو خواہ وہ دیہی علاقوں میں ہوں یا شہری علاقوں میں مخلوط تعلیم پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ مخلوط تعلیم کی حمایت میں ایک نئی دلیل یہ ہے جو بہار جیسی سماجی طور پر پسماندہ ریاست نے بھی پیش کی ہے کہ مخلوط تعلیم کے ادارے پڑھائی کے بہتر معیار فراہم کرتے ہیں اور طلبا کی بہتر کارگزاری پیش کرتے ہیں۔ تعلیمات عامّہ کے ڈائرکٹروں سے لے کر دیہی علاقوں میں کام کرنے والے گشتی عملہ کے افراد تک تمام عہدہ داروں کے درمیان ایک استصواب رائے کیا گیا تو اس سے پرائمری اور مڈل سطحوں پر مخلوط تعلیم کی زبردست حمایت کا اظہار ہوا۔

ہماری رائے میں کارکردگی معیشت اور مساوی مواقع کے ملحوظات یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ مخلوط تعلیم کو ایک لمبی مدت کی پالیسی کے طور پر تسلیم کرلینا چاہیئے لیکن اختلافی سماجی رویّوں کے پیش نظر ہم یہ سفارش کرتے ہیں کہ:۔

۱۔ پرائمری سطح پر مخلوط تعلیم کو عام پالیسی کے طور پر اختیار کرلینا چاہیے۔

۲۔ مڈل اور ثانوی سطحوں پر اُن علاقوں میں جداگانہ اسکول فراہم کیے جائیں جہاں اس سلسلے میں ایک بڑا مطالبہ موجود ہو اور اس کے ساتھ برابر یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ مخلوط تعلیم کے حق میں رائے عامّہ کو ہموار کیا جائے۔

۳۔ یونیورسٹی کی سطح پر عام پالیسی کے طور پر مخلوط تعلیم کو اختیار کیا جائے اور خالص لڑکیوں کے لیے نئے کالج کھولنے کی ہمت افزائی نہ کی جائے۔

۴۔ خالص لڑکوں کے اداروں میں لڑکیوں کی داخلے سے پابندی ہٹائی جائے۔

۵۔ خالص لڑکیوں کے اداروں میں مطلوبہ معیاروں کے متعلق نگرانی رکھی جائے۔

۶۔ تمام مخلوط اسکولوں کے لیے سرکاری طور پر تسلیم کیے جانے کی ایک شرط کے طور پر مخلوط عمل کے اصول کو قبول کیا جائے جس پر اس کے نفاذ کے چند سال بعد نظرثانی کی جائے اور تمام مخلوط اداروں میں لڑکیوں کے لیے جداگانہ بیت الخلا اور خلوتی کمرے فراہم کیے جائیں۔

تعلیمی نصابات

عورتوں کی تعلیم کے بارے میں روایتی نقطۂ نظر کے نتیجے میں لڑکیوں کے لیے مختلف نصابات پر زور دیا گیا تھا اور ان مضامین پر خاص زور تھا جو لڑکیوں کے لیے خاص طور سے موزوں خیال کیے جاتے تھے جیسے گھریلو سائنس۔ سوزن کاری۔ اور فنون لطیفہ۔ اس کا یہ نتیجہ بھی ہوا کہ لڑکیوں کے بیشتر اداروں میں مختلف قسم کی سائنس اور ریاضیات جیسے مضامین کو پڑھانے کی سہولتیں فراہم نہیں کی جاتی تھیں۔ اس طرز عمل کو لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے" نصابات تعلیم کے اختلاف کی کمیٹی" ۱۹۶۴) اور تمام سطحوں پر ایک مشترک نصاب کی سفارش کی گئی، تاکہ اُن روایتی رویوں کے اثرات کا توڑ کیا جاسکے جو بعض کتابوں کو "مردانہ" اور بعض کو "زنانہ" سمجھتے ہیں۔ تعلیمی کمیشن (۱۹۶۶) نے ان سفارشات کی تائید کی۔ ہم نے دیکھا کہ اس نئے رجحان کو وسیع طور پر قبول کیا گیا لیکن چند ریاستیں لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے مختلف تعلیمی نصابات مقرر کرنے کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں۔

ہم دسویں جماعت تک عام تعلیم کے ایک مشترک نصاب کی سفارش کرتے ہیں جس میں لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے تمام اختیاری مضامین کا دروازہ کھلا ہوا ہو۔ پرائمری مرحلے پر سب بچوں کو آسان و سادہ سوزن کاری، موسیقی اور رقص سکھانا چاہیے۔ مڈل کے مرحلہ سے کام کے تجربے کی بنا پر مضامین کے تنوعات کی اجازت دی جائے اور دونوں جنسوں میں کسی کے بھی طلبا کو کسی مضمون میں جبریہ طور پر داخل یا خارج نہیں کرنا چاہیے۔ گیارھویں اور بارھویں جماعت میں لڑکوں کے لیے پیشہ ورانہ اور ٹیکنکی نصابات کا دروازہ کھلا ہوا ہونا چاہیے۔

پرائمری تعلیم سے قبل کے اسکول

اچھی قبل از اسکول تعلیم ان بچوں کو اپنے ماحول کی دشواریوں پر غالب آنے میں اور مساواتی قدریں

اختیار کرنے میں مدد دیتی ہے کیونکہ اس عمر میں ذات پات، طبقہ، مذہب، مسلک یا جنس کے اختلافات سے ناواقف ہوتے ہیں اس سلسلے میں دیہی "بال واڑیوں" کی کامیابی سے ہم بہت متاثر ہوئے۔ پرائمری تعلیم سے قبل کے یہ اسکول چھوٹے بچوں کی ماؤں کو راحت و فرصت دینے اور نسبتاً بڑی لڑکیوں کے لیے اسکول جانے کے امکانات کو بڑھانے میں بھی مدد کرتے ہیں۔ ہم سفارش کرتے ہیں کہ تین سال قبل از اسکول تعلیم تمام بچوں کے لیے فراہم کی جائے اور دیہی علاقوں میں اور شہری گندہ بستیوں کے مقامات میں "بال واڑیوں" کی تعداد بڑھانے کے لیے خصوصی کوششیں کی جائیں۔ ان کو مقامی علاقہ کے مڈل اور ثانوی اسکولوں سے حتی الامکان قریب ہونا چاہیئے

پرائمری اور مڈل سطح کی تعلیم

ہم یہ سفارش کرتے ہیں کہ (۱) اگلے پانچ سال کے اندر اندر ایسے پرائمری اسکول فراہم کیے جائیں جو ہر ایک بچے کے گھر سے اتنے فاصلہ پر ہوں کہ وہاں وہ پیدل جا سکے (۲) ایسے دیہات کے مجموعوں کے لیے جو دشوار گزار علاقوں میں بکھرے ہوئے ہیں آشرم یا رہائشی اسکول قائم کیے جائیں (۳) خانہ بدوش قبائل۔ نقل سکونت کرنے والے مزدوروں اور تعمیراتی کام کرنے والوں کے بچوں کے لیے گشتی اسکول مہیا کیے جائیں (۴) سرکاری عہدیداران اور غیر عہدیداران ہر ایک لڑکی کو اسکول میں لانے کے لیے مسلسل و مستقل پروپگنڈا کرتے رہیں (۵) محرکات و ترغیبات کی فراہمی (جن میں دوپہر کا ناشتہ، مفت وردیاں۔ وظیفے مفت کتابیں اور بستی کے لوگوں، استادوں اور طالب علموں کے لیے انعامات یا اعزازات شامل ہیں) تاکہ پڑھائی چھوڑنے کے واقعات کو روکا جا سکے۔ (۶) ہر اسکول میں کم از کم دو استادوں کی فراہمی اور پرائمری استانیوں کے تناسب کو بڑھا کر ۵۰ یا اس سے زیادہ کر دینا (۷) ان لڑکیوں کے لیے جو ایک کل وقتی بنیاد پر اسکول میں حاضری نہیں دے سکتیں ایک جزوی داخلہ (Multiple entry.) کا نظام اور ایک جزوی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ (۸) ہر ایک اسکول میں کوئی جگہ ان زیادہ چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال کے لیے فراہم کی جائے جو اسکول جانے والی لڑکیوں کی سپردگی میں رہتے ہیں۔ (۹) مڈل کے مرحلہ سے اسکولوں میں جنسی تعلیم کا انتظام کیا جائے (اس مقصد کے لیے پڑھائی کا تدریجی مواد تیار کرنے کے لیے ماہرین کا ایک گروپ

مقرر کیا جائے۔)

ثانوی تعلیم ہم یہ سفارش کرتے ہیں کہ (۱) سب لڑکیوں کے لیے ثانوی مرحلہ کے اختتام تک مفت تعلیم ہونی چاہیے (۲) کامرس، سائنس اور ریاضیات پڑھانے کی سہولتوں کو بہتر بنایا جائے (۳) متعین روزگار کی سمت میں کام کا تجربہ عطا کرنے کا طریقہ شروع کیا جائے اور اس کو علاقہ کی ضروریات۔ وسائل اور روزگاری کے امکانات کے ساتھ مربوط کیا جائے (۴) نصابی تعلیم کے ساتھ ساتھ چلنے والی دیگر سرگرمیوں کا کافی انتظام ہونا چاہیے (۵) ضرورت اور لیاقت دونوں کی مشترکہ بنیاد پر دیے جانے والے وظیفوں اور ہوسٹل کی سہولتوں کی فراہمی میں اضافہ کیا جائے۔

اعلیٰ تر تعلیم

اگرچہ اس سیکٹر میں عورتوں کی ترقی اس قدر غیر اطمینان بخش نہیں رہی ہے جتنی کہ اسکولوں کی سطح پر تاہم ہمیں اس رائے سے اتفاق نہیں جو لڑکیوں کی اعلیٰ تر تعلیم کو ایک تضییع اور تحصیل لاحاصل قرار دیتی ہے کیونکہ ان میں سے بہت سی لڑکیاں اپنے علم کو کسی بھی سماجی مقصد کے لیے استعمال نہیں کرتیں۔ یہ تو سماج کا کام ہے کہ اس طرح کی تعلیم یافتہ عورتوں کے لیے اور زیادہ مواقع مہیا کرے تاکہ وہ اپنی صلاحیتوں کو سماجی اور قومی ترقی کے لیے استعمال کرکے سماج کے لیے مفید بن سکیں۔ اس لیے ہم سفارش کرتے ہیں کہ (۱) روزگار کے اور زیادہ مواقع پیدا کیے جائیں خاص طور سے جز وقتی نوعیت کے اور (۲) اعلیٰ تر تعلیم کے میدان میں داخل ہونے والی عورتوں کے لیے روزگاری معلومات اور رہنما سروسوں کو بہتر بنایا جائے۔

غیر رسمی تعلیم

آج ہندوستان میں عورتوں کی تعلیم کا سب سے بڑا مسئلہ اس زبردست اکثریت کے لیے کسی بنیادی تعلیم کا انتظام ہے جو اپنی عمر، سماجی معذوریوں اور خواندگی کے خلا کی وجہ سے رسمی درباضابطہ تعلیم تک ان کی رسائی نہیں ہے عورتوں کو قومی نشوونما کے عمل میں ضم کرنے کے لیے یہ لازمی ہے کہ عورتوں کی اس زبردست اکثریت کو کوئی تعلیم دی جائے جو ناخواندہ اور نیم خواندہ خواتین پر مشتمل ہے اور ۱۵ تا ۲۵ سال کی عمر کے گروپ میں ہے۔ بالغوں کی تعلیم اور خواندگی کے میدان میں سرکاری کوششیں ابھی

تک کچھ غیر موثر ہی رہی ہے اور جو غیر رسمی تربیتی پروگرام ہیں مثلاً عورتوں اور غیر طالب علم نوجوانوں کے لیے عمل خواندگی اپنی اس خصوصیت کے لحاظ سے خطرناک رجحانات کا اظہار کرتے ہیں کہ ان میں مردوں اور عورتوں کے لیے معین کردہ تعلیمی مواد میں امتیاز روا رکھا جاتا ہے۔ عورتوں کے لیے خانذانی زندگی، صحت، غذا اور بچوں کی نگہداشت پر زور دیا جاتا ہے۔ ہماری رائے میں یہ امتیازات اب بے معنی ہوگئے ہیں کیونکہ خاندان کے مناسب انتظام میں مردوں اور عورتوں کی مشترکہ کوششوں کی ضرورت ہوتی ہے، اسی کے ساتھ ساتھ پیشہ ورانہ اور روزگاری ہنر مندیوں کے لیے عورتوں کی ضروریات مردوں سے بھی زیادہ ہوگئی ہیں۔ ان پروگراموں کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ ان کے طرز عمل میں ایک محدود مخصوص مقصد کا انداز ہے اور ان مختلف کارکن جماعتوں کے درمیان باہمی ربط کا فقدان ہے جو ان پروگراموں کو اختیار کرتی ہیں۔ انتظامی مشینری کے دوہرے کام پر وسائل بہت کچھ ضائع ہوتے ہیں۔ اب جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ غیر رسمی تعلیم کا ایک نظام تیار کیا جائے جس میں فرقہ و جماعت کے تمام دستیاب تعلیمی وسائل کو بروئے کار لایا جائے (مثلاً استاد، صحت سے متعلق عملہ اور زرعی توسیع، مزدور۔ کامیاب کسان مستری۔ فلاحی کارکن اور دوسرے تعلیم یافتہ افراد) نظام مربوط و مسلسل ہونا چاہیئے اور اس کو خالی وقت میں مفید چیزوں کے سیکھنے پر زور دینا چاہیئے۔ اس کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ عورتیں آسانی کے ساتھ معلومات حاصل کرسکیں اور ان معلومات کو سماجی زندگی میں بہتر طور پر حصہ لینے کے لیے استعمال کرسکیں۔ عمل خواندگی میں یقیناً اس پورے پروگرام میں قلب کی حیثیت دینی ہوگی۔

ہمارے خیال میں اس پروگرام کی تنظیم اور اہتمام کا کام عورتوں کی ان پنچایتوں کے سپرد کردینا چاہیے جن کی ہم سفارش کرچکے ہیں۔ حکومت کا رول صرف تکنیکی رہنمائی و مشورہ فراہم کرنے تک محدود ہونا چاہیے جس کے تحت مقامی سطح پر سرکاری عاملین کو یہ اجازت دی جائے کہ وہ اس پروگرام کے عمل میں، لٹریچر اور پڑھنے کے مواد کی شکل میں سہارا دینے والی امداد فراہم کرنے میں اور دیہات اور تنگ و تاریک علاقوں میں بنیادی لائبریریاں قائم کرنے میں حصہ لیں۔ یہ سفارش کرتے ہیں کہ اس بنیادی ڈھانچے کے مہیا کرنے پر حکومت اپنی کوششیں مرکوز کردے۔

جنسی مساوات

تعلیمی عمل کے ذریعہ پیدا کی جانے والی ایک بڑی قدری حیثیت

تعلیمی نظام ہی صرف ایک ایسا ادارہ ہے جو جنسوں کی عدم مساوات کی اُن گہری بنیادوں کے خلاف موثر کام کرسکتا ہے جو سماجی رنگ اختیار کرنے کے عمل کے دوران مردوں اور عورتوں کے ذہنوں میں تعمیر ہوئی ہیں۔ اس کو ایک مستحکم ارادے منصوبہ بندی اور استقلال کے ساتھ اس امر کی کوشش کرنا ضروری ہے کہ اس روایتی نظامِ قدر کو ہٹاکر جو عدم مساوات پر مبنی ہے اس کی جگہ جدید نظام قدر قائم کیا جائے جو جنسوں کی مساوات کو تسلیم کرتا ہے۔ بدقسمتی سے تعلیمی نظام نے اس ذمہ داری کو قبول کرنے کے بجائے اپنے تعلیمی نصابات جنس کی بنیاد پر مضامین کی تقسیم اور طلبا پر مسلط کردہ غیر تحریری ضوابط عمل کے ذریعہ روایتی تعصبات کو پائیدار بنانے میں مدد کی ہے۔ یہ وہ میدان ہے جہاں تعلیم کے مواد اور اس کی تنظیم میں ایک بڑی تبدیلی کی ضرورت ہے۔

ساتواں باب

سیاسی حیثیت

عورتوں کی سیاسی حیثیت کی تعریف اس طرح کی جاسکتی ہے کہ یہ حیثیت نام ہے عورتوں کی اس مساوات و آزادی کے درجہ کا جو ان کو اقتدار کی تشکیل کرنے اور اقتدار میں حصّہ پانے کے سلسلے میں نیز اس قدروقیمت کے تحت حاصل ہے جو کہ سماج ان کے اس رول سے منسوب کرتا ہے۔ دستور ہند میں عورتوں کی سیاسی مساوات کو تسلیم کرنا ایک بنیادی انحراف تھا نہ صرف روایتی ہندوستانی سماج کے موروثی معیاروں سے بلکہ اس وقت کے بیشتر ترقی یافتہ ملکوں کے سیاسی معیاروں سے بھی* عورتوں کی سیاسی مساوات کے حصول میں جو بڑی قوتوں نے کیمیاوی تغیر پیدا کرنے والے عناصر کی طرح کام کیا وہ تھیں قومی تحریک اور مہاتما گاندھی کی قیادت۔

انیسویں صدی کی اصلاحی تحریکوں نے عورت کی حیثیت کو روایتی خاندانی ڈھانچے کے اندر ہی بہتر بنانے تک اپنی کوششوں کو محدود رکھا تھا۔ اس صدی کے تغیر نے عورتوں کی ایک اقلیت کو اپنے گھروں سے باہر سماجی فلاح و بہبود کی سرگرمیوں خصوصاً تعلیم نسواں سماج کے کمزور تر طبقوں کی فلاح و بہبود اور مصیبت زدہ لوگوں کی راحت رسانی کے کاموں

---

* سوشلسٹ ملکوں کے علاوہ دنیا کے اور کسی بھی ملک نے عورتوں کی مساوات کو ایک اصول و فطری امر کے طور پر تسلیم نہیں کیا تھا۔

میں رضاکارانہ طور پر حصہ لیتے ہوئے پایا۔ ان سے بھی چھوٹے ایک اور گروپ نے انقلابی تحریک میں حصہ لیا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں عورتوں کی تنظیمیں پیدا ہونے لگیں اور سیاسی حقوق کے لیے مطالبہ شروع ہوگیا۔ ۱۹۱۷ء میں شریمتی سروجنی نائیڈو کی قیادت میں ہندوستانی عورتوں کے ایک وفد نے مردوں کے ساتھ مساوات کی بنیاد پر عورتوں کے حق رائے دہندگی کے لیے ایک مطالبہ برطانوی پارلیمنٹ کو پیش کیا۔ ۱۹۲۱ء کے "قانون اصلاحات" (Reform Act) نے حق رائے دہندگی صرف ان شادی شدہ عورتوں کو عطا کیا جو تعلیم یافتہ اور صاحب جائداد ہوں۔ غیر ملکی حکمراں یہ یقین نہیں کرسکتے تھے کہ ہندوستانی سماج کبھی بھی عورت کو مرد کا برابر کا شریک تسلیم کرے گا اور نہ وہ عورتوں کو ایک الگ سیاسی طاقت سمجھتے تھے۔ ان رویوں سے شدید طور پر متضاد مہاتما گاندھی کا رویہ تھا۔ انھوں نے یہ اعلان کردیا تھا کہ وہ "عورتوں کے حقوق کے معاملے میں بے لوچ اور غیر مصالحت پسند" ہیں۔ ان کا عقیدہ تھا کہ سماج کی تعمیر میں عورتوں کو ایک مثبت رول ادا کرنا ہے اور یہ کہ سماجی انصاف قائم کرنے کے لیے ان کو مرد کے مساوی تسلیم کرنا ایک ناگزیر اقدام ہے۔ انھوں نے حق رائے دہندگی کے لیے بھی اپنی مسلسل اور غیر مشروط حمایت پیش کی تھی۔ "تحریک آزادی" میں عورتوں کی زبردست اجتماعی شرکت کے ساتھ مل کر اس چیز نے سماجی اور سیاسی چیدہ شخصیتوں پر ایک براہ راست اثر ڈالا جن میں ان طبقات کی عورتیں بھی شامل تھیں ۱۹۳۰ میں عورتوں کی نمائندہ تنظیموں کے ایک جلسہ نے جنسی امتیاز کے بغیر بالغ رائے دہندگی کو فوری طور پر قبول کرنے کا مطالبہ کیا۔ اگرچہ حکومت نے اس کو رد کردیا تاہم ۱۹۳۱ میں "انڈین نیشنل کانگریس" کے اجلاس کراچی نے یہ مطالبہ تسلیم کرلیا اور بلحاظ حیثیت و قابلیت عورتوں کی مساوات کا خود کو پابند بنالیا۔ یہ وعدہ آزادی کے بعد پورا کیا گیا جب دستور نے قوم کی طرف سے فرد کی آزادی اور وقار کے اصولوں کو ماننے کا عہد کیا اور سیاسی و قانونی مساوات پر عورتوں ... بنیادی حق کا اعلان کیا اور مملکت کے تحت روزگار دفتر ... عدم امتیاز کی ضمانت دی۔

آزادی کے بعد گزرنے والے برسوں میں ان حقوق کا جو اثر ہوا اس کا جائزہ لینے ... ہماری بنیادی پوزیشن بھی وہی ہے جو مہاتما گاندھی کی تھی۔ جوکہ ان حقوق کو حیثیت اور

مواقع کی عام مساوات اور معاشرتی اقتصادی اور سیاسی انصاف حاصل کرنے کے آلات سمجھتے تھے۔ ہم بھی عورتوں کی سیاسی حیثیت کا تعین کرنے کے لیے تین بڑے پیمانے استعمال کرنے کی تجویز پیش کرتے ہیں یعنی (۱) انتخابات میں رائے دہندگان اور امیدواران کی حیثیت سے سیاسی عمل میں شرکت۔ (۲) سیاسی رویے جیسے سیاست سے واقفیت، پابندی ذمہ داری معروفیت اور سیاسی فعل و حرکت اور طرز عمل میں خودمختاری اور (۳) سیاسی عمل پر ان چیزوں کا اثر۔

انتخابات میں رائے دہندگان اور امیدواران کی حیثیت سے شرکت

انتخابی اعداد و شمار حق رائے دہی رکھنے والی ان عورتوں کی تعداد میں اضافہ کا ایک عام رجحان ظاہر کرتے ہیں جو ووٹ دینے آتی ہیں۔ ان کی فی صد تعداد جو ۱۹۶۲ میں ۴۶٫۳ فی صد تھی بڑھ کر ۱۹۶۷ میں ۵۵٫۴ فی صد اور ۱۹۷۱ میں ۴۹٫۱ فی صد ہوگئی جبکہ سب رائے دہندگان کی شرکت میں عام طور پر کمی ہوئی تھی۔ اس نو سال کے عرصے میں اپنے ووٹ کو استعمال کرنے والے مردوں اور عورتوں کی فی صد تعداد کا فرق ۱۵٫۴ فی صد سے گھٹ کر ۱۱٫۸ فی صد رہ گیا۔ اڑیسہ۔ بہار۔ مدھیہ پردیش۔ راجستھان اترپردیش اور ہماچل پردیش کی ریاستوں میں جو اپنی عورتوں کی تعلیمی اور سماجی پسماندگی کے لیے عام طور پر مشہور ہیں انتخابات کے دوران عورت ووٹروں کی نقل و حرکت مستقل طور پر کم رہی ہے۔ اگرچہ ان ریاستوں میں جہاں خواندگی کی شرح زیادہ ہے ووٹ کے استعمال کے لیے عورتوں کی نقل و حرکت نسبتاً زیادہ نظر آتی ہے تاہم ایک ایسا ہی باہمی تعلق تعلیم یا اقتصادی ترقی اور عورتوں کے حق رائے دہندگی کے استعمال کے درمیان قائم کرنا ممکن نہیں ہے۔ مختلف علاقوں میں سیاسی طرز عمل کے جو نمونے نظر آتے ہیں وہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ایک دوسرے سے پیوستہ متعدد مختلف عناصر ان پر اثرانداز ہوتے ہیں جیسے عورتوں کی سماجی حیثیت ان کی اقتصادی حالت ثقافتی معیار اور وسیع تر سماج میں عورتوں کی شرکت کے بارے میں مجموعی طور پر علاقائی انداز نظر۔

امیدواروں کے معاملہ میں عورتوں مردوں کے درمیان کہیں زیادہ فرق ہے لوک سبھا کے لیے ۱۹۷۱ میں صرف ۱۰ فی صد نشستوں پر عورتوں نے مقابلہ کیا

جو کہ اب تک کی سب سے بڑی تعداد ہے۔ اگر امیدواروں کی کل تعداد سے مقابلہ کیا جائے تو ان میں عورتوں کی تعداد ۴ فی صد سے زیادہ کبھی نہیں ہوئی ہے۔ یہ بات کافی دلچسپ ہے کہ خواتین امیدواروں کی سب سے زیادہ تعداد اتر پردیش، بہار اور مدھیہ پردیش میں ملتی ہے جہاں اپنے حق رائے دہی کے استعمال کے لیے عورت ووٹروں کی نقل و حرکت مستقل طور پر کم رہی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عورتوں کی شرکت کی سطح اور خواتین امیدواروں کے انتخاب کے درمیان کوئی باہمی تعلق نہیں ہے۔ پنجاب میں جہاں شہری علاقوں میں عورت ووٹروں کی تعداد مردوں سے آگے بڑھ گئی ہے خواتین امیدواروں کی تعداد بےحد کم تھی۔ مہاراشٹر اور کیرالا میں جہاں حق رائے دہی کے استعمال میں عورتوں کی شرکت کی سطح اونچی ہے برسوں میں خواتین امیدواروں کی تعداد ایک سست رفتار سے بڑھتی ہوئی نظر آتی ہے اور مغربی بنگال میں ۱۹۷۱ء میں یکایک بڑھ گئی۔ لیکن زیادہ تر ریاستوں میں سب سے زیادہ نمایاں رجحان ان کی تعداد میں صرف جمود کا ہی نہیں بلکہ کمی کا بھی ہے۔ کرناٹک نے جو ایک پسماندہ ریاست نہیں ہے عام انتخابات میں سے تین الیکشنوں میں ایک بھی خاتون امیدوار کو کھڑا نہیں کیا اور باقی دو میں صرف ایک کو کھڑا کیا۔ منی پور۔ آندھرا پردیش تامل ناڈو۔ کرناٹک اور اڑیسہ میں عورتوں نے خواتین امیدواروں کو کھڑا نہ کرنے پر سیاسی جماعتوں کے خلاف تنقید کرنے میں بہت کچھ زور شور دکھایا۔ ان کے خیال میں امیدواروں کی کم تعداد عورتوں کی امنگوں کی نہیں بلکہ سیاسی پارٹیوں کی بے توجہی کی آئینہ دار تھی۔

انتخابی معلوماتی مواد کے علاوہ ہم نے عورتوں کے مختلف گروپوں کے ساتھ جو تبادلۂ خیال کیا اس سے ہم چند عام نتائج پر پہونچے جو حسب ذیل ہیں :-

۱۔ بحیثیت رائے دہندگان عورتوں کی تعداد میں ہر انتخاب میں جو اضافہ ہو رہا ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دستور نے عورتوں کو جو سیاسی حقوق دیے ہیں ان کے متعلق عورتوں کا ردعمل بہتر ہو رہا ہے۔ اگر دیگر حالات مساوی طور پر برقرار رکھے جائیں تو خواندگی کی ترقی اور عوام کے ساتھ اجتماعی ربط کے ذرائع عورتوں کی اور بھی بڑی تعداد کو کھینچ کر سیاست کے خاص بڑے دھارے میں لانے میں مدد کر سکتے ہیں۔

۲۔ اگرچہ خواتین امیدواروں کے درمیان نو واردوں کی تعداد میں کافی بڑا اضافہ ہوا ہے تاہم پرانی امیدواروں کی ایک بڑی تعداد سیاست میں سرگرم شرکت سے علیحدہ بھی ہوگئی ہے۔ جہاں یہ خواتین ایسے خاندانوں سے متعلق ہیں جو طویل مدت سے سیاسی روایات کے حامل ہیں۔ وہاں ان کی اس طرح کی کنارہ کشی سیاسی عمل سے یک گونہ مایوسی کا اظہار کرتی ہے۔

۳۔ مسلمان اور قبائلی عورتیں رائے دہندگان اور امیدواران دونوں کی حیثیت سے شرکت کی ایک پست تر سطح ظاہر کرتی ہیں اگرچہ اس اصول کے کچھ استثنا بھی موجود ہیں مسلمان عورتوں کے بارے میں ہمارے جائزے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے سوالات کے جواب دینے والی عورتوں کی ایک بڑی تعداد نے سابقہ انتخاب میں بھی ووٹ دیے تھے۔ ہم تری پورہ۔ میگھالیہ اور بستر (مدھیہ پردیش) کی قبائلی عورتوں سے بھی ملے جو رسمی طور پر تعلیم یافتہ نہ ہونے کے باوجود سیاست میں گہری دلچسپی لیتی ہیں۔ وہ پابندی سے اس میں شرکت کرتی ہیں۔

۴۔ درمیانی اور مندرجہ فہرست ذاتوں کی عورتیں شرکت کی ایک زیادہ اونچی شرح رکھتی ہیں۔ ہم مختلف ریاستوں میں دیہات میں ان ذاتوں کی بہت سی عورتوں سے ملے اور ان کو انتخابات میں حصہ لینے کے لیے مصمم ارادہ کا حامل پایا۔

۵۔ رائے دہی میں عورتوں کی شرکت میں دیہی شہری فرق بہت کم ہوتا ہے اگرچہ یہ خیال اب بھی وسیع طور پر پھیلا ہوا ہے کہ دیہاتی عورتیں کم تعداد میں ووٹ دیتی ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم نے جو تحقیقات کی ہیں ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شہری رنگ اختیار کرنے کا عمل سیاست میں عورتوں کی شرکت پر زیادہ اثرانداز نہیں ہوتا۔ دوسری طرف عورتیں شہری، خاص طور سے جو متوسط طبقات سے تعلق رکھتی ہیں یہ عذر پیش کرتی ہیں کہ گھریلو فرائض ان کو شرکت سے روکتے ہیں۔

۶۔ اس قوت کے بارے میں جو انھیں حق رائے دہندگی سے حاصل ہوتی ہے عورتوں میں اس سے کہیں وسیع پیمانے پر واقفیت پائی جاتی ہے جتنا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ اس کی شہادت ہمیں مدھیہ پردیش، تری پورہ اور یو۔پی کے دیہات میں مسلمان، قبائلی اور مندرجہ فہرست ذاتوں کی عورتوں میں بھی ملی ہے۔ ان میں سے بیشتر

عورتیں اس سے بھی واقف تھیں کہ رائے دہندگی کے سلسلے میں اس قدر رازداری کیوں رکھی جاتی ہے اور انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ چیز ان کو اپنے آزاد فیصلہ پر عمل کرنے کی اجازت دے دیتی ہے۔

۷۔ یہ ایک عام احساس ہے کہ سیاسی جماعتوں نے عورتوں کو سیاسی اعتبار سے کافی تعلیم دینے اور حرکت و عمل میں لانے کے اپنے فریضہ سے غفلت روا رکھی ہے۔

۸۔ خواتین امیدواروں کی اکثریت نسبتاً خوشحال خاندانوں سے متعلق ہوتی ہیں جس میں ادھر ادھر پرانے راجاؤں کے گھرانوں کی کچھ اراکین بھی نظر آتی ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر تعلیم یافتہ ہوتی ہیں اگرچہ ان کی تعلیم کی سطحیں مختلف ہوتی ہیں ان کا ایک چھوٹا سا گروپ ان خاندانوں سے آتا ہے جو سیاسی سرگرمی کی کافی طویل روایات کے حامل ہیں۔ لہذا یہ عورتیں اپنا خیال میں زیادہ سرگرمی دکھاتی ہیں اور نسبتاً ایک طویل تر عرصہ سے اقتدار و قوت کے لیے جد و جہد جاری رکھے ہوئے ہیں۔ زیادہ بڑا گروپ ان عورتوں کا ہے جو اس میدان میں نئی ہیں اور جن کو کوئی سابقہ سیاسی تجربہ نہیں ہے اور سیاسی اکھاڑے میں ان کا داخلہ محض انتخاب کے ذریعہ ہوا ہے۔

۹۔ جو عوامل عورتوں کو سیاست میں سرگرم شرکت سے روکتے ہیں وہ یہ ہیں: انتخابات کے بڑھتے ہوئے مصارف زیر سب سے بڑی مجبوری ہے کیونکہ اکثریت ان عورتوں کی ہے جن کے کسی طرح کے آزاد ذرائع آمدنی نہیں ہیں، تشدد کی دھمکیاں کردار پر، آخر الذکر دو عوامل حالیہ زمانے میں زیادہ ہو گئے ہیں اور بہت سی عورتوں کو انتخابات میں مقابلہ کرنے سے روک چکے ہیں۔

سیاسی رویے

عورتوں کی سیاسی آگاہی کی سطحیں علاقہ بہ علاقہ، طبقہ بہ طبقہ اور فرقہ بہ فرقہ مختلف ہیں۔ ان کی کیفیت کا تعین علاقہ کی سیاسی ثقافت، عورتوں کے ساتھ سیاسی جماعتوں کا انداز عمل اور مقامی قیادت کی نوعیت کرتی ہے۔ ہم نے دیکھا کہ تعلیم، شہری رنگ اختیار کرنے کا عمل اور عوام کے ساتھ اجتماعی ربط کے ذرائع ایسی چیزیں ہیں جن کا اثر ہمیشہ یکساں نہیں ہوتا۔ اگر ایک طرف خواندگی کا ایک

براہ راست اثر آگاہی اور شرکت دونوں پر نظر آتا ہے تو دوسری طرف تعلیم اور آگاہی کے درمیان جو تعلق ہے وہ شرکت تک ہمیشہ واضح نہیں ہوتا۔ عورتوں کی سیاسی آگاہی شہری اور دیہی علاقوں میں کوئی خاص فرق بھی نہیں رکھتی۔

مجموعی طور پر معاش کے لیے کام کرنے والی عورتیں جن میں پیشہ ور کارکن بھی شامل ہیں سیاست سے زیادہ آگاہی رکھتی ہیں۔ لیکن یہ چیز ان کی سیاسی شرکت میں ہمیشہ منعکس نہیں ہوتی اور نہ اعلیٰ تر سماجی معاشی حیثیت اور سیاسی آگاہی کے درمیان کوئی مثبت تعلق ہے۔ بعض مطالعوں سے جو ہمارے زیر ہدایت کیے گئے یہ انکشاف ہوا کہ زیادہ آمدنی والے گروپ کی عورتوں میں سیاسی آگاہی کم ہوتی ہے جو کہ سیاست میں برائے نام دلچسپی رکھتی ہیں اگرچہ مجلس آئین ساز کی بہت سی خواتین اراکین خوشحال گھرانوں سے ہی آتی ہیں۔

اپنا حق رائے دہندگی استعمال کرنے والی عورتوں پر شوہروں کا اثر روبہ زوال نظر آتا ہے۔ دیہات میں گاؤں کے بزرگوں کا اثر ابھی تک طاقت ور ہے لیکن اس اصول کے معنی خیز استثنا بھی موجود ہیں۔ ایسی تبدیلیوں کے باوجود مردوں اور عورتوں کے درمیان سیاسی معلومات اور سمجھ بوجھ کی سطح کے فرق اب بھی جاری ہیں جس کا خاص سبب عورتوں کی طرف سے سیاسی جماعتوں کی بے توجہی ہے۔ عورتوں کی تنظیمیں اور بااثر گروپ بھی عورتوں کے لیے سیاسی تعلیم مہیا کرنے سے قاصر رہے ہیں۔

اس امر کی کچھ شہادت موجود ہے کہ سیاسی عمل کی طرف سے عورتوں میں مایوسی ہے جس کی وجہ سے کچھ تو سیاسی حقوق میں پھیلی ہوئی بدعنوانی اور نااہلیت ہے اور کچھ یہ بھی ہے کہ عورتیں محسوس کرتی ہیں کہ سیاست نے ان مسائل کو حل نہیں کیا ہے جو ان کی روزانہ زندگی کو متاثر کرتے ہیں۔ ہم نے ایک مطالعہ کے لیے جن عورتوں کا انٹرویو لیا ان میں سے ۴۴ فی صد عورتوں نے سماجی ترقی کے لیے انتخاب کی "رسم" کے مقابلہ میں انقلاب کی حمایت کی۔ اکثریت کا یہ احساس تھا کہ ملک کے سامنے سب سے بڑے مسائل ہیں بے روزگاری اور غریبی، بڑھتی ہوئی قیمتیں، بدعنوانیاں قانون اور امن و امان کے نظام کی شکست۔ مختلف ریاستوں میں ہماری تحقیق سے ایک مشترک رجحان کا پتہ چلتا ہے اور وہ یہ کہ عورتیں ان مسائل سے زیادہ سروکار

رکھتی ہیں جو ان کی روزانہ زندگی کو متاثر کرتے ہیں۔ وہ بڑھتی ہوئی قیمتوں، غذا کی ملاوٹ بیکاری اور غریبی کے خلاف احتجاج کرنے میں خود کو سرگرم و مستعد دکھا چکی ہیں۔ سیاسی، اقتصادی اور سماجی مسائل کا اتحاد جو کہ تحریک آزادی کی خصوصیت تھا۔ عورتوں کی زبردست شرکت کے اسباب میں سے ایک تھا۔ آزادی کے بعد کے عہد میں اس قسم کی تحریک کی عدم موجودگی نیز عورتوں کو براہِ راست متاثر کرنے والے مسائل اور سیاسی عمل کی ایک دوسرے سے علیحدگی حالیہ برسوں کے دوران سیاست میں عورتوں کی نسبتاً کم شرکت کا ایک بڑا سبب رہی ہے۔

سیاسی عمل پر عورتوں کا اثر

سیاست میں عورتوں کی شرکت کا عکس انتخابات میں ان کی کامیابی کی روداد میں نمایاں نہیں ہوا ہے۔ لوک سبھا کے لیے کامیاب خواتین امیدواروں کی تعداد اور فیصد تعداد میں مسلسل کمی ہوتی رہی ہے جو کہ ۱۹۶۲ء میں ۳۲ (۹ء۰۵ فی صد) اور ۱۹۷۱ میں کم ہوکر ۲۱ (۹و۵۲ فی صد) رہ گئی۔ ۱۹۷۱ء میں یک لخت شدید کمی کی وجہ آزاد خواتین امیدواروں کی تعداد میں اضافہ تھا جن میں سے بیشتر ہار گئی تھیں۔ آزاد امیدواروں میں یہ اضافہ خاص طور پر اس لیے ہو رہا تھا کہ پارٹیوں نے عورتوں کی کافی تعداد کو اپنی طرف سے نہیں کھڑا کیا تھا۔ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ خواتین امیدواروں کی کامیابی کا انحصار پارٹی کی پشت پناہی۔ انتخابی مہم میں اختیار کردہ حکمت عملی اور امیدواروں کی شخصیت پر ہوتا ہے جس میں خاندانی پس منظر بھی شامل ہے۔ ۱۹۵۲ء سے پارلیمنٹ میں ۲۱۲ عورتیں کام کر چکی ہیں۔ ۱۲۹ لوک سبھا میں اور ۸۳ راجیہ سبھا میں۔ ریاستی آئین ساز اداروں میں نمایاں ترین رجحان یا تو امیدواروں کی فی صد تعداد میں کمی کا ہے یا پھر ایک حالت پر برقرار رہنے کا۔

عورتوں کی چیدہ جماعت کا رول

آزادی کے فوراً بعد والے دور کی لیڈر خواتین وہ کار آزمودہ خواتین تھیں جنھوں نے آزادی کی جدوجہد میں حصہ لیا تھا۔ انھوں نے عورتوں کی فلاح و بہبود اور ترقی کی تحریک میں بھی کام کیا تھا۔ نمائندہ جماعتوں یا اداروں میں عورتوں کے داعیہ کی نمائندگی

کی تھی اور سماج سے متعلق اس قوانین سازی کی حمایت میں رائے عامہ کو زیادہ متحرک کرنے میں ایک اہم رول ادا کیا تھا جس نے عورتوں کی قانونی حیثیت کو آزادی کے بعد اولین چند برسوں میں ہی بدل ڈالا۔ ان میں سے بعض نے عورتوں کی ترقی کے لیے ان پالیسیوں اور پروگراموں کی تشکیل میں بھی مدد دی جو اس وقت حکومت نے اختیار کیے ان میں سے بیشتر لیڈر خواتین جنھوں نے آزادی کی جدوجہد میں ایک قومی اہمیت و شہرت حاصل کرلی تھی مرکزی حکومت یا پارلیمنٹ کی اراکین بن گئیں ریاستوں میں ایک نئی نسل سیاست میں داخل ہوئی۔ ہماری تحقیقات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ عورتوں کے درمیان سماجی کام کا تجربہ مقامی اداروں کے امیدوارں کے لیے ابھی تک ایک اہلیت سمجھا جاتا ہے لیکن مجالس قانون ساز میں داخلہ کے لیے اب اس کی ایسی نوعیت نہیں رہی۔ سیاسی کارکنوں نے ہمیں بتایا کہ موجودہ ایام ریاست کی سطح پر سیاست میں سماجی اختلافات شاذونادر ہی عکس ریز ہوتے ہیں۔ ریاستی سیاست کے میدان میں مصروف کار خواتین زیادہ تر ریاستوں کی اقتصادی سیاسی چیدہ شخصیتوں میں سے ہوتی ہیں اور عوام کے درمیان کام کرنے سے زیادہ پارٹی کے اندر حمایت پانے کے باعث نیابتی عمل میں داخل ہوجاتی ہیں۔

پارٹی کے کارکنوں میں عورتوں کی حیثیت ایک اقلیت کی ہے جب وہ مجالس قانون ساز کے لیے منتخب ہوجاتی ہیں تو اپنے رول کو عوام کے نمائندگان کی حیثیت سے دیکھتی ہیں جن پر عورتوں کی کوئی خصوصی ذمہ داری عائد نہ ہو۔ ابتدائی برسوں میں عورتوں کے مقاصد کے لیے ان کی حمایت وطرفداری شفقت تھی جو پارٹی کے حدود کو قطع کرجاتی تھی۔ لیکن حالیہ سالوں میں ان خواتین نے جو مجالس قانون ساز کی ممبر ہوئی ہیں ان مسائل میں ایسی فکر یا دلچسپی نہیں دکھائی ہے جو عورتوں کو خاص طور سے متاثر کرتے ہیں۔ یہ تنقید ان بہت سی عورتوں نے کی جو سرگرم سیاستدانوں کے حلقے سے باہر ہیں۔ آئین ساز اداروں میں ہونے والے مباحثوں نے عورتوں کے مسائل پر بہت ہی حقیر سی توجہ صرف کی ہے۔

ہمارا یہ خیال ہے کہ ملک میں دونوں جنسوں کے چیدہ سیاسی افراد کے طبقہ کو شاید یہ یقین ہوگیا ہے کہ عورتوں کے مسائل کو حل کرنے کے لیے آزادی کے بعد

چند سالوں میں جو قانونی اور انتظامیہ تدابیر اختیار کی گئی ہیں ان سے یہ مسائل عملی طور پر حل ہو چکے ہیں۔ ابتدائی سالوں میں عورتوں کے مسائل پر ہونے والے بہت زوردار مباحثے جن میں خواتین اراکین نے ایک بڑا رول ادا کیا تھا تب سے اب تک پھر کبھی نہیں دہرائے گئے ہیں۔

ایک تو عورتوں کی کوئی فعال تحریک نہیں ہے۔ پھر سیاسی تنظیمیں ان کو اپنے مسائل حل کرنے کے لیے متحرک و سرگرم کرنے سے قاصر رہی ہیں۔ ان چیزوں نے عورتوں کے سیاسی اداروں پر کافی دباؤ ڈالنے سے معذور رکھا ہے۔ مجالس قانون ساز میں عورتوں کی تعداد کم ہونے اور پارٹیوں میں اہم فیصلے کرنے والی جماعتوں میں ان کی کوئی پوزیشن نہ ہونے کی وجہ سے ان اداروں میں عورتوں کے مسائل کے لیے آواز اٹھانے کے لیے ان کی اہلیت محدود ہوگئی ہے۔

سیاسی پارٹیاں اور عورتیں

سیاسی پارٹیوں کے انتخابی کے منشورات اس بات پر متفق ہیں کہ عورتیں معاشرے کا ایک پسماندہ طبقہ ہیں اور ان کو مردوں کے برابر لانے کے لیے خصوصی مراعات عطا کرنا پڑے گا۔

انڈین نیشنل کانگرس جس کے حالیہ منشورات میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ عورتوں کے لیے تعلیم اور روزگار کے مواقع کو بڑھانا چاہیے تمام انتخابات میں عورتوں کی سب سے بڑی تعداد کو امیدوار کی حیثیت سے کھڑا کرتی رہی ہے لیکن یہ اب تک اپنے بار بار مقرر کردہ ۱۵ فی صد کے نشانے تک پہونچنے سے قاصر رہی ہے۔ اس کے باوجود کہ ایک خاتون اس پارٹی کی بلا اختلاف تسلیم شدہ لیڈر ہیں۔ پارٹی کے نظام مراتب میں عورتوں کی پوزیشن کچھ خصوصی طور پر موثر و شاندار نہیں۔ اگرچہ ورکنگ کمیٹی کے کل ۲۱ اراکین میں سے ۳ عورتیں ہیں اور چار جنرل سکریٹریوں میں سے ۲ عورتیں ہیں تاہم یہ بات بالکل واضح ہے ورکنگ کمیٹی کی طرف سے دباؤ نہ پڑتا تو ریاستی پارٹی کمیٹیاں بہت سی ریاستوں میں عورتوں کو اپنے حلقہ سے خارج ہی رکھتیں۔ پارٹی کی خواتین کارکناں یہ شکایت کرتی ہیں کہ ان کو اپنی تنظیمی

صلاحیت کو نشوونما دینے یا اس کا مظاہرہ کرنے کے مواقع نہیں دیے جاتے اور قیادت عورتوں کے مطالبات کو نظر انداز کرتی ہے۔

۲۔ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کا عقیدہ ہے کہ عورت کو صرف ایک اشتراکی نظام میں ہی پوری آزادی مل سکتی ہے۔ ان کو اشتراکی انقلاب لانے میں پوری مدد کرنی چاہیے۔ اس لیے یہ پارٹی مساوی کام کے لیے مساوی اجرت کی مانگ اور روزگار، جائداد کی وراثت، تعلیم اور سماجی قوانین میں عورتوں کے خلاف تمام پابندیوں اور امتیازوں کو دور کرنے کے لیے مطالبہ کرتی رہی ہے۔ اس پارٹی کا دعویٰ ہے کہ اس کے ۵ فیصد اراکین عورتیں ہیں۔ پارٹی کی "نیشنل کونسل" کے ۱۱۰ ممبروں میں سے ۴ خواتین اراکین ہیں۔ تاہم پارٹی کی ریاستی جماعتوں میں ان کی نمائندگی کی سطح ناہموار ہے۔ پارٹی کے نمائندوں نے اقتصادی دست تنگی اور غریبی کو دور کرنے پر زور دیا تاکہ عورتیں اپنے قانونی حقوق سے فائدہ اٹھا سکیں اور یہ دلائل پیش کیے کہ سماجی پیداوار کے عمل میں اور زیادہ شرکت، منتخب صنعتوں میں ملازمتوں کے حق محفوظ، مفت قانونی مدد اور مزید تعلیمی مواقع کے بغیر عورتوں کو وہ مساوات حاصل کرنا مشکل ہوگا جس کی قانون کی رو سے وہ حقدار ہیں۔

۳۔ ہندوستان کی مارکیسٹ پسند کمیونسٹ پارٹی کا نظریہ بھی عورتوں کے بارے میں اسی طرح کا نظریہ رکھتی ہے اور اس حقیر سی ترقی پر معترض ہے جو آزادی کے بعد سے اب تک عورتوں کی فلاح و بہبود کے میدان میں کی گئی ہے۔ قوم ترقی نہیں کرسکتی اگر عورتیں ظلمت پسند رسوم و تعصبات کے شکار کی حیثیت سے اور ترقی کے محدود مواقع کے ساتھ اپنی موجودہ حالت پر برقرار رہتی ہیں۔ اس پارٹی کے ممبر اراکین میں عورتوں کی تعداد تقریباً ایک فی صد ہے اور مرکزی کمیٹی کے ۲۱ ممبروں میں صرف ایک عورت ہے۔ ریاستی کمیٹیوں میں ان کی نمائندگی علاقوں کے مطابق مختلف ہے۔ پارٹی کے نمائندوں نے اقتصادی خود مختاری کی ضرورت پر زور دیا جس کے بغیر عورتیں مردوں کی تقریباً ذاتی ملکیت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ دیہی بے روزگاری کا بڑھتا ہوا مسئلہ، [illegible] کسانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد اور دیہی صنعتوں کے بڑھتے ہوئے انحطاط کے ساتھ مل کر اس [illegible] ہے۔ عورتوں کی [illegible] اور حیثیت کے لیے ایک خطرہ

بن گیا ہے اور ان کو اپنے دستوری و قانونی حقوق کا فائدہ حاصل کرنے میں شہری عورتوں سے بھی زیادہ معذور بنائے ہوئے ہے۔ اس پارٹی نے یہ خیال ظاہر کیا کہ زبردست اجتماعی پیمانے پر روزگار مہیا کرنا اور زبردست اجتماعی پیمانے پر تعلیم فراہم کرنا (جس میں عورتوں کو ان کی نجات و آزادی کے متعلق تعلیم دینا بھی شامل ہے) "بنیادی حقوق" میں مساوی کام کے لیے مساوی اجرت کے اصول کو شامل کرنا اور زمین اور روزگاری سہولتوں میں دیہی عورتوں کو مساوی حصے دینا عورتوں کے لیے حقیقی مساوات پیدا کرنے کے واسطے ضروری اقدامات ہیں۔

۴۔ بھارتیہ جن سنگھ سماجی تنظیم کے روایتی طور پر قائم شدہ اصولوں میں کسی بھی تبدیلی کے بغیر عورتوں کی ترقی اور ان کی سماجی و تعلیمی معذوریوں کو دور کرنے کے لیے خصوصی اقدامات کی حمایت کرتی ہے۔ اس پارٹی کی مرکزی انتظامیہ میں پانچ عورتیں ہیں اور "آل انڈیا کونسل" میں ۴۰۔ پارٹی کی مختلف کمیٹیوں کا دستور ایک یا اس سے زیادہ عورتوں کو شامل کرنے کی گنجائش مہیا کرتا ہے اگرچہ مقامی کمیٹیوں کی سطح پر اس نشانے پر پہنچنا مشکل پایا گیا ہے۔ پارٹی کے نمائندوں نے سیاست میں عورتوں کی شرکت اور ان کے سیاسی شعور کے بڑھانے پر زور دیا کیونکہ عورتوں کی قدامت پرستی ان کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ انھوں نے اشتہاروں میں عورتوں کی تصویروں کے استعمال پر اور عورتوں کے اس تصور پر جو عوامی اجتماعی ذرائع ربط و اشاعت میں پیش کیا جاتا ہے تنقید کرتے ہوئے ان کو عورتوں کی حیثیت کے لیے توہین آمیز قرار دیا۔

۵۔ (تنظیم) انڈین نیشنل کانگریس عورتوں کے بارے میں دستوری ضمانتوں اور "ریاستی پالیسی کے رہنما اصولوں" کے نفاذ کا وعدہ کرتی ہے۔ ورکنگ کمیٹی کے کل ۲۸ ممبروں میں سے عورتیں صرف دو ہیں (ان میں سے ایک جنرل سکریٹری ہے)، عورتوں کے لیے جو ۲۰ فی صد نشستوں کا کوٹا پارٹی کی طرف سے محفوظ و مخصوص ہے وہ عورتوں کے درمیان سیاسی دلچسپی اور نامزدگی کی خواہشگار اراکین کی تعداد میں انحطاط کے باعث پُر نہیں کیا جا سکتا ہے اس پارٹی کے نمائندوں کی رائے میں اقتصادی پسماندگی اور مختلف سطحوں پر نامزدگیاں حاصل کرنے میں مسابقہ وہ رکاوٹیں ہیں جو خواتین امیدواروں کی راہ میں حائل ہوتی ہیں۔

۶۔ سوشلسٹ پارٹی کا خیال ہے کہ عورتیں اب بھی سماجی عدم مساوات کا شکار ہیں۔ پارٹی کے نمائندے نے عورتوں کے قانونی و دستوری حقوق کے متعلق ان کی لاعلمی اور بے توجہی پر زور دیا۔ سماجی فلاح و بہبود کے کام کرنے والوں کو اس مشکل کے دور کرنے کے لیے مصمم ارادہ کے ساتھ ایک کوشش کرنا ضروری ہے۔ سرکاری اور دوسرے ادارو ں کو چاہیے کہ مردوں اور عورتوں کو فرسودہ روایات اور توہمات کے خلاف تعلیم دیں۔ اس پارٹی کے عورتوں کے محاذ نے "حقوقِ نسواں" کا ایک منشور مرتب و اختیار کیا ہے جس میں مفت تعلیم، جزوقتی روزگار، یکساں پیشہ ورانہ اور فنی تربیت سول کوڈ اور جہیز کے خلاف سماجی قوتوں کو حرکت میں لانے اور انتخابات اور پارٹی کی تنظیموں میں عورتوں کو زیادہ مواقع دینے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

حکومت میں مراتب

اگرچہ صرف چند ہی عورتیں اقتدار و حاکمیت کی بلند ترین سطح تک پہنچ سکیں۔ لیکن جو ایسا کرسکیں انھوں نے خود اپنے معاملات کو طے کرنے کے متعلق اپنی انتظامی ہنرمندیوں اور صلاحیت کو تسلیم کرالیا ہے۔ ۱۹۵۲ء سے اب تک تیرہ عورتیں یونین حکومت میں وزیروں کی حیثیت سے کام کرچکی ہیں اور کئی خواتین پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے چیرمین کی حیثیت سے کام کرچکی ہیں۔ بہت سی خواتین اسٹینڈنگ اور ایڈہاک کمیٹیوں کی اراکین رہ چکی ہیں۔ ریاستوں میں دو خواتین گورنر رہ چکی ہیں۔ دو وزیر اعلیٰ، ایک اسپیکر اور ایک ڈپٹی اسپیکر۔ اگرچہ محض چند کابینہ کے درجے کو پہونچی ہیں تاہم بہت سی خواتین بیشتر ریاستوں میں حکومت کے مختلف عہدوں پر فائز رہی ہیں۔ مجلس قانون ساز میں ان کی مجموعی تعداد سے مقابلہ کیا جائے تو حکومت کے عہدوں پر عورتوں کی تعداد کم نہیں تھی۔

عورتوں کو حرکت وعمل میں لانے والی مہمات کی اثر اندازی اگرچہ عورتوں کی تعداد رائے دہندوں کی جماعت میں تقریباً ۵۰ فی صد ہے۔ لیکن تمام عام انتخابات کا تجربہ یہ ثابت کرتا ہے کہ عورتیں اپنی طاقت سے واقف نہیں ہیں اور نہ کسی سیاسی پارٹی نے قوت کے اس سرچشمہ سے رجوع کیا

بن گیا ہے اور ان کو اپنے دستوری و قانونی حقوق کا فائدہ حاصل کرنے میں شہری عورتوں سے بھی زیادہ معذور بنائے ہوئے ہے۔ اس پارٹی نے یہ خیال ظاہر کیا کہ زبردست اجتماعی پیمانے پر روزگار مہیا کرنا اور زبردست اجتماعی پیمانے پر تعلیم فراہم کرنا (جس میں عورتوں کو ان کی نجات و آزادی کے متعلق تعلیم دینا بھی شامل ہے)، "بنیادی حقوق" میں مساوی کام کے لیے مساوی اجرت کے اصول کو شامل کرنا اور زمین اور روزگاری سہولتوں میں دیہی عورتوں کو مساوی حصے دینا عورتوں کے لیے حقیقی مساوات پیدا کرنے کے واسطے ضروری اقدامات ہیں۔

۴۔ بھارتیہ جن سنگھ سماجی تنظیم کے روایتی طور پر قائم شدہ اصولوں میں کسی بھی تبدیلی کے بغیر عورتوں کی ترقی اور ان کی سماجی و تعلیمی معذوریوں کو دور کرنے کے لیے خصوصی اقدامات کی حمایت کرتی ہے۔ اس پارٹی کی مرکزی انتظامیہ میں پانچ عورتیں ہیں اور "آل انڈیا کونسل" میں ۴۰۔ پارٹی کی مختلف کمیٹیوں کا دستور ایک یا اس سے زیادہ عورتوں کو شامل کرنے کی گنجائش مہیا کرتا ہے اگرچہ مقامی کمیٹیوں کی سطح پر اس نشانے پر پہنچنا مشکل پایا گیا ہے۔ پارٹی کے نمائندوں نے سیاست میں عورتوں کی شرکت اور ان کے سیاسی شعور کے بڑھانے پر زور دیا کیونکہ عورتوں کی قدامت پرستی ان کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ انھوں نے اشتہاروں میں عورتوں کی تصویریں کے استعمال پر اور عورتوں کے اس تصور پر جو عوامی اجتماعی ذرائع ربط و اشاعت میں پیش کیا جاتا ہے تنقید کرتے ہوئے ان کو عورتوں کی حیثیت کے لیے توہین آمیز قرار دیا۔

۵۔ (تنظیم) انڈین نیشنل کانگریس عورتوں کے بارے میں دستوری ضمانتوں اور "ریاستی پالیسی کے رہنما اصولوں" کے نفاذ کا وعدہ کرتی ہے۔ ورکنگ کمیٹی کے کل ۲۸ ممبروں میں سے عورتیں صرف دو ہیں (ان میں سے ایک جنرل سکریٹری ہے)، عورتوں کے لیے جملہ ۲۰ فی صد نشستوں کا کوٹا پارٹی کی طرف سے محفوظ و مخصوص ہے وہ عورتوں کے درمیان سیاسی دلچسپی اور نامزدگی کی خواہشگار اراکین کی تعداد میں انحطاط کے باعث پُر نہیں کیا جا سکتا ہے اس پارٹی کے نمائندوں کی رائے میں اقتصادی پسماندگی اور مختلف سطحوں پر نامزدگیاں حاصل کرنے میں مسابقہ وہ رکاوٹیں ہیں جو خواتین امیدواروں کی راہ میں حائل ہوتی ہیں۔

۶۔ سوشلسٹ پارٹی کا خیال ہے کہ عورتیں اب بھی سماجی عدم مساوات کا شکار ہیں۔ پارٹی کے نمایندے نے عورتوں کے قانونی و دستوری حقوق کے متعلق ان کی لاعلمی اور بے توجہی پر زور دیا۔ سماجی فلاح و بہبود کے کام کرنے والوں کو اس مشکل کے دور کرنے کے لیے مصمم ارادہ کے ساتھ ایک کوشش کرنا ضروری ہے۔ سرکاری اور دوسرے اداروں کو چاہیے کہ مردوں اور عورتوں کو فرسودہ روایات اور توہمات کے خلاف تعلیم دیں۔ اس پارٹی کے عورتوں کے محاذ نے "حقوقِ نسواں" کا ایک منشور مرتب و اختیار کیا ہے جس میں مفت تعلیم، جزوقتی روزگار، یکساں پیشہ ورانہ اور فنی تربیت سول کوڈ اور جہیز کے خلاف سماجی قوتوں کو حرکت میں لانے اور انتخابات اور پارٹی کی تنظیموں میں عورتوں کو زیادہ مواقع دینے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

حکومت میں مراتب

اگرچہ صرف چند ہی عورتیں اقتدار و حاکمیت کی بلند ترین سطح تک پہنچ سکیں۔ لیکن جو ایسا کرسکیں انھوں نے خود اپنے معاملات کو طے کرنے کے متعلق اپنی انتظامی ہنرمندیوں اور صلاحیت کو تسلیم کرالیا ہے۔ ۱۹۵۲ء سے اب تک تیرہ عورتیں یونین حکومت میں وزیروں کی حیثیت سے کام کرچکی ہیں اور کئی خواتین پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے چیرمین کی حیثیت سے کام کرچکی ہیں۔ بہت سی خواتین اسٹینڈنگ اور ایڈہاک کمیٹیوں کی اراکین رہ چکی ہیں۔ ریاستوں میں دو خواتین گورنر رہ چکی ہیں۔ دو وزیراعلیٰ، ایک اسپیکر اور ایک ڈپٹی اسپیکر۔ اگرچہ محض چند کابینہ کے درجے کو پہونچی ہیں تاہم بہت سی خواتین بیشتر ریاستوں میں حکومت کے مختلف عہدوں پر متمکن فائز رہی ہیں۔ مجلس قانون ساز میں ان کی مجموعی تعداد سے مقابلہ کیا جائے تو حکومت کے عہدوں پر عورتوں کی تعداد کم نہیں تھی۔

عورتوں کو حرکت و عمل میں لانے والی مہمات کی اثرانداز ی اگرچہ عورتوں کی تعداد رائے دہندوں کی جماعت میں تقریباً ۵۰ فی صد ہے۔ لیکن تمام عام انتخابات کا تجربہ یہ ثابت کرتا ہے کہ عورتیں اپنی طاقت سے واقف نہیں ہیں اور نہ کسی سیاسی پارٹی نے قوت کے اس سرچشمہ سے رجوع کیا

ہے۔ جتوں کے علاوہ اور کسی جگہ منظم خواتین کی طرف سے ان کی حمایت کے لیے سیاسی جماعتوں کے ساتھ سودے بازی نہیں ہوئی ہے۔ عام طور پر یہ پارٹیاں خاندانوں کے سرگرم مرد سربراہوں کی حمایت حاصل کرنے کی طرف مائل ہوتی ہیں اور یہ توقع رکھتی ہیں کہ ان سربراہوں کی خواہشات خصوصاً دیہی علاقوں میں عورتوں کی مرضی پر غالب آجائیں گی۔ نسبتاً بڑے شہروں میں عورتوں سے متعین خصوصی قسم کے وعدے کرکے اور گھر گھر جانے کا طریقہ استعمال کرکے خواتین رائے دہندگان کو فعال کرنے کی کچھ کوشش کی گئی ہے۔

غیر سیاسی تنظیموں میں سب سے اہم "کل ہند خواتین کانفرنس" "نیشنل کونسل آف ویمن ان انڈیا"، "بھارتیہ گرامین مہیلا سنگھ" اور "نیشنل فیڈریشن آف انڈین ویمن" ہیں۔ ان میں سے پہلی دو زیادہ منفکری اور رضاکارتی نوعیت کی جماعتیں ہیں اور انھوں نے اپنی توجہات کو فلاح و بہبود اور راحت رسانی کی کارروائی پر مرکوز رکھا ہے "بھارتیہ گرامین مہیلا سنگھ" دیہاتی عورتوں میں کام کرتی ہے اور دیہات کی ترقی کے کام میں سرگرم رہی ہے۔ "نیشنل فیڈریشن" کا نصب العین عورتوں میں سماجی اور سیاسی بیداری کو بڑھانا ہے اور یہ عورتوں کو اس قسم کے مسائل کے خلاف احتجاج کرنے پر متحرک کرتی رہی ہیں جیسے بڑھتی ہوئی قیمتیں، ذخیرہ اندوزی اور اشیائے صرف میں ملاوٹ۔ یہ سب تنظیمیں اعتراف کرتی ہیں کہ پورے ملک کی تمام عورتوں تک ان کے لیے حقوق کا پیغام پہونچانے میں وہ پوری طرح کامیاب نہیں ہوئی ہیں۔

اگرچہ ٹریڈ یونین کی تحریک میں کام کرنے والی خواتین لیڈروں نے عورتوں کے لیے تحفظ فراہم کرنے کے لیے مزدور قوانین میں تبدیلیاں لانے میں ایک بڑا رول ادا کیا ہے۔ تاہم بہت سی ٹریڈ یونینوں کو یہ اعتراف ہے کہ انھوں نے عورتوں کو ان کے قانونی اور دستوری حقوق کو جتلانے کے لیے سرگرم عمل کرنے کی زیادہ کوششیں نہیں کیں لیکن جب کبھی ان تنظیموں نے متحد ہوکر عورتوں کے حقوق کے دفاع کے لیے کام کیا ہے۔ دباؤ ڈالنے والے گروپوں کی حیثیت سے ان کا اثر خاصا کارگر رہا ہے۔ آزادی کے بعد سماجی قوانین وضع کرنے میں انھوں نے ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سیاست میں شرکت کے اضافہ کے باوجود عورتوں کی سیاسی عمل پر ایک اثر پیدا کرنے کی اہلیت ناقابل لحاظ رہی ہے۔

پارٹیوں میں عورتوں کو اس نظر سے دیکھنے کا رجحان رہا ہے کہ وہ مردوں کا ضمیر ہیں۔ لیکن اس کے باوجود عورتوں کے درمیان قیادت، انتشار اور ربگارنگی میں مبتلا ہوگئی ہے اور ان نابرابریوں کے متعلق ان کے انداز نظر اور تعلق و فکر میں شدید تضادات پیدا ہوگئے ہیں جو عورتوں کو معاشی، سماجی اور سیاسی ہر میدان میں متاثر کرتی ہیں۔ عورتوں کی حیثیت میں وہ انقلاب جس کے لیے دستوری مساوات کو محض ایک ذریعہ بننا تھا ابھی تک ایک بہت دُور افتادہ مقصد ہے۔ اگرچہ بعض گروہوں کی حالت میں بہتر تبدیلیاں ہوگئی ہیں تاہم عام عورتوں کے بہت بڑے بڑے طبقوں کا کوئی نمایندہ مملکت کے نمایندہ اداروں میں موجود نہیں ہے۔ اگرچہ تعداد کے لحاظ سے عورتیں ایک اقلیت نہیں ہیں تاہم طبقہ۔ حیثیت اور سیاسی طاقت کی عدم مساوات کے لحاظ سے وہ ایک اقلیت کی خصوصیات اختیار کرتی جارہی ہیں۔ دستور نے جس جدید سماجی نظام کا اعلان کیا تھا اس کی اقدار اور جہاں تک عورتوں کے حقوق کا تعلق ہے معاصرانہ سماج کے حقائق ــــ ان دونوں کے درمیان کی خلیج اب بھی اتنی ہی وسیع ہے جتنی آزادی کے وقت تھی۔

سیاسی مساوات کا حق عورتوں کو اس قابل نہیں بنا سکا ہے کہ وہ شرکاء کار اور ترکیبی عناصر کی حیثیت سے سیاسی عمل میں اپنا رول ادا کریں کیونکہ گاندھی جی کے اس پیغام کو فراموش کردیا گیا ہے کہ سیاسی حقوق کو ایک مقصد نہیں بلکہ ایک ذریعہ سمجھنا چاہیے۔ اس کے بجائے ان حقوق نے مساوات اور طاقت کا ایک سراب پیدا کرنے میں مدد دی ہے جس کو اکثر ان خصوصی حفاظتی اور اصلاحی تدابیر کی مزاحمت کرنے کے لیے بطور دلیل استعمال کیا جاتا ہے جو عورت کو سماج میں ایک منصفانہ اور مساوی مرتبہ حاصل کرنے کے قابل بنانے کے لیے اختیار کی جاتی ہیں۔ ان خصوصی اختیارات کے باوجود جو دستور کی دفعہ (۳) ۱۵ نے عطا کیے ہیں مختلف میدانوں میں عورتوں کی غیر مساوی حیثیت کو درست کرنے کے لیے تقریباً کچھ بھی کوششیں نہیں کی گئی ہیں۔ یہ حقیقت کہ پچھلے ۹ سال سے ملک پر ایک خاتون حکومت کررہی ہیں اس ملک میں عورتوں کی حقیقی حیثیت کی کوئی عکاسی نہیں کرتی۔ اگرچہ مرد یہ تسلیم کرتے ہیں اور اس کی وکالت کرتے ہیں۔ کہ عورتوں کو اقتصادی اور سیاسی میدانوں میں مساوی حقوق دینا پسندیدہ اور ضروری چیز ہے تاہم سماج میں عورت کے رول کے متعلق معیار اور

رویئے وہی روایتی چلے آتے ہیں۔ اس اعتبار سے عورتوں کو عطا کردہ نئے حقوق محض رعایتی معلوم ہوتے ہیں۔

مقامی حکومتی اداروں میں عورتیں

عورتوں کو فیصلے کرنے کے عمل میں عملی شرکت کرنے کے اور زیادہ مواقع مہیا کرنے کے لیے یہ لازمی ہے کہ ان سماجی نابرابریوں اور معذوریوں کی صحیح نوعیت کو تسلیم کیا جائے۔ یہ مقصد بہترین طریقہ پر اس طرح حاصل ہوسکتا ہے کہ مقامی حکومت کے نیابتی ڈھانچے میں ان کو شرکت کے خصوصی مواقع مہیا کیے جائیں۔ ان اداروں میں عورتوں کو شریک کرنے کی موجودہ شکل جو کہ انتخاب شریک یا نامزدگی کے تحت عمل میں آتی ہے اب ایک قسم کی علامت پرستی بن گئی ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ اس علامتی رسم کے حدود سے نکل کر مقامی نظم و نسق میں عورتوں کی ایک زیادہ بامعنی شرکت کی راہ اختیار کی جائے اور عورتوں کی ترقی اور ان کی حیثیت کی تبدیلی کے متعلق عام طور پر مقامی حکومت کے اداروں میں بے حسی اور بے توجہی پھیلی ہوئی ہے اس کا توڑ کیا جائے۔ اس لیے ایک عبوری اقدام کے طور پر، ہم یہ سفارش کرتے ہیں کہ گاؤں کی سطح پر عورتوں کی آئینی پنچائتیں قائم کی جائیں جو خود مختار ہوں اور فلاح و بہبود کے کاموں کا اہتمام و انصرام کرنے کے لیے خود اپنے وسائل نیز عورتوں اور بچوں کے لیے ترقیاتی پروگرام رکھتی ہوں، تاکہ ان رویوں کی دیواروں کو توڑ کر آگے بڑھا جاسکے جو بیشتر عورتوں کو اپنے مسائل کا اظہار کرنے اور موجودہ مقامی حکومتی اداروں میں عملی شرکت کرنے سے روکتی ہیں۔ ان پنچایتوں کو گاؤں کی عورتوں کے ذریعہ براہ راست منتخب ہونا چاہیے۔ اور ان کو یہ حق ہونا چاہیے کہ اپنے نمائندے "پنچایت سمیتیوں" اور/یا ضلع پریشدوں کو بھیجیں۔ "گرام پنچایتوں" کے ساتھ ان کا ایک جاندار و پائیدار تعلق اس طرح قائم رکھنا چاہیے کہ دونوں جماعتوں کے چیرمین اور سکریٹری ایک دوسرے کے اراکین بلحاظ منصب (EX OFFICIO) بنادیے جائیں۔

میونسپلٹیوں کی سطح پر کچھ ریاستوں میں عورتوں کے لیے نشستیں مخصوص و محفوظ رکھنے کا اصول پہلے ہی سے جاری ہے۔ یہ اصول ایک عبوری اقدام کے طور پر سب

ریاستوں کو اختیار کرلینا چاہیے٭۔ مزید برآں میونسپلٹیوں میں کچھ ایسی کمیٹیاں بنی چاہئیں جو عورتوں کی ترقی و فلاح کے پروگراموں کی نگرانی کریں اور نئے پروگرام بنائیں۔

مجالس قانون ساز میں عورتوں کی محفوظ نشستیں

سب سیاسی پارٹیوں کو ایک معین پالیسی اختیار کرنا چاہیے کہ وہ خاتون امیدواروں کی کتنی فی صد تعداد کو پارلیمنٹ اور ریاستی اسمبلیوں کے الیکشن میں کھڑا کریں گی۔ شروع میں یہ تعداد ۱۵ فی صد ہوسکتی ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کو بڑھانا چاہیے تاکہ مناسب مدت کے بعد قانون ساز جماعتوں میں عورتوں کی نمایندگی ملک یا ریاست کی کل آبادی میں ان کی پوزیشن کے کچھ تناسب کے مطابق ہوجائے۔ ہمیں یہ مطالبہ بھی موصول ہوا کہ پارلیمنٹ اور ریاستی اسمبلیوں میں بھی عورتوں کے لیے نشستیں مخصوص ہونی چاہئیں لیکن ہم نے جانچ پڑتال کے بعد اس کو دو ممبروں کے اختلاف رائے کے ساتھ مسترد کردیا۔

ملک کی اہم جماعتوں میں عورتوں کی شرکت

سب اہم کمیٹیوں، کمیشنوں اور وفدوں میں جو ملک کے سماجی معاشی مسائل کے جائزے کے لیے مقرر کیے جاتے ہیں، عورتوں کی شمولیت ہونا چاہیے۔

٭ یہ فیصلہ کمیٹی کے ممبران کی اکثریت رائے سے ہوا ہے صرف دو ممبروں نے اس سے اختلاف کیا ہے۔

آٹھواں باب

عورتوں کی فلاح و ترقی کے لیے پالیسیاں اور پروگرام

ترقی اپنے وسیع تناظر میں جماعتی زندگی کے سارے پہلوؤں پر حاوی ہوتی ہے۔ قومی ترقی کے تسلیم شدہ مقاصد جیسے زیادہ سے زیادہ پیداوار، پورا پورا روزگار اور معاشی برابری اور سماجی انصاف کے حصول کا اطلاق مردوں عورتوں پر یکساں ہوتا ہے۔ لیکن ایک عدم مساوات والے سماج میں اس کو حاصل کرنا اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک کم حقوق یافتہ گروہوں کی مدد کے لیے خاص کوششیں نہ کی جائیں۔ اس لیے ہمارا دستور عوام کے کمزور تر طبقات کا اقتصادی اور تعلیمی مفادات کو آگے بڑھانے کی فوری ضرورت پر زور دیتا ہے اور چونکہ عورتوں کی راہ میں سماج، رواج اور روایات کی رکاوٹیں کھڑی ہوئی ہیں۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ قومی زندگی میں ان کو اپنے مناسب اور پورے رول ادا کرنے میں مدد دینے کے لیے خصوصی توجہ کی جائے۔

منصوبے اور عورتوں کی ترقی منصوبہ بندی کمیشن نے عورتوں کی ترقی کے لیے تین بڑے میدان متعین کیے ہیں۔ تعلیم، صحت اور فلاح و بہبود۔ خاص طور سے ان میدانوں میں ترقی کے لیے مرتب کیے گئے پروگراموں میں عورتوں کو جن معاملوں میں اوّلیت دی گئی تھی، وہ "چوتھے منصوبے" کے آخر تک وہی رہے ہیں جو شروع میں تھے۔ تمام منصوبوں میں عورتوں کی تعلیم پر مسلسل زور دیا جاتا رہا ہے۔ عورتوں

کے متعلق دیگر پروگرام زیادہ تر ماں اور بچے کی فلاحی خدمات، صحت، غذا اور خاندانی منصوبہ بندی پر مرکوز رہے۔ جہاں تک سماجی فلاح و بہبود کا تعلق ہے زیادہ تر پروگرام رضا کار سیکٹر نے چلائے اور حکومت کی کوشش صرف ادارتی خدمات مہیا کرنے تک محدود رہیں۔ دوسرے منصوبے نے کام کرنے والی عورتوں کے مسائل کی طرف خاص توجہ دینے کی ضرورت پر زور دیا جو بعض نقصانات اور دشواریوں میں مبتلا تھیں۔ مثلاً غیر مساوی اجرت، ایسی تربیت کی ناکافی سہولتیں جو ان کو روزگار کی زیادہ اونچی جگہوں کے لیے مسابقت کرنے کے قابل بنا سکے اور جز وقتی (Part Time) روزگار کے مواقع کا فقدان اور "ڈرافٹ پانچواں منصوبہ" کم آمدنی والے خاندان کی ضرورت مند عورتوں کی تربیت۔ ۱۵ تا ۴۵ سال کی عمر کے گروپ کے لیے عملی خواندگی کے ایک پروگرام (جس میں بچوں کی نگہداشت، غذا، صحت کی دیکھ بھال اور گھریلو معاشیات شامل ہے) تعلیم کے مختصر نصابات کی موجودہ اسکیم کے تحت کامیاب امیدواروں کو روزگار دلانے اور اس کے بعد ان کو زیر توجہ رکھنے کے انتظام اور سماجی اقتصادی پروگراموں کو اوّلیت دیتا ہے۔ مال کی تیاری کے ساتھ ساتھ تربیت دینے کی یونٹوں کے علاوہ مال کی بازارکاری کو فروغ دینے کے لیے انتظامی اور فروختگی کی تربیت بھی شروع کی جائے گی۔ صحت کے پروگراموں کے تحت مقصد یہ ہے کہ صحت عامہ کی زیادہ سے زیادہ سہولتیں، نیز خاندانی منصوبہ بندی اور زچہ بچہ کی نگہداشت کے متحدہ پروگرام فراہم کیے جائیں۔

فلاح و بہبود یا انسانی وسایل کی ترقی پر زور دینے کی اس پالیسی کے باوجود ان پروگراموں کے لیے رقم کا متناسب تعین مسلسل طور پر برابر کم ہو رہا ہے۔ صحت اور فلاح و بہبود کے لیے مجموعی متعین رقم جو پہلے منصوبے میں ۲۴.۱ فیصد تھی گھٹ کر پانچویں منصوبے میں صرف ۱۱.۷ فیصد رہ گئی ہے

عورتوں کی فلاح و بہبود اور ترقی کے پروگراموں کو اس طرح تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

۱۔ آئینی ذمہ داریوں کے تحت پروگرام۔ جیسے عصمت فروشی کے انسداد کا ایکٹ ۱۹۵۶ء۔ میٹرنٹی بنیفٹ ایکٹ (Maternity Benefits Act)

۲۔ ترقیاتی پروگرام جو لازمی خدمات اور مواقع فراہم کرتے ہیں جیسے صحت۔ زچہ بچہ کی فلاح و بہبود۔ خاندانی منصوبہ بندی۔ غذا اور تربیت۔

۳۔ عورتوں کے خصوصی گروپوں کے لیے پروگرام جیسے بیواؤں، بوڑھی اور محتاج عورتوں کی امداد، شہری علاقوں میں کام کرنے والی عورتوں کے لیے اقامت گاہیں مندرجہ فہرست ذاتوں اور قبیلوں کی لڑکیوں کے لیے وظیفے اور "آشرم اسکولوں" میں مفت رہائشی تعلیم۔

چونکہ نو آبادیاتی دور حکومت میں انتظامیہ نظام ان کاموں کے لیے تیار نہیں کیا گیا تھا اور زیادہ تر فلاح و بہبود کی خدمات رضاکار ایجنسیوں کے ہاتھوں میں تھیں۔ اس لیے ۱۹۵۳ء میں ایک مرکزی سرکاری ایجنسی اس مقصد سے کھولی گئی کہ وہ بچوں، عورتوں اور دوسرے کم حق یافتہ گروپوں کی ترقی و فلاح کے کاموں کو بڑھاوا دیا جائے۔ "سنٹرل سوشل ویلفیر بورڈ" ((C.S.W.B)) رضاکار ایجنسیوں کو امداد فراہم کرتا ہے۔ فلاح و بہبود کے پروگراموں کو بہتر بناتا ہے اور ترقی دیتا ہے اور ان علاقوں میں ان کو چلاتا ہے جہاں وہ موجود نہیں ہیں۔ ریاست کی سطح پر ریاستی سوشل ویلفیر (مشاورتی) بورڈ بھی ان ہی مقاصد کے تحت بنائے گئے۔

عورتوں کی ترقی اور فلاح و بہبود کے پروگراموں کو تیار کرنے اور چلانے کے لیے ایک تین سطحی ڈھانچہ قایم ہے جس کی ایجنسیاں مرکزی، ریاستی اور مقامی سطح پر کام کرتی ہیں۔ لیکن ان پروگراموں پر عملدر آمد کی بڑی ذمہ داری دوسرے مختلف محکموں اور حکومت کی دوسری ایجنسیوں پر ہے۔ مرکز میں منصوبہ بندی اور نفاذ کے خاص ایجنسیاں یہ ہیں "منصوبہ بندی کمیشن" وزارت تعلیم و سماجی فلاح و بہبود" جس کی اپنی دو ایجنسیاں" سوشل ویلفیر" اور "نیشنل کونسل آف ویمن ایجوکیشن" ہیں۔" وزارت صحت و خاندانی منصوبہ بندی"۔ "وزارت داخلہ" اور "وزارت محنت و روزگار" ریاستی سطح پر کوئی

یکساں ڈھنگ نہیں ہے اور محکموں کی ایک بڑی تعداد عورتوں کے لیے پروگرام چلاتی ہے۔

ہم نے ان سب مرکزی اور ریاستی محکموں سے عورتوں سے متعلق اُن کے خاص پروگراموں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ان کے جوابات جامع نہیں تھے۔ لیکن مرکزی حکومت کی ۱۷ وزارتوں، ۱۹ ریاستوں اور ایک "مرکزی علاقہ" (Union Territory) نے جو معلومات فراہم کیں اُن سے دو نکتے سامنے آتے ہیں:

۱۔ اپنے مشترک مقاصد کے باوجود ان پروگراموں کو نافذ کرنے کا کام ایک تعداد میں محکمے کرتے ہیں جن کی کارروائیوں میں باہمی ربط پیدا کرنے کے لیے کوئی مشینری موجود نہیں۔

۲۔ سرکاری محکمے یہ بات ہمیشہ واضح طور پر سمجھتے نظر نہیں آتے کہ فلاح و بہبود یا ترقی کیا چیز ہوتی ہے۔ چند محکمے ایسے ہیں جو فلاح و بہبود کے متعلق ایک محدود انداز عمل اختیار کرتے ہیں اور اس کو مصیبت زدہ عورتوں کی امداد کے مترادف سمجھتے ہیں۔

دوسرے پنجسالہ منصوبے کے علاوہ کسی اور منصوبے نے عورتوں کے لیے روزگار کے مواقع پیدا کرنے اور ان کو بہتر بنانے کے لیے فکر و توجہ کا مظاہرہ نہیں کیا ہے۔ لیکن یہ مشاہدہ دلچسپ ہے کہ وہ سب ایجنسیاں جو عورتوں کے پروگراموں کو نافذ کرنے میں مصروف رہتی ہیں عورتوں کی روزی کمانے کی قوت میں اضافہ ہونے کو اعلیٰ ترین اوّلیت دیتی ہیں۔ پانچواں منصوبہ بھی جو بیکار انسانی نفری طاقت کے استعمال کو ترقی کے عمل کی رفتار تیز کرنے کے لیے ایک زبردست قوت تسلیم کرتا ہے مزدوروں کی مجموعی جماعت کے اندر عورتوں کی موجودہ کم نمایندگی میں کسی تبدیلی کا تصور پیش نہیں کرتا۔*

---

* اس منصوبہ میں ۹۰-۱۹۸۹ تک کے لیے مجموعی مزدور جماعت میں اضافہ کے جو پیش اندازے دیے گئے ہیں اُن سے دونوں جنسوں کے افراد کے درمیان ایک مستقل تناسب ظاہر ہوتا ہے جس میں عورتوں کی تعداد کل جماعت کا صرف ۱۷ فیصدی ہی رہتی ہے۔ یہ تعداد اس ۱۲.۵ فیصد سے بھی کم ہے جو ۱۹۷۱ کی مردم شماری نے درج کی تھی۔

صحت اور خاندانی منصوبہ بندی

عورتوں کی ضرورتوں اور صلاحیتوں کے متعلق سماج کے جو مروّجہ معیار اور رویّے ہیں ان سے ان کے حیاتیاتی اور عضویاتی مسائل کے علاوہ ان کی حیثیت بلحاظ صحت بھی متاثر ہوتی ہے جس میں اُن کی جسمانی، ذہنی اور سماجی حالت شامل ہے ۔ یہ رویّے صحت کی نگہداشت کے سلسلے میں ان سہولتوں کی فراہمی اور استعمال پر اثر انداز ہوتے ہیں جن کا تعلق امراض کو روکنے اور ان کا علاج کرنے سے ہے اور جن میں زچہ عورتوں کی دیکھ بھال کرنے والی خدمات بھی شامل ہیں ۔

یہ بات ظاہر ہو چکی ہے کہ عورتوں کی پست حیثیت کے اور امراض کو روکنے والی صحتی خدمات کے علم و استعمال میں کوتاہیوں کے درمیان ایک قطعی باہمی ربط ہے ۔

خاص طور سے عورتوں کی صحت کو جو ثقافتی معیار متاثر کرتے ہیں وہ ہیں شادی کے بارے میں رویّے ۔ شادی کی عمر ۔ بچوں کی پیدائش کی شرح اور ان کی صنف ، خاندانی تنظیم کا طرز ۔ خاندان میں عورت کا مقام اور سماجی روایات کا متعین کردہ عورت کا متوقع رول ـــ

یہ سب عوامل قومی اعداد و شمار کے لحاظ سے بہت اہم مضمرات رکھتے ہیں ۔ کمسنی کی شادی پر ثقافتی زور و اصرار ، بچوں کی پیدائش کی اونچی شرح اور ماں اور گھر ستن کے کرداروں کی ادائیگی میں مثالیت و عینیت کی رنگ کاری ، یہ سب چیزیں عورت کی جسمانی و ذہنی صحت کو متاثر کرتی ہیں ۔ ہمارے جائزے کے مطابق ۵۳ء۴۸ فیصد جوابات دینے والوں نے یہ بیان کیا کہ عورتیں خاندان کو پہلے کھانا کھلاتی ہیں اور خود آخر میں کھاتی ہیں ۔ غریب خاندانوں میں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عورتوں کو اور بھی زیادہ ناقص غذا ملتی ہے ۔ عمر کی ایک ابتدائی منزل میں شروع ہو جانے والا تابعداری کا یہ عمل ۔ پھر وہ ممانعتیں اور پابندیاں جو حیض کے ساتھ شروع ہو جاتی ہیں اور ڈاکٹر خصوصاً ایک مرد ڈاکٹر سے مشورہ لینے میں تامّل و نارضامندی ۔ ان سب کا نتیجہ عورتوں کی صحت کی طرف سے عام غفلت کی شکل میں برآمد ہوتا ہے ۔

مختلف و متعدد مطالعے خصوصاً وہ جو کہ ترقی پذیر ملکوں سے حاصل ہوئے

ہیں یہ ظاہر کرتے ہیں کہ عورتوں کی صحت کے اہم مسائل یہ ہیں: زچاؤں اور بچوں کی اموات کی زیادہ اونچی شرح ۔ زچگی کی بیماریاں ۔ نومولود بچوں کا کمتر اوسط، ناقص غذا ۔ دماغی بیماریاں ۔خودکشی کی اونچی شرح اور کچھ مخصوص جنسی امراض۔ چونکہ بچے پیدا کرنا اور ان کو پالنا ہی اب تک وہ اہم رول ہے جو ہمارے سماج میں عورت کو تفویض کیا جاتا ہے ۔ اس لیے آبادی کے اس بہت بڑے حصّہ کی سماجی اقتصادی حیثیت کے مدِّنظر جس کو ناکافی رہائش و صفائی اور حقیر قسم کی طبی سہولتیں میسر ہیں ، زچگی اور مادریت ایک خصوصی مسئلہ بن جاتی ہے ۔

ہندوستان میں عورتوں کی صحت کی حالت جن چیزوں سے ظاہر ہوتی ہے ان کے ماخذ دو ہیں ۔ قومی اعداد و شمار کے رجحانات اور صحتی خدمات تک رسائی ۔

۱۔ قومی اعداد و شمار کے رجحانات

مردم شماری کے مطالعوں نے گرتے ہوئے جنسی تناسب اور (خصوصاً ۱۵ تا ۴۴ سال کی عمر کے گروپوں میں) عورتوں کی اموات کی زیادہ اونچی شرح کی جانب توجہ مبذول کرائی ۔ اس نامساعد جنسی تناسب کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اعداد و شمار حقیقت سے کم جمع کیے گئے لیکن اس سے زیادہ یہ ہے کہ لاپرواہی سے کام لیا گیا ۱۹۶۱ء کی مردم شماری نے خاص طور پر اس امر کی طرف توجہ مبذول کرائی کہ ۵ تا ۱۰ سال کی عمر کے گروپ میں اور "تناسل کی عمر میں" عورتوں کی شرح اموات زیادہ اونچی ہے۔ ہندوستان کے حیاتی اعداد و شمار ۱۵ تا ۲۹ سال کی عمر کے گروپ میں عورتوں کی اموات کی شرح دیہی علاقوں اور سارے ملک دونوں میں اونچی ہے ۔ ۱۰ تا ۱۴ سال کی عمر کے گروپ میں نسوانی شرح اموات ۶۸-۱۹۶۰ء کے دوران زیادہ ہو گئی ہے ۔ بعض علماء کی رائے ہے کہ بچوں کی اموات اور پیدائشوں سے متعلق حیاتی اعداد و شمار خاص طور سے وہ جو لڑکیوں سے متعلق ہیں اصل سے کم اندازے ہیں کیونکہ اموات کے تخمینوں اور اموات کی اطلاعات کے درمیان اس قدر زیادہ فرق ہے کہ دیہی علاقوں میں ۔ ۷۵٫۶۹ فیصد تک شہری علاقوں میں ۷۰٫۵۹ فیصد تک پہنچ گیا ہے ۔ ۶۸-۱۹۶۵ کے متعلق ایس۔ آر۔ ایس

کی حالیہ معلومات سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عورتوں کی اموات کی شرح صفر تا ۴ سال اور ۱۵ تا ۴۴ سال کی عمر کے گروپوں میں مسلسل طور پر زیادہ اونچی ہے۔ یہ خیال بھی ظاہر کیا جاتا ہے کہ گرے ہوئے جنسی تناسب کی وجہ زچگی کے زمانے میں عورتوں کی زیادہ اموات ہیں جو کہ ۱۰۰۰۰ زندہ بچے پیدا کرنے والی عورتوں میں ۱۹۶۴ میں پورے ملک میں ۲۵۲ اور ۱۹۶۸ میں دیہی علاقوں میں ۱۰۰۰۰ زندہ بچے پیدا کرنے والی عورتوں میں ۵۷۳ بتائی جاتی ہیں۔ مگر حالیہ طبی تحقیق نے ان عوامل کو دریافت کرنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ جن کی وجہ سے نسوانی اموات کی شرح زیادہ اونچی ہے، اپنی توجہ زچگی کی اموات پر زیادہ مرکوز رکھی ہے اور مختلف عوامل مثلاً حمل کے ضائع ہونے کی صورتیں (اسقاط حمل یا مردہ بچہ کی پیدائش) ہیں جو ۶۸-۱۹۶۰ کی مدت کے دوران ایک حالت پر مستقل قایم رہی ہیں اور کم آمدنی والے گروپوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ایک مطالعہ نے یہ بات بتائی کہ ۱۹۷۲ء میں ناقص غذا پانے والی ماؤں کے حمل ضائع ہونے کی شرح اس قدر اونچی تھی کہ ۳۰ فیصد تک پہنچ گئی۔*

ایک ہزار زندہ پیدا ہونے والے بچوں کے مقابلے میں ۱۱ مردہ پیدا ہونے والے بچوں کی شرح قایم رہی۔ پیدائش سے پہلے مرنے والے بچوں کی اموات ماں کی ناقص غذا، آہنی اجزا کی کمی اور خون کی کمی کا نتیجہ تھیں۔ بچوں اور ماؤں کی اموات کا ایک اور سبب پیدائش کی زیادہ اونچی شرحوں اور بکثرت استقرار حمل کو قرار دیا گیا جن کی وجہ سے پرورش کے لیے اجزائے لحمیہ ناقص مقدار میں فراہم ہوتے ہیں۔ یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ۱۰ تا ۲۰ فیصد اموات پرورش کے لیے خون کی کمی سے اور ۱۶ تا ۴۴ فیصد موتیں زمانۂ حمل کی پیچیدگیوں اور امراض کے باعث ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ ڈبلو۔ ایچ۔ او (W - H.O) کی رپورٹ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نفسیاتی امراض کا شکار مردوں کے مقابلے میں

---

* سی گوپالن اور اے۔ این نائیڈو کا مقالہ "غذا اور تناسل" بحوالہ رسالہ (The Lancet) بمبئی ۱۸ ۱۹۷۲ء

عورتیں زیادہ ہوتی ہیں۔*

۲۔ صحتی خدمات تک رسائی صحت سے متعلق پروگراموں کے اہم مقاصد یہ رہے ہیں کہ دیہی علاقوں میں امراض کے روکنے والی اور امراض کا علاج کرنے والی دونوں قسم کی صحتی خدمات "ابتدائی مراکز صحت" (Primary Health Centres) کے ذریعہ مہیا کی جائیں اور باقاعدہ اور بے قاعدہ طور پر کام کرنے والا طبی عملہ لوگوں کو تربیت دیکر تیار کیا جائے۔ یہ محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ کہ عملہ، طبی رسد اور سازو سامان اور تربیت یافتہ کارکنان کم اور ناکافی ہیں۔ پانچواں منصوبہ، خاندانی منصوبہ بندی اور زچگی اور بچوں کا صحتی خدمات" کے ایک متحدہ پروگرام کا تصور پیش کرتا ہے۔ صحتی خدمات کے اس ڈھانچہ میں سب سے چھوٹی اکائی پی۔ ایچ۔ سی (P. H. C) ہے "بھورے (Bhore) کمیٹی ۱۹۴۶ نے یہ سفارش کی ہے کہ ہر ایک مرکز کو ۴۰،۰۰۰ انسانوں کی آبادی کی ضروریات پوری کرنا چاہیے اور اس میں" ناقابل تخفیف کم سے کم لوازمات" کے طور پر ایک ۳۰ بستروں کا اسپتال۔ دو طبی افسران، چار نرس وائف۔ اور چار تربیت یافتہ دائیاں ہونا چاہیئں۔ مدالیار (Mudaliar) کمیٹی ۱۹۶۴ نے ان سفارشات کا اعادہ کرتے ہوئے یہ مزید تجویز پیش کی کہ ہر ضلع اسپتال میں سرجری، فن وضع حمل اور نسوانی امراض کے تین ماہرین ڈاکٹر ہوں اور ۷۵ پلنگ زچاؤں کے لیے اور ۵۰ (Paediatric) مریضوں کے لیے ہوں۔

جب صحت عامّہ کے مراکز (پی۔ ایچ۔ سی) قائم کیے گئے تو ان کو ۶۰،۰۰۰ سے ....،۰۰۰ تک کی آبادی کی ضرورتوں کو پورا کرنا ہوتا تھا۔ ان کی تعداد پہلے منصوبے میں ۷۲ تھی جو ۱۹۷۲ء میں ۵۱۹۵ ہو گئی۔ اور ذیلی مراکز جو ۱۹۶۷ میں ۱۷۵۲۲ تھے بڑھ کر ۱۹۷۲ء میں ۳۳۲۱۸ ہو گئے ۱۹۶۳ء سے خاندانی منصوبہ بندی کی خدمات ایک طبی افسر ایک توسیعی ڈاکٹر ایک اے۔ این۔ ایم

---

* ڈبلیو۔ ایچ۔ او (W-H-O) کی رپورٹ جنوب مشرقی ایشیا کے خطّے کے حیاتی اعداد و شمار۔

(۴۹ بمد . ۱۸) اور دو فیمیل کارکنوں کے ساتھ شروع کی گئیں. جو چار ذیلی مرکزوں کی نگرانی کرتی تھیں۔ ہر ذیلی مرکز کو متوقع طور پر تقریباً ایک ہزار کی آبادی کی ضرورتوں کو پورا کرنا تھا۔

ایک ماہرین کی کمیٹی نے جو "صحت عامہ کے مراکز" (P. H. C) میں موجود بستروں کے پورے پورے استعمال کا جائزہ لینے کے لیے" وزارت صحت و منصوبہ بندی" نے ۱۹۷۳ء میں مقرر کی تھی یہ مشاہدہ کیا کہ مغربی بنگال اور کیرالہ سے قطع نظر جہاں ان کا استعمال ۵۰ فیصد تھا۔ ریاستوں میں مثلاً بہار۔ راجستھان یو۔پی۔ اڑیسہ۔ مدھیہ پردیش اور جموں کشمیر میں یہ مشکل سے ۸ اور ۱۵ فیصد کے درمیان تھا۔ اس کے اسباب تھے عملے کی بے حسی، ڈاکٹر اور ایک پست سماجی اقتصادی گروپ کے لوگوں کے درمیان مرتبہ و حیثیت کی دیواریں اور بہت سے مرکزوں میں ایک لیڈی ڈاکٹر کی عدم موجودگی۔ زچہ بچہ فلاح و بہبود کی خدمات کو زیادہ بہتر بنانے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے اس کمیٹی نے گھریلو زچہ خدمات کی سفارش کی۔

صحت سے متعلق خدمات کا موجودہ ڈھنگ زیادہ زور امراض کا علاج کرنے والی خدمات پر دیتا ہے جن پر امراض کی روک تھام کرنے والی خدمات کے مقابلے میں مصارف تین گنا ہوتے ہیں، اور ان میں سے بیشتر خدمات شہری علاقوں میں مرکوز ہوتی ہیں۔ اسپتالوں میں صرف ۱۰ فیصد بستر دیہی علاقوں کی آبادی کے ۴/۵ حصّے کے استعمال کے لیے ہوتے ہیں۔

زچگی سے متعلق خدمات میں وسیع علاقائی تنوعات نظر آتے ہیں۔ اسپتالوں کے "اسٹیڈی گروپ" ۱۹۶۸ء کی رپورٹ میں یہ تخمینہ لگایا گیا تھا زچہ کے لیے مخصوص بستر (۴۵۰۰۰) اسپتالوں کی مجموعی سہولتوں کے ۱۰٫۷ فیصد سے بھی کم تھے۔

ریاستوں کے صحتی اعداد و شمار سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ کیرالہ جو زچگی سے متعلق خدمات کی فراہمی کے لحاظ سے بھی امتیازی و نمایاں حیثیت رکھتا ہے عورتوں کی متوقع سب سے اونچی شرح رکھتا ہے جو کہ ۷۰٫۶ ہے جس کا

مقابلہ اتر پردیش سے کیا جا سکتا ہے جہاں یہ شرح ۷ء ۱۳۱۵ ہے یعنی ہندستان میں تقریباً سب سے کم۔ کیرالا میں بچوں کی اموات کی شرح بھی سب سے کم ہے۔ دوسری ریاستیں جیسے تامل ناڈو، آندھرا پردیش، پنجاب، آسام، کرناٹک اور مغربی بنگال نے اپنے یہاں صحت سے متعلق خدمات پر کچھ توجہ دی ہے۔ اور عورتوں کی متوقع عمر بڑھانے میں مدد کی ہے۔

ان خدمات کا اثر ہر جگہ یکساں نہیں ہوا ہے۔ کیونکہ تعلیم، روزگار اور ثقافتی معیار جیسے عوامل ہر علاقے میں دو اہم بدلتی ہوئی چیزیں ہیں جو ان خدمات کے استعمال پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ رویوں اور معیاروں میں خطہ واری تنوعات کے علاوہ صحتی خدمات کی رسائی شہری دیہی اختلافات اور اقتصادی سماجی اختلافات سے بھی متاثر ہوتی ہے، جن میں وسیع قسم کے جنسی اختلافات بھی شامل ہیں۔ بیماریوں کے دوران تیمارداری اور امداد کے لیے عورتوں کو جو ضروریات لاحق ہوتی ہیں ان کے متعلق لوگوں کے رویوں میں جنسی اختلافات کی جڑیں بہت گہری جمی ہوئی ہیں۔ عورتوں کی غذائی کمیوں اور خرابیوں کے سلسلے میں جو مطالعے کیے گئے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے اگرچہ ناقص غذا سے پیدا ہونیوالی بیماریاں نہ صرف بالغ عورتوں کو بلکہ چھوٹی بچیوں کو بھی مقابلتاً زیادہ ہوتی ہیں۔ لیکن اسپتال کے ریکارڈ یہ انکشاف کرتے ہیں کہ ایسی بیماریوں کا علاج بچیوں کے مقابلہ میں بچوں کا زیادہ ہوتا ہے۔

نرسوں اور ڈاکٹروں کی مجموعی تعداد میں سے دو تہائی اور بیشتر اسپتال شہری علاقوں میں مرکوز ہیں (جو مجموعی آبادی کے صرف پانچ حصوں پر مشتمل ہیں) اور دیہی آبادی کو ان سہولتوں کا بہت تھوڑا حصہ ملتا ہے۔ نمونے کے قومی سروے (رانیسواں دور) سے معلوم ہوا کہ شہری ہندوستان میں ہونے والی تمام پیدائشوں کی ۳۷ فیصد ایسی ہوتی ہیں، جن میں تربیت یافتہ طبی عملہ مدد کرتا ہے جبکہ اس کے مقابلے میں دیہی علاقوں میں ایسی پیدائشیں صرف ۹ فیصد ہوتی ہیں۔ نیز یہ کہ شہری علاقوں میں دواؤں اور طبی خدمات پر پرائیوٹ ماہانہ فی کس خرچ کا اوسط ۱۰۱ روپیہ ہے اور اس کا تقریباً آدھا دیہی

علاقوں میں ہے۔ دیہی صحت کی خدمات کے بارے میں ایک حالیہ مطالعہ نے اس چیز کی نشاندہی کی ہے کہ دیہات میں طبی عملہ خصوصاً اے این ایم (ANM) ناکافی تعداد میں ہے۔

اے این ایم کی تعداد کم ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک اے این ایم کو حد سے زیادہ بڑے علاقہ میں کام کرنا پڑتا ہے اور اس کے نتیجہ میں نقل و حمل اور رہائش کی دشواریاں اور رات کے قیام اور حفاظت کے مسائل پیدا ہوتے ہیں، جو ان کی ادائیگی فرض پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ایک عام اے این ایم جیسی بیرونی اور غیر مقامی شخصیت کے لیے اس چیز کی بھی ناگزیر ضرورت ہے کہ دیہی طبقہ کے باا ثر اراکین کس حد تک اس کو قبول کریں اور اس کی حفاظت کریں۔ لیکن چونکہ یہ باثر اراکین اس کی خدمات پر اپنی اجارہ داری قایم کر لیتے ہیں۔ اس لیے "اے این ایم" اور ان عام عورتوں کی کثیر تعداد کے درمیان خلیج وسیع ہو جاتی ہے جن کو اس کی خدمات کی ضرورت ہے۔

خاندانی منصوبہ بندی۔ عورتوں کی حیثیت کے ساتھ اس کا تعلق۔

ہماری رائے میں ماں اور بچہ سے متعلق صحتی خدمات کی طرف سے لاپرواہی کرنے اور حد سے زیادہ توجہ خاندانی منصوبہ بندی پر مرکوز کر دینے کی وجہ سے متذکرہ بالا رجحان کو پیدا ہونے میں مدد ملی ہے اور خود خاندانی منصوبہ بندی کا آخری مقصد فوت ہو گیا ہے۔ ہندوستان میں خاندانی منصوبہ بندی کی تبلیغ کرنے والے اس چیز پر زور دینے میں بڑے تیز اور سرگرم رہے ہیں کہ عورتوں کی حیثیت میں بہتری و ترقی خاندانی منصوبہ بندی کا ایک براہ راست نتیجہ ہو گا۔ لیکن اس میدان میں حالیہ تحقیقات ان دونوں چیزوں کے ایک بالکل برعکس تعلق پر زیادہ متفق معلوم ہوتی ہیں۔ یعنی یہ کہ عورتوں کی بہتر حیثیت جس میں شادی کی عمر میں اضافہ۔ بہتر تعلیم۔ روزگار۔ بہتر رہائشی حالات اور وسیع تر واقفیت و آگاہی کا حصول خاندانی منصوبہ بندی کے طریقوں کی مقبولیت پر ایک براہ راست اثر ڈالتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی کا علم عورتوں کو متواتر اور بکثرت بچوں کی پیدائش کے بندھن سے آزاد کر دیتا

ہے ۔ انھیں اپنی زندگی اور مستقبل پر زیادہ قابو عطا کر دیتا ہے اور ان کے جسمانی وسائل پر پڑنے والے حد سے زیادہ دباؤ کو روکتا ہے ۔ ایک تیسرا نتیجہ جس پر بعض وقت زور دیا جاتا ہے، وہ ہے میاں بیوی کے آپس میں رشتے میں تبدیلی اور خاندان کے اندر معاملات کا فیصلہ کرنے میں بہتر حیثیت۔ ان میں سے ہر ایک نتیجہ اپنی تکمیل کے لیے سماجی ، اقتصادی ، اعداد و شماری اور سیاسی نوعیت کے بدلتے ہوئے حالات کے ایک پیچیدہ مجموعہ سے وابستہ ہے جن کے درمیان اپنے خاندان کی وسعت کو قابو میں رکھنے کی اہلیت اس کی حیثیت کو بہتر بنانے میں ایک امدادی عنصر بن سکتی تھی ۔

ہندوستان میں خاندانی منصوبہ بندی کی ترقی کو جانچنے کی ضرورت کے تحت تحقیقات کا ایک بہت بڑا ذخیرہ پیدا ہو گیا ہے ۔ ایک قومی جائزے* کے نتائج یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ان شادی شدہ جوڑوں کی فیصد تعداد جو خاندانی منصوبہ بندی کے طریقے استعمال کرتے ہیں ۔ بیوی کی عمر، زندہ بچوں کی تعداد، بیوی کی تعلیم اور خاندانی آمدنی گاؤں یا شہر کی وسعت کے ساتھ بڑھ جاتی ہے ۔ ہمیں کچھ ایسی رپورٹیں ملی ہیں کہ مسلمانوں کو خاندانی منصوبہ بندی کے طریقوں کے استعمال میں تامل ہوتا ہے ، لیکن دوسری رپورٹوں اور خود ہماری شہادت سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ مذہبی بناء پر مسلمانوں میں اس کے لیے نارضامندی پائی جاتی ہے ۔ بیشتر مطالعوں سے یہ معلوم ہوا کہ تعلیم اور عورتوں کی روزگاری حیثیت اور خاندانی منصوبہ بندی کو قبول کرنے پر ان کی آمادگی کے درمیان ایک براہ راست تعلق ہے ۔ دیگر تعلق رکھنے والے عناصر میں حسب ذیل شامل ہیں :۔

۱۔ شادی کی عمر میں اضافہ
۲۔ شادی شدہ جوڑوں کی زندگی کا معیار اور سماجی معاشی حیثیت۔
۳۔ نقل و حمل کی اہلیت ۴۔ عوامی اجتماعی ذرائع نشر و اشاعت سے ربط اور طرح طرح کے مانع حمل طریقوں سے واقفیت ۔

---

* یہ جائزہ ۱۹۷۰-۷۱ء کے دوران وزارت صحت اور خاندانی منصوبہ بندی کے تحت "آپریشن ریسرچ گروپ" نے لیا تھا ۔

"آئی یو سی ڈی (I.U.C.D)[*] جس کا استعمال ۱۹۶۵ء میں شروع کیا گیا۔ ابتدا میں کامیاب ہوئی لیکن بعد میں ایک برعکس رجحان ظاہر ہوا۔ ہمارے دورے کے دوران ہمیں بتایا گیا کہ "آئی یو سی ڈی" کو رحم کے اندر لگانے میں بے قاعدہ طبی عملہ کی لاپرواہیوں اور بعد کے ناکافی علاج کی وجہ سے اس کی مقبولیت کو یہ نقصان پہنچا ہے۔

۱۹۵۶-۵۸ کے دوران اولاد پیدا کرنے کے ناقابل بنانے کے آپریشن جتنے بھی کیے گئے ان میں دو تہائی وہ تھے جو عورتوں نے کرائے اور ۱۹۵۹ء تک ان کی تعداد مردوں کے آپریشن سے زیادہ رہی ۱۹۶۰ء کے بعد اس طرح کے آپریشن کرانے والوں میں مردوں کی تعداد زیادہ تیزی سے بڑھنے لگی اور ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۲ء میں جتنے اس قسم کے آپریشن ہوئے ہیں اس میں مردوں کی تعداد ۸۰ فیصد سے زیادہ ہو گئی۔ چونکہ یہ ایسا طریقہ ہے جس میں بچے پیدا کرنے کی اہلیت ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتی ہے۔ اس لیے عام عورتیں اس غیر یقینی کیفیت کے باعث کہ ان کے بچے زندہ رہیں یا نہ رہیں اس آپریشن کے طریقے کو اختیار کرنے پر رضامند نہیں ہوتیں۔ لیڈی ڈاکٹروں نے عورتوں کے اس آپریشن کے خلاف ہم سے دو دلیلیں بیان کیں۔ (۱) نس بندی کے بعد کئی اسباب مرض جمع ہو جانا۔ جس میں عورتوں کو نفسیاتی اختلال کی شکایات پیدا ہو گئیں اور (۲) ایسے کیس جن میں عورتوں کی ایک بڑی تعداد کے لیے خون کی انتہائی کمی کے باعث یہ آپریشن خطرناک ہوتا ہے۔

حکومت کی اختیار کردہ ایک اور تدبیر یعنی "طبی خاتمہ حمل ایکٹ ۱۹۷۱ء" کا مقصد یہ ہے کہ مجرمانہ طور پر اسقاط حمل کے واقعات کو کم کر دیا جائے۔ اس ایکٹ کے تحت معالجات، اصلاح نسل، انسان دوستی اور سماجی فلاح کی بنیادوں پر خاتمہ حمل کی اجازت دے دی گئی ہے۔ اسپتالوں کے ریکارڈوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۵ تا ۲۰ فیصد ماؤں کی موتیں اسقاط حمل کا نتیجہ ہوتی ہیں ۶۷-۱۹۶۶ء

---

[*] (INTRA-UTORINE CONTRACEPTIVE یعنی رحم کے اندر رکھنے والی مانع حمل چیز)

کے حیاتی اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ بچہ کی پیدائش کے سلسلے میں جو اموات واقع ہوتی ہیں ان میں ایسی تعداد بہت ہے، جن کا سبب اسقاط حمل ہوتا ہے حیدرآباد کے "نیشنل انسٹیٹیوٹ آف نیوٹریشن (National Institute of Nutrition) کے دو مطالعے ظاہر کرتے ہیں کہ قبل از وقت ولادت اور اسقاط کے باعث حمل کے ضائع ہونے کے واقعات کم آمدنی والے گروپوں میں ۱۹ ـ ۱۶ فیصد سے لے کر ۲۲ ـ ۲۸ فیصد تک ہوتے ہیں۔

اگرچہ "طبی خاتمہ حمل ایکٹ" ایک صحتی تدبیر کی حیثیت سے اپنی اہمیت پر زور دیتا ہے۔ لیکن دفعہ ۳ (۲) کے تحت شادی شدہ عورتوں کو مانع حمل تدابیر کی ناکامی کی صورتوں میں خاتمہ حمل کی جو اجازت دی گئی ہے وہ آبادی کو قابو میں رکھنے کے ایک ذریعہ کی حیثیت سے اس ایکٹ کی اہمیت پر زور دیتی ہے۔ اس سلسلے میں جو شہادتیں دستیاب ہوئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ایکٹ کو ایک صحتی تدبیر کی حیثیت سے زیادہ ضبط تولید کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

تمام مطالعوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جو عورتیں اسقاط حمل کراتی ہیں ان میں سے بیشتر اگر منصوبہ بندی خاندانوں کے نہیں تو چھوٹے خاندانوں کے حق میں ضرور ہوتی ہیں اور مشورہ کے ذریعہ ان کو ضبط تولید کے زیادہ محفوظ طریقے استعمال کرنے پر آمادہ کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹری اور طبی کام کرنے والوں کو غیر مطلوبہ حمل اور بچے پیدا کرنے کی اہلیت کا خاتمہ دونوں کے ہی سنگین نفسیاتی خطرات کا پورا یقین ہے۔ اس میدان میں باقاعدہ تحقیق بہت ضروری ہے۔ بہت سے ڈاکٹر ریکارڈ کرنے کے طول طویل طریقوں اور کاغذی کارروائی اور خصوصاً دیہی علاقوں میں مناسب طبی سہولتوں کے فقدان کے باعث یہ آپریشن کرنے میں تامل کرتے ہیں۔ ہمیں مطلع کیا گیا ہے کہ بعض اسپتال بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت ختم کرنے پر یا اسقاط حمل کرانے سے پیشتر شوہر کی رضامندی پر اصرار کرتے ہیں۔ ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اگرچہ ڈاکٹروں کو اس بات کا مجاز ہونا چاہیے کہ اگر وہ اسقاط حمل سے صحت کے

میں دونوں کے باہمی ربط کی بنیاد پر شروع کیے گئے اور سینٹرل سوشل ویلفیر بورڈ (C.S.W.B.) ریاستی حکومت اور سی ڈی بلاک بجٹ کی رقم میں ۱۲: ۲ : ۵ کے تناسب سے پہلے پانچ سال کے لیے اور ۲۴: ۱۲ : ۵ کے تناسب سے اس کے بعد کے لیے حصہ دار ہو گئے

۱۹۶۶ء میں ڈبلو۔ ای۔ پی (W.E.P.) کے ۱۹۶۹ مرکز جن کو رضا کار انجمنیں چلاتی تھیں "مہیلا منڈلوں" کے سپرد کر دیے گئے۔ "سی ایس ڈبلیو بی" (C.S.W.B.) اور "ڈبلیو ای پی" (W.E.P.) کی ایک "ایویلوشن کمیٹی" کی سفارشں پر یہ طے کیا گیا کہ بچوں کے لیے متحدہ فلاحی خدمات کا ایک ملک گیر پروگرام تیار کیا جائے۔ اور اس طرح "فیملی اینڈ چائلڈ ویلفیر" (Family and Child Welfare) پروجکٹ (F. & C. W.P.) ۱۹۶۷ء میں شروع ہوئے اور مرکزی و ریاستی حکومتوں نے ان کے لیے ۵۰ : ۵۰ کے تناسب سے مالی وسایل مہیا کیے نیز "یونی سیف (UNICEF)" نے ان کو مدد دی۔ "ایف اینڈ سی۔ ڈبلیو۔ پی" (F.& C. W.P.) جو خدمات فراہم کرتے ہیں۔ وہ یہ ہیں۔ اسکول سے قبل بچے کے لیے متحدہ خدمات۔ نوعمر ماؤں کی تربیت بشمول گھریلو انتظام، صحتی تعلیم، غذائی تعلیم اور بچے کی نگہداشت۔ مہیلا منڈلوں اور موجودہ فلاحی اداروں کے ذریعہ عورتوں کی امداد اور ثقافتی تعلیم اور تفریحی سرگرمیاں۔

پہلے منصوبے میں وزارت صحت نے زچہ بچہ فلاحی خدمات کو صحت سے متعلق ہمہ گیر ترقیاتی پروگرام کے ایک حصے کے طور پر اختیار کیا۔ اس وقت "کمیونٹی پروجکٹ ایڈمنسٹریشن" نے بھی "سی ڈی" (C.D.) اور "این۔ ای۔ ایس" (N.E.S.) بلاکوں میں یہ سروسیس شروع کیں۔ دوسری وزارتوں مثلاً ریلوے، دفاع اور محنت کی وزارت نے بھی زچہ بچہ فلاحی پروگراموں کو آگے بڑھایا۔ چونکہ یہ بات شروع سے ہی محسوس کر لی گئی تھی کہ مقامی آبادی کے اراکین اور رہنماؤں کی سرگرم شرکت کے بغیر ان پروگراموں کے مقاصد حاصل نہیں کیے جا سکتے۔ اس لیے طے کیا گیا کہ ان پروگراموں کو چلانے کے لیے کمیٹیاں بنائی جائیں۔ عورتوں کے پروگراموں کو فروغ دینے کے لیے دیہات اور بلاکوں میں مہیلا منڈلوں کی تنظیم کی گئی۔ مختلف و متعدد دیہاتی کارکنوں کو جن کو

ان ترقیاتی اسکیموں میں ضرورت تھی ۔ سرکاری اداروں نے اور کستور با میموریل فنڈ" "وشو بھارتی" اور "جامعہ ملیہ" جیسی غیر سرکاری تنظیموں نے تربیت دی جس میں ان کو سی ایس ڈبلو بی" (CSWB) نے امداد فراہم کی ۔

شہری علاقوں کے پروگرام

بعض "ڈبلیو ای پی ایس (WEPS) کے علاوہ شہری علاقوں کے بیشتر پروگراموں کو ان رضاکار تنظیموں پر چھوڑ دیا گیا ہے جن کو مالی امداد سی ایس ڈبلیو بی" (CSWB) سے ملتی ہے۔ ان میں سب سے مشہور اسکیم وہ ہے جو کام کرنے والی عورتوں کی اقامت گاہوں" کے لیے ہے ۔

دیگر پروگرام

ان میں مختصر نصابات تعلیم برائے بالغ خواتین اور سماجی اقتصادی پروگرام شامل ہیں (جیسے سادہ حرفتوں میں تربیت کے ساتھ ساتھ مال کی تیاری کے مرکز) جو ابتدا میں شرنارتھی عورتوں کو بحال کرنے کے لیے شروع کیے گئے تھے ۔ بعد میں ان کو سی ایس ڈبلیو بی" (CSWB) نے ضرورت مند عورتوں کے واسطے آمدنی کا ایک مزید ذریعہ فراہم کرنے کے لیے اپنے تحت لے لیا۔

سی ایس ڈبلیو بی (C.S.W.B) چھوٹی پیداواری یونٹوں کے لیے رضاکار فلاحی تنظیموں اور امداد باہمی کی سوسائٹیوں کو مالی امداد بھی فراہم کرتا ہے ۔ کئی وزارتیں جیسے ریلوے ۔ محنت ، زراعت اور کمیونٹی ترقی کی وزارتیں عورتوں کے واسطے حرفتی تربیت مہیا کرنے کے لیے اسکیمیں اختیار کیے ہوئے ہیں ۔

اگرچہ بیشتر فلاحی پروگراموں کی یہی کوشش ہے کہ روزی پیدا کرنے کی قوت بڑھائی جائے مگر ان کا مطلوبہ اثر پیدا نہیں ہوتا ۔ خام مال حاصل کرنے ۔ سرمایہ قائم کرنے اور تیار شدہ مال کو بازار میں لانے میں جو دشواریاں ہیں وہ ان کو ایسے پروگرام بنا دیتی ہیں جو تجارتی اعتبار سے پنپنے والے نہیں ہوتے ۔ تربیت جو کچھ دی جاتی ہے وہ مال کی تیاری کی ہنرمندیوں کے متعلق ہوتی ہے ۔ تنظیم اور بازارکاری کے متعلق نہیں ۔ جدید تجارتی منڈیوں ، فروخت افزا طریقوں اور مستقل منظم پیداوار پر قابو اور قدرت نہ رکھنے کی وجہ سے یہ پروگرام اکثر اپنے مقاصد کے حصول میں ناکام رہتے ہیں ۔ یہ بات حیرت انگیز ہے کہ جو سرکاری ایجنسیاں صنعتی ترقی

لیے خطرہ محسوس کریں تو اس کو روک دیں۔ تاہم ایسی شرائط عائد کرنے کا نتیجہ صرف یہی ہوگا کہ ان کا یہ فعل عورتوں کو نا اہل لوگوں کی طرف دھکیل دیگا اور اگر وقت ضرورت وہ مدد لیں اور اپنی جان کو خطرے میں ڈالیں تو اس ایکٹ کا خاص مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔

حکومت کی پالیسی میں تبدیلیاں

پہلے اور دوسرے پنجسالہ منصوبوں کے دوران حکومت نے آبادی کے مسئلے کو لمبی مدت میں حاصل ہونے والا مقصد قرار دیا تھا۔ جس کا انحصار خصوصاً عورتوں کے درمیان زندگی کے معیاروں کی بہتری اور تعلیم کی وسیع تر اشاعت پر بھی اتنا ہی زیادہ تھا۔ جتنا لوگوں کو خاندانی منصوبہ بندی کے طریقے اختیار کرانے پر۔ تیسرے منصوبے میں اس پروگرام کو زیادہ اہمیت داولیت دی گئی اور شرح پیدائش کی تخفیف کے لیے مقررہ میعاد کے نشانے مقرر کیے گئے۔ ایک بڑا انتظامی نظام قائم کیا گیا اور اہلیت تولید ختم کرنے کے آپریشن کو رواج دینے کے لیے اجتماعی کیمپ یا مالی ترغیبات جیسے طریقے اختیار کیے گئے۔ اسقاط حمل کو قانونی جواز عطا کرنا اس سمت میں ایک اور قدم تھا۔ بعض ریاستی حکومتوں نے تو سرکاری ملازم عورتوں کے لیے زچگی کے زمانے میں ملنے والی مراعات کو بھی صرف تین بچوں تک محدود کر دیا۔

نقطہ زور واہمیت کی یہ تبدیلی ظاہر کرتی ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی کی طرف بڑھنے میں فلاحی انداز کی بہ نسبت کلینکی یا طبی انداز پر حد سے زیادہ انحصار و اعتماد کیا گیا۔ جبکہ منصوبہ میں مقرر کی ہوئی رقم صحت کے پروگراموں کے لیے پہلے منصوبہ کے ۹۰ کروڑ روپیہ سے بڑھ کر چوتھے منصوبے کے ۲۲۶ کروڑ روپیہ تک پہنچ گئی تو اس کے مقابلے میں خاندانی منصوبہ بندی کے لیے یہ رقم پہلے منصوبے ۶۱۵۰ کروڑ روپے سے بڑھ کر چوتھے منصوبے کے ۳۱۵ کروڑ تک جا پہنچی۔ اس طرح آبادی کے کنٹرول پر حد سے زیادہ زور ہونے کی وجہ سے صحت سے متعلق دوسرے پروگراموں کو کافی آگے نہیں بڑھایا جا سکا۔ اب اس بات کو محسوس کیا جا چکا ہے کہ کوئی نشانہ مقرر کر کے اور صرف کلینکی یا طبی انداز اختیار کر کے اس سماجی نفسیاتی مزاحمت پر غلبہ حاصل نہیں کیا جا سکتا جو افلاس، لاعلمی اور نسبتاً غریب تر طبقوں میں

بچوں کے زندہ رہنے کی گری ہوئی شرح سے پیدا ہوتی ہے ۔ پانچویں منصوبے میں خاندانی منصوبہ بندی کو عام صحتی خدمات مثلاً زچہ بچہ کی نگہداشت اور غذائی پروگراموں میں ضم کرنے کا تصور پیش کیا گیا ہے ۔

مجوزہ متحدہ صحتی خدمات خاندانی منصوبہ بندی کی تدابیر کو اختیار کرنے کے سلسلے میں لوگوں کے لیے کہیں زیادہ تحریک فراہم کریں گی ۔ بہ نسبت ان "محرکات" اور "ترغیبات" کے جن پر پہلے بھروسہ کیا گیا تھا اور جو کڑی تنقید کا نشانہ بنی تھیں ۔ ہمارے خیال میں اہلیت یافتہ طبی عملے کی ناکافی حالت خصوصاً دیہی علاقوں میں اور پختہ تجربہ کارانہ مشورہ کی عدم موجودگی خاندانی منصوبہ بندی کی کامیابی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹیں ہیں ۔

فلاح و بہبود کے پروگرام

عورتوں کی ترقی اور فلاح و بہبود کے پروگرام دیہاتوں اور شہروں کے لیے الگ الگ تیار کیے گئے ہیں ۔ بعض عام پروگراموں کے علاوہ دوسرے اور پروگراموں میں جو عورتوں کے مخصوص گروپوں کے لیے کیے گئے ہیں ۔

۱ ۔ دیہی علاقوں کے پروگراموں کا مقصد یہ ہے کہ دیہات میں عورتوں کو ان کی ترقی کے لیے تربیت دی جائے اور حرکت میں لایا جائے ۔ اور یہ پروگرام عورتوں کی ترقی کے بارے میں گاندھی جی کے ان نظریات کے نمونے پر تیار کیے گئے ہیں جن کو "کستوربا میموریل ٹرسٹ" نے ایک ٹھوس شکل عطا کی ۔ تعلیم ۔ صحتی خدمات اور اقتصادی اذیت و مصیبت کو رفع کرنے والے پروگرام (کھدر اور دیہی صنعتوں کی شکل میں) اس مرکب پروگرام کی تین شاخیں ہیں ۔ ۱۹۵۴ء میں جب "سینٹرل سوشل ویلفیر بورڈ" نے یہ طے کیا کہ "ویلفیر ایکشن پروجکٹ" (W.E.P.) شروع کیے جائیں تو یہ پہلو طریقہ کار بنیادی ڈھانچہ کے طور پر اختیار کیا گیا اور ان کی سرگرمیوں میں بال واڑیاں زچہ بچہ خدمات اور عام طبی امداد ، سماجی تعلیم اور عورتوں کے لیے حرفتوں کی تربیت شامل کی گئی ۔

چونکہ اس پروگرام کے مقاصد اور اصول کار کیونٹی ترقیاتی پروگراموں کی طرح تھے جو کہ ۱۹۵۲ء میں کیے گئے اس طرح کے کیونٹی ترقیاتی (سی ۔ ڈی) بلاکول

میں دونوں کے باہمی ربط کی بنیاد پر شروع کیے گئے اور سینٹرل سوشل ویلفیر بورڈ (C.S.W.B.) ریاستی حکومت اور سی ڈی بلاک بجٹ کی رقم میں ۱۲ : ۲۶ : ۵۰ کے تناسب سے پہلے پانچ سال کے لیے اور ۲۴ : ۱۲ : ۵۰ کے تناسب سے اس کے بعد کے لیے حصّہ دار ہو گئے

۱۹۶۴ء میں ڈبلو۔ ای۔ پی (W.E.P.) کے ۱۶۲۹ مرکز جن کو رضا کار انجمنیں چلاتی تھیں "بہیلا منڈلوں" کے سپرد کر دیے گئے۔ "سی ایس ڈبلیو بی" (C.S.W.B.) اور "ڈبلیو ای پی" (W.E.P.) کی ایک "ایویلوشن کمیٹی" کی سفارش پر یہ طے کیا گیا کہ بچوں کے لیے متعدد فلاحی خدمات کا ایک ملک گیر پروگرام تیار کیا جائے۔ اور اس طرح "فیملی اینڈ چائلڈ ویلفیر" (Family and Child Welfare) پروجکٹ (F. & C. W.P.) ۱۹۶۷ء میں شروع ہوئے اور مرکزی و ریاستی حکومتوں نے ان کے لیے ۷۵ : ۲۵ کے تناسب سے مالی وسایل مہیا کیے نیز "یونی سیف" (UNICEF) نے ان کو مدد دی۔ "ایف اینڈ سی۔ ڈبلیو۔ پی" (F. & C. W.P.) جو خدمات فراہم کرتے ہیں۔ وہ یہ ہیں۔ اسکول سے قبل بچے کے لیے متعدد خدمات۔ نوعمر ماؤں کی تربیت بشمول گھریلو انتظام، صحتی تعلیم، غذائی تعلیم اور بچے کی نگہداشت۔ بہیلا منڈلوں اور موجودہ فلاحی اداروں کے ذریعہ عورتوں کی امداد اور ثقافتی تعلیم اور تفریحی سرگرمیاں۔

پہلے منصوبے میں وزارت صحت نے زچہ بچہ فلاحی خدمات کو صحت سے متعلق ہمہ گیر ترقیاتی پروگرام کے ایک حصے کے طور پر اختیار کیا۔ اس وقت "کمیونٹی پروجکٹ ایڈمنسٹریشن" نے بھی "سی ڈی" (C.D.) اور "این۔ ای۔ ایس" (N.E.S.) بلاکوں میں یہ سروسیں شروع کیں۔ دوسری وزارتوں مثلاً ریلوے، دفاع اور محنت کی وزارت نے بھی زچہ بچہ فلاحی پروگراموں کو آگے بڑھایا۔ چونکہ یہ بات شروع سے ہی محسوس کر لی گئی تھی کہ مقامی آبادی کے اراکین اور رہناؤں کی سرگرم شرکت کے بغیر ان پروگراموں کے مقاصد حاصل نہیں کیے جا سکتے۔ یہ اسی لیے طے کیا گیا کہ ان پروگراموں کو چلانے کے لیے کمیٹیاں بنائی جائیں۔ عورتوں کے پروگراموں کو فروغ دینے کے لیے دیہات اور بلاکوں میں بہیلا منڈلوں کی تنظیم کی گئی۔ مختلف و متعدد دیہاتی کارکنوں کو جن کو

ان ترقیاتی اسکیموں میں ضرورت تھی ۔ سرکاری اداروں نے اور کستور با میموریل فنڈ" "وشو بھارتی" اور "جامعہ ملیہ" جیسی غیر سرکاری تنظیموں نے تربیت دی جس میں ان کو سی ایس ڈبلیو بی (CSWB) نے امداد فراہم کی ۔

شہری علاقوں کے پروگرام

بعض ڈبلیو ای پی ایس (WEPS) کے علاوہ شہری علاقوں کے بیشتر پروگراموں کو ان رضاکار تنظیموں پر چھوڑ دیا گیا ہے جن کو مالی امداد سی ایس ڈبلیو بی (CSWB) سے ملتی ہے۔ ان میں سب سے مشہور اسکیم وہ ہے جو "کام کرنے والی عورتوں کی اقامت گاہوں" کے لیے ہے ۔

دیگر پروگرام

ان میں مختصر نصابات تعلیم برائے بالغ خواتین اور سماجی اقتصادی پروگرام شامل ہیں (جیسے سادہ حرفتوں میں تربیت کے ساتھ ساتھ مال کی تیاری کے مرکز) جو ابتدا میں شرنارتھی عورتوں کو بحال کرنے کے لیے شروع کیے گئے تھے ۔ بعد میں ان کو سی ایس ڈبلیو بی (CSWB) نے ضرورت مند عورتوں کے واسطے آمدنی کا ایک مزید ذریعہ فراہم کرنے کے لیے اپنے تحت لے لیا ۔

سی ایس ڈبلیو بی (C.S.W.B.) چھوٹی پیداواری یونٹوں کے لیے رضاکار فلاحی تنظیموں اور امداد باہمی کی سوسائٹیوں کو مالی امداد بھی فراہم کرتا ہے ۔ کئی وزارتیں جیسے ریلوے ۔ محنت ، زراعت اور کمیونٹی ترقی کی وزارتیں عورتوں کے واسطے حرفتی تربیت مہیا کرنے کے لیے اسکیمیں اختیار کیے ہوئے ہیں ۔

اگرچہ بیشتر فلاحی پروگراموں کی یہی کوشش ہے کہ روزی پیدا کرنے کی قوت بڑھائی جائے مگر ان کا مطلوبہ اثر پیدا نہیں ہوتا ۔ خام مال حاصل کرنے ۔ ساکھ قائم کرنے اور تیار شدہ مال کو بازار میں لانے میں جو دشواریاں ہیں وہ ان کو ایسے پروگرام بنا دیتی ہیں جو تجارتی اعتبار سے پنپنے والے نہیں ہوتے ۔ تربیت جو کچھ دی جاتی ہے وہ مال کی تیاری کی ہنرمندیوں کے متعلق ہوتی ہے ۔ تنظیم اور بازارکاری کے متعلق نہیں ۔ جدید تجارتی منڈیوں ، فروخت افزا طریقوں اور مستقل منظم پیداوار پر قابو اور قدرت نہ رکھنے کی وجہ سے یہ پروگرام اکثر اپنے مقاصد کے حصول میں ناکام رہتے ہیں ۔ یہ بات حیرت انگیز ہے کہ جو سرکاری ایجنسیاں صنعتی ترقی

کو بڑھانے کی ذمہ دار ہیں انھوں نے ان پروگراموں کو بالکل نظر انداز کر دیا۔

غذائی پروگرام (Nutrition Programme) جن پر منصوبوں میں کم تر آمدنی والے گروپوں کی ایک بڑی ضرورت کی حیثیت سے زور دیا گیا تھا "محکمہ سماجی فلاح و بہبود" اور "سی ایس ڈبلیو بی" (C.S.W.B.)۔

"وزارت صحت و خاندانی منصوبہ بندی" اور "وزارت زراعت" کے "محکمہ کمیونٹی ترقیات" اور "وزارت تعلیم" کے ذریعہ چلائے جارہے ہیں۔ چوتھے منصوبے کا "خصوصی غذائی پروگرام" (Special Nutrition Programme) جو اسکول سے قبل بچوں کے لیے نیز حاملہ ماؤں اور دودھ پلانے والی ماؤں کے لیے تھا، پانچویں منصوبے میں "بچوں کی ترقی کا متحدہ پروگرام" (Integrated Child Devel-opment Programme) یا ICDP کے نئے نام سے شامل کیا گیا ہے اور یہ تجویز کیا گیا ہے کہ "وزارت صحت" ریاستی صحت کے محکمے، کمیونٹی ترقیاتی محکمے اور محکمہ سماجی فلاح و بہبود باہمی ربط کے ساتھ اس کو پانچویں منصوبے کی مدت کے دوران (I.C.D.P.) کے تمام مصارف مرکزی حکومت برداشت کرے۔

عورتوں کی اصلاح و بحالی کے لیے سماجی تحفظ کے پروگرام ہیں (جیسے انسداد عصمت فروشی، اصلاح کے بعد والی عورتوں کی دیکھ بھال کی سروسیس اور جیل خانوں میں اصلاح و بہبود کی سروسیس) مرکزی سطح پر "نظامت بحالی" اور "محکمہ سماجی فلاح و بہبود" کے ذریعہ فراہم کیے جاتے ہیں۔ ریاستی حکومتوں کو "حفاظت خانے" (Pro-tective homes) قائم کرنے کے لیے امداد دی جاتی ہے۔ اس وقت ملک میں ۱۰۳ حفاظت خانے، ۶۰ داخلہ کے مراکز اور ضلع پناہ گاہیں ہیں۔ ان مسکنوں میں رہنے والی عورتوں کو سلائی اور کشیدہ کاری و زردوزی کی تربیت دی جاتی ہے تاکہ ان اداروں سے الگ ہونے کے بعد وہ خود اپنا روزگار کر سکیں۔ ان مرکزوں میں جو چیزیں تیار ہوتی ہیں، ان کو فروخت کرنے کا کوئی باضابطہ انتظام نہیں ہے اور نہ ان عورتوں کو مال کی تیاری اور فروخت کی تربیت دی جاتی ہے۔ سماجی کام کرنے والوں سے حاصل ہونے والی متعدد رپورٹیں ظاہر کرتی ہیں کہ ان عورتوں کو ان کاموں سے اپنی روزی کمانے میں بہت دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

معاشی بحالی کے بغیر یہ کوششیں بہت کچھ بیکار جاتی ہیں۔ کیونکہ بہت سی عورتیں پھر اپنے پرانے پیشوں میں آنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ تھانہ اور بڑی ہی عورتوں کے لیے جو مسکن ہیں ان کی تعداد اس آبادی کے لحاظ سے بہت ناکافی ہے جس کی ضرورتوں کو انھیں پورا کرنا ہوتا ہے۔

رضاکار تنظیموں کا رول

چار منصوبوں کے دوران جو امدادی رقوم رجسٹرڈ رضاکار اداروں کے لیے منظور کی گئی تھیں اُن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان جماعتوں پر حکومت کا انحصار تیسرے اور چوتھے منصوبے کے دوران کم ہو گیا ہے۔ رضاکار فلاحی پروگرام سرکاری پروگراموں کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور ان کے لیے ایک بنیادی سہارا فراہم کرتے ہیں۔ کیونکہ حکومت کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ عوام کی ساری فلاحی ضرورتوں پر نظر رکھ سکے۔ رضاکار تنظیمیں جن کی بنیادی خوبیاں ان کے لوچ، تجربے کرنے کی زیادہ صلاحیت، عوام کے قرب اور نئے مسائل محسوس کرنے کی اہلیت پر مشتمل ہوتی ہیں۔ اپنی ان خوبیوں کے باعث بہت مدد کر سکتی تھیں ہم ہر ایک ریاست کی خواتین کی رضاکار تنظیموں کے نمائندوں سے ملے۔ ان میں سے زیادہ تر شہری علاقوں تک محدود ہیں اور اس کی رکنیت میں بیشتر تعلیم یافتہ متوسط طبقے کی عورتیں شامل ہیں۔ بہت ہی کم تنظیمیں ایسی ہیں جو دیہاتی عورتوں میں کام کر چکی ہوں۔ ان میں سے بعض تنظیموں کو امدادی رقم انتظام اور اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لیے دی گئی جبکہ بعض دیگر کو صرف پروگراموں کے لیے دی گئی۔ "سی ایس ڈبلیو بی" (C.S.W.B) کے امدادی رقوم کے پروگرام سے قطع نظر کوئی بھی نظام ان اداروں کی کوششوں میں تال میل پیدا کرنے اور ایک ہموار تقسیم کار کو یقینی بنانے کے لیے موجود نہیں ہے۔ ان میں سے بیشتر تنظیموں کے وسایل تربیت یافتہ عملہ رکھنے کے لیے ناکافی ہیں۔

مملکت کے رول اور رضاکار کارکن اداروں کے رول کی اضافی اہمیت منصوبہ سازوں، حکمت عملی تیار کرنے والوں، نظم و نسق کے ذمہ داروں اور سماجی کارکنوں کی توجہات کو اپنی طرف جذب کرتی رہی ہے۔ لیکن یہ بمشکل ہی ایک ایسا مسئلہ ہے جس کو اہمیت کا تناسب معلوم کرنے اور "یہ یا وہ" کا مسئلہ کہا جا سکے۔ جس

چیز کی درحقیقت ضرورت ہے وہ ہے دونوں محاذوں پر ایک اچھی طرح مربوط و ہم آہنگ کوشش۔

فلاح و بہبود کے پروگراموں کا سرکاری انتظام

فلاح و بہبود جو کہ ایک غیر پیداوار مد ہے مقررہ مالی امداد کی رقوم میں سے دیگر سیکٹروں کے مقابلہ میں کم حصہ پاتی ہے۔ ان پروگراموں کے لیے جو رقوم منظور کی جاتی ہیں، ان کا بھی بڑا حصہ اداروں کے انتظام اور قیام پر خرچ ہو جاتا ہے، اور واقعی خدمات کے لیے بہت ہی کم بچتا ہے۔ فلاح و بہبود کے پروگراموں کا انتظام اور طریقۂ عمل روز افزوں طور پر تکنیکی بن گیا ہے:

ہندوستان میں انتظامیہ کی روایت جس نے قانون و امن کو برقرار رکھنے اور اقتصادی نشو و نما پر زور دیا اس تکنیکی اہلیت اور تعیین سمت و مقصد کے فرق کی ضرورت کو تسلیم کرنے میں سست رہی ہے جو کہ سماجی فلاحی انتظام کے لیے بالکل ضروری ہے۔ محدود وسایل اور تکنیکی اہلیت پر اصرار کے فقدان نے پروگراموں کی خوبی پر بہت برا اثر ڈالا ہے۔

اس کے علاوہ دوسرے عوامل بھی ہیں۔ جو پروگراموں پر عمل کرنے میں ایک معقول تنظیم اور لچکدار طریقہ اپنانے کی راہ میں رکاوٹ ہیں:

۱۔ ہمارے نظم حکومت کے وفاقی ڈھانچے میں سماجی پروگراموں اور پالیسیوں کو نافذ کرنے کی ذمہ داری ریاستوں اور مقامی حکام پر ہے۔ لیکن وسائل اور منصوبہ ساز ادارے مرکز میں ہیں۔

۲۔٭ ریاستی حکومتیں سماجی فلاح و بہبود کے پروگراموں کو اور بھی کم اہمیت دیتی ہیں۔ عورتوں کی فلاح و بہبود کی پالیسی خصوصی گروہوں مثلاً رکاوٹوں میں گھری ہوئی یا محتاج عورتوں کی تعلیم یا فلاح و بہبود تک محدود ہے۔ ان کمزور تر طبقوں کے مفادات پر غلبہ رکھنے والے طبقات کے بہ نسبت کم گو اور کم طاقتور

٭ زرعی پیداوار، عورتوں کے پروگراموں کو کسی زمانے میں باہمی ربط و ہم آہنگی، عمل کارکردگی اور کامیابی کا ایک نمونہ کہا جاتا تھا لیکن ان سب کو وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے شری چرن سنگھ نے شاید کفایت شعاری کی بنیاد پر بند کر دیا۔

ہیں۔ ریاستی اور مقامی نظم و نسق میں عام طور پر نقصان اٹھاتے ہیں۔

۳۔ زیادہ تر ریاستی حکومتوں کے پاس اعداد و شمار جمع کرنے یا فلاح و بہبود کے کاموں کا منصوبہ بنانے کے لیے کوئی مشینری نہیں ہے۔ ریاستی بورڈ جو یہ کام کر سکتے تھے زیادہ تر "سی ایس ڈبلیو بی" (C.S.W.B) سے امداد پانے والے رضاکارانہ کام کی نگرانی کرنے۔ ان سے عمل درآمد کرانے اور ان کے متعلق رپورٹ پیش کرنے کے لیے رابطہ کی تنظیموں اور "سی ایس ڈبلیو بی" (C.S.W.B) کے ایجنٹوں کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔

۴۔ سی ایس ڈبلیو بی (C.S.W.B) اور ریاستی بورڈوں کے باہمی تعلق کا واضح طور پر تعین نہیں کیا گیا ہے اور ریاستی بورڈوں کی حیثیت ہر ایک ریاست میں مختلف ہے۔

۵۔ مقامی نظم و نسق کے ادارے عورتوں کے فلاحی پروگرام کے سلسلے میں اور بھی زیادہ کمی ہمدردی اور بے حسی کے آئینہ دار ہیں۔ ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ گاؤں کے چیدہ لوگ عورتوں کی حالت کو بدلنے کی حمایت کا رجحان نہیں رکھتے اور پنچایتوں کی نامزد خواتین اراکین کچھ زیادہ مؤثر ثابت نہیں ہوئی ہیں۔ عورتوں کے پروگراموں کو مالی وسایل کے لحاظ سے فاقہ کشی میں مبتلا رکھا گیا ہے۔

ان سب باتوں کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ مرکزی حکومت پر اس کا بہت بڑا بوجھ پڑ گیا ہے۔ منصوبے کی مدت کے دوران مرکز ترقیاتی پروگراموں کے لیے امداد فراہم کرتا ہے اور اختتام پر ان کے مصارف برداشت کرنے کی پوری ذمہ داری ریاستوں پر عائد ہو جاتی ہے۔ لیکن ریاستیں اس ذمہ داری کو اختیار کرنے پر ہمیشہ رضامند نہیں ہوتیں۔ بعض ریاستوں میں مرکزی حکومت سے مسلسل امداد پانے کے لیے ان پروگراموں کے نئے نام رکھ دیے گئے ہیں۔

یہ مرکزیت سماجی بھلائی کے مقصد کی طرف بڑھنے کے مقامی میلان پر ضرورت سے زیادہ اثر انداز پر چھا گئی ہے۔ مرکز سے پالیسیوں اور پروگراموں کو شروع کیا جاتا ہے تو ان کی وجہ سے بھی پالیسی کی تیاری کی سطحوں اور نفاذ کی سطحوں کے درمیان کا خلا وسیع ہو جاتا ہے۔ اور خود سماجی بھلائی کا اصل مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے مزید برآں

اس مرکزیت نے سماجی فلاح و بہبود کے میدان میں ریاستی حکومتوں کو اپنی ذمہ داریاں سنبھالنے سے باز رکھا ہے۔ موقع پر کام کرنے والے عملہ کے اختیار اور اپنے طور پر کام کرنے کی صلاحیت کو بڑا نقصان پہونچتا ہے۔ کیونکہ پروگرام بناتے وقت ان لوگوں کی رائے نہیں لی جاتی ہے۔ ریاستی بورڈوں کو "سی ایس ڈبلیو بی" (C.S.W.B) کے لیے پروگرام تیار کرنے یا اس کے بنائے ہوئے پروگراموں پر نظر ثانی کرنے کا تقریباً کچھ بھی اختیار حاصل نہیں۔ دفتر شاہی بھی امدادی رقوم کی منظوری اور اجرا میں تاخیر کر کے مقامی ضرورتوں کا لحاظ کیے بغیر پروگراموں کو معیاری رنگ دے کر اور گوناگوں پروگراموں، ایجنسیوں اور کارکنوں کے جھمیلے میں وسایل کو ضایع کر کے پروگراموں کے آگے بڑھنے میں رکاوٹ ڈالتی ہے۔ ریاستی سطح پر بھی ان کاموں میں بہت کم باہمی ربط ہوتا ہے۔ سی ڈبلیو بی (CSWB) نے اپنی سرگرمیوں کو مقامی اداروں کے ساتھ مربوط کرنے کی جو کوششیں کیں ان کا بھی تقریباً کچھ جواب نہیں ملا

سینٹرل سوشل ویلفیر بورڈ

فلاح و بہبود کی سرگرمیوں کو عملی شکل دینے کے لیے سب سے اہم مرکزی ادارہ کی حیثیت سے "سی ایس ڈبلیو بی" (CSWB) کو اپنے ابتدائی برسوں میں قدرے خود مختاری حاصل تھی۔ اگرچہ اس کا کوئی قانونی آزاد وجود نہ تھا* درحقیقت اس کو وجود میں لانے کا واحد جواز فلاحی کام کی نوعیت میں مضمر تھا جس کا انتظام و انصرام ایک سرکاری محکمہ کے بندھے ٹکے طریقہ کار کے ڈھانچے کے اندر آسانی سے نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن تب سے یہ خود مختاری بہت کچھ سلب کی جا چکی ہے۔ جب سینٹرل سوشل ویلفیر بورڈ (CSWB) ایک مخصوص کار کن ادارہ (Specialized Agency) کے طور پر قائم کیا گیا اس وقت تک سماجی فلاح و بہبود کا کوئی مرکزی محکمہ نہ تھا۔ ۱۹۶۶ء میں محکمہ سماجی فلاح و بہبود کے قیام اور فلاحی پروگراموں کی منصوبہ بندی اور کارروائی میں اس کے کام پر اثر پڑا ہے۔ ۱۹۶۲ء اور ۱۹۷۳ء سماجی فلاح و بہبود کے ریاستی وزرا کی

---

* یہ وزارت تعلیم کے ایک ریزولیشن پر ۱۹۵۳ء میں بنایا گیا تھا تاکہ عورتوں بچوں اور دوسرے کم حقوق یافتہ گروہوں کے لیے فلاح و بہبود کے کاموں کو فروغ دیا جائے۔

کانفرنس میں سینٹرل سوشل ویلفیئر بورڈ کی ازسرِ نو تنظیم کی سفارشات کی گئیں۔ جس میں تمام ریاستی حکومتوں اور مرکزی حکومت کے زیرِ انتظام علاقوں کی حکومتوں کو نمائندگی دی جائے۔ اب تک ان سفارشات پر عملدرآمد کرنے کے لیے کوئی کارروائی نہیں کی گئی ہے۔

فلاحی پروگراموں کے اطمینان بخش نفاذ کے لیے یہ ضروری ہے کہ رضاکار اور سرکاری سیکٹر ایک دوسرے کا تکملہ ہوں۔ رضاکار سیکٹر خدمات فراہم کرے اور مالی امداد حکومت کی طرف سے آئے لیکن موجودہ صورتِ حال میں رضاکار تنظیموں کو فیصلے کرنے کے عمل سے کلی طور پر خارج کیا جاتا ہے۔ اور ان کی حیثیت امداد وصول کرنے والے اداروں کی سی ہو کر رہ گئی ہے۔ ان میں تکنیکی اور تنظیمی اہلیت اور تربیت یافتہ عملہ کا بھی فقدان ہے۔ اور جو وسایل انھیں حاصل ہیں ان کو وہ مفید طریقہ پر استعمال کرنے سے معذور ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں سماجی بھلائی کے ریاستی وزیروں اور سکریٹریوں کی جو، کانفرنس ہوئی تھی اس نے اس چیز پر اتفاق کیا کہ مالی امداد دینے کے قوانین اور طریقوں کو آسان اور فیاضانہ بنا دینا چاہیے۔ اور رضاکار کارکنوں کی تربیت کا مناسب انتظام کیا جانا چاہیے۔ تمام سطحوں پر اور خصوصاً ضلع کی سطح پر سرکاری اور غیر سرکاری سیکٹروں کے درمیان اور زیادہ ربط و ہم آہنگی کی ضرورت پر بھی زور دیا گیا ہے۔

سینٹرل سوشل ویلفیئر بورڈ اور ریاستی بورڈوں کے عملہ کا درجہ سرکاری ملازمین کے برابر نہیں ہے۔ فیلڈ ورک کرنے والا عملہ عارضی ملازم ہوتا ہے اور ان کی نوکری کا انحصار پروجیکٹ کے لیے مقرر کی ہوئی رقم اور مدت پر ہوتا ہے۔

عورتوں اور بچوں کے فلاحی پروگراموں کی ترقی میں متعدد عناصر رکاوٹ ڈالتے ہیں مثلاً پروگراموں کی عارضی و محدود (ایڈہاک) نوعیت، فیلڈ ایجنسیوں کی حیثیت اور کاموں میں تنوعات ہونے کی وجہ سے ان ایجنسیوں کو پیش آنے والی طریقۂ عمل کی دشواریاں، مالی امداد کے اجرا میں تاخیر، مالی وسایل کی کمی کے باعث ناکافی تربیت یافتہ عملہ اور ذمہ داری لینے میں ریاستی حکومتوں کی ہچکچاہٹ، مثال کے طور پر چوتھے منصوبے کی مدت کے اختتام پر ۱۲ ریاستیں اور ۳ مرکز کے زیرِ انتظام

علاقے فیملی اور چائلڈ ویلفیر پروجیکٹوں کی ذمہ داری لینے پر رضامند ہوئے اور ۷ ریاستوں میں جو اس کے لیے راضی نہیں ہوئیں جاری پروجیکٹوں کا تسلسل غیر یقینی ہے اور یہ تجویز کیا گیا ہے کہ ان کو متحدہ چائلڈ ڈولپمنٹ (Child Development) کے نئے پروگراموں میں ملا دیا جائے۔ "سی ایس ڈبلیو بی" (CSWB) یہ محسوس کرتا ہے کہ پروگراموں کے ناموں اور مواد میں یہ تبدیلیاں اور ان کے تسلسل کو یقینی بنائے بغیر ان کو ریاستی حکومتوں کی طرف منتقل کر دینا محض ایسا اقدام ہے جو دیہی آبادی کو الجھن میں ڈالنے کا رجحان ہے اور نتائج پر خراب اثر ڈالتا ہے۔

سفارشات

اب ہم اپنی بڑی بڑی سفارشات کے ایک مختصر بیان کے ساتھ اس باب کا اختتام کریں گے۔

صحت اور خاندانی منصوبہ بندی

ہمارے خیال میں خاندانی منصوبہ بندی کی کوششوں پر حد سے زیادہ قوت و توجہ مرکوز کرنے کے نتیجہ میں نہ صرف زچہ بچہ کی صحتی خدمات اور عام خدمات نظر انداز ہوئی ہیں بلکہ خود خاندانی منصوبہ بندی کے پروگرام کا آخری مقصد بھی فوت ہو گیا ہے۔ لہذا ہم دیگر صحتی خدمات کے ساتھ خاندانی منصوبہ بندی کے مجوزہ انضمام کا خیر مقدم کرتے ہیں اور سفارش کرتے ہیں کہ:

۱۔ بشمول خاندانی منصوبہ بندی زچہ بچہ متحدہ صحتی خدمات کے چیف ایگزیکٹو (Chief Executive) کا درجہ بڑھا کر کم از کم اڈیشنل کمشنر (Additional Commissioner) کے برابر کر دیا جائے۔ تاکہ یہ شعبہ پھر منصوبہ بندی کا ماتحت نہ بن جائے۔

۲۔ زچہ بچہ کی صحت سے متعلق سروسوں کے لیے بجٹ میں ایک جداگانہ مد قائم کرنا چاہیے جس کی رقم ان رقوم میں سے لی جائے جو کہ عام صحت اور خاندانی منصوبہ بندی کے شعبوں کے لیے فراہم کی جاتی ہیں۔ چونکہ شیر خوار بچوں کی غذا اور متعدی بیماریوں سے مامون بنانے کے پروگرام اس حالت میں بہتر نتائج پیدا کرتے ہیں جبکہ ان کو زچہ بچہ کی عام صحتی خدمات کا ایک حصہ بنایا جاتا ہے۔ اس لیے ہمیں لگ

کوئی دشواری نظر نہیں آتی ہے کہ ان خدمات کے لیے مالی امداد بڑھا دی جائے۔

۴۔ انتظامیہ نظام طبی عملے اور بجٹ کے مقاصد کے لیے ابتدائی صحتی مرکزوں کی سطح پر زچہ بچہ سروسیں الگ الگ کر دی جائیں۔ کیونکہ یہ چیز ان کے ساتھ زیادہ اہمیت کے سلوک کو یقینی بنا دیگی۔ زچاؤں کے پلنگ، بچوں کو متعدی بیماریوں سے مامون بنانے، سامان اور عورتوں کے لیے خاندانی منصوبہ بندی ان سب کے سلسلے میں دی جانے والی سہولتوں کو "ایم سی ایچ" یونٹ کے حوالہ کیا جا سکتا ہے۔ "پی۔ ایچ۔ سی" (PHC) کو دیگر عام صحت کی خدمات کے ساتھ ساتھ مردوں کی نس بندی کے آپریشنوں کا ذمہ دار بنایا جا سکتا ہے۔ "ایم سی ایچ" (MCH) یونٹ غذا اور متعدی بیماریوں سے مامون بنانے کی تدابیر کو مربوط و ہم آہنگ کر سکتا ہے۔ جو بچوں کے نشوونما کے متعدد پروگرام کا ایک اہم جز ہیں۔ ہر ایک "ایم سی ایچ" (MCH) کے مرکز کو بچے پیدا کرنے کی اہلیت (Fertility) اور امراض قبول کرنے کی صلاحیت (Morbidity) کے متعلق معلومات جمع کرنی چاہئیں جن کا مطالعہ کرنے اور ان کو اعدادی شکل میں مرتب کرنے کا کام ضلع کی سطح پر ضروری اہمیت کے لوگوں کو کرنا چاہیے۔ اس کے لیے ضلع کی سطح پر ایک صحتی اعداد و شمار کے شعبے کی ضرورت ہوگی۔

۵۔ خاندانی منصوبہ بندی کو فروغ دینے والوں کو مالی ترغیبات و تحریکات پیش کرنے کے موجودہ طریقہ کو ختم کر دینا چاہیے۔ خاندانی منصوبہ بندی کو قبول کرنے والی عورتوں کو جو ترغیبات و تحریکات پیش کی جائیں وہ ایک نشان یا سرٹیفکٹ کی شکل میں ہونی چاہیئں تاکہ ماؤں اور بچوں دونوں کے لیے صحتی دیکھ بھال کی خدمات میں ان عورتوں کو اور زیادہ اولیت و اہمیت دینے کا یقینی انتظام ہو جائے۔ لیکن صلاحیت ختم کرنے والے آپریشنوں کے دوران اجرتوں کا جو نقصان ہوتا ہے اس کا معاوضہ ان مزدوروں کو ملنا چاہیے جو روزانہ مزدوری پہ کام کرتے ہیں۔ دوسروں کو اس مقصد کے لیے با تنخواہ چھٹی ملنی چاہیے۔

۶۔ دیہاتی علاقوں میں ان تمام خدمات کے واسطے عملہ بھرتی کرنے کے لیے قابلیت کی جو شرائط مقرر کی گئی ہیں ان کو بتدریج بڑھانے کی ضرورت ہے۔ دیہاتی

علاقوں میں ان کاموں کے لیے زیادہ عمر کی اور تجربہ کار عورتوں کی خدمات حاصل کرنے کی بھی کوششیں کرنا چاہیے۔

۷۔ نسوانی اختلال مثلاً زچگی کے زمانے میں عورتوں کے نفسیاتی و ذہنی امراض اور خاندانی منصوبہ بندی کے طریقوں کے اثرات کے سلسلے میں تحقیق کو فروغ دینا چاہیے۔

۸۔ سرکاری ملازمت کرنے والی عورتوں کو تین بچوں کے بعد زچگی کی سہولیتیں نہ دینے کے طریقہ کو (جو کچھ ریاستی حکومتوں نے اختیار کیا ہے٭) منسوخ کر دینا چاہیے۔

۹۔ خاندانی منصوبہ بندی کے سلسلے میں وسیع عوامی پیمانے پر چلائی جانے والی مہمات کا یہ نصب العین بھی ہونا چاہیے کہ عورتوں کی بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت اور استحصال موروثی بیماریوں کے متعلق اور بچے کی صنف کے متعلق (جس کے لیے عام طور پر عورت کو مورد الزام ٹھہرایا جاتا ہے) جو سماجی رویے اور نظریات پھیلے ہوئے ہیں ان کی اصلاح کی جائے۔ ان معاملات میں صحیح معلومات عورت کی حیثیت کو بہتر بنانے میں بہت کچھ مدد کریں گی۔

طبی خاتمہ حمل ایکٹ میں تبدیلیاں جن کی ضرورت ہے:-

۱۔ اس ایکٹ کی دفعہ ۴ (الف) کے مطابق اس آپریشن کے لیے نابالغ لڑکی کی منظوری کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ جبکہ دوسرے جراحی آپریشنوں میں ۱۲ سال سے زیادہ عمر کے بچوں کی یہ منظوری ضروری ہے۔ ہمارے خیال میں یہ امتیاز بے تکا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ لڑکیوں کے سرپرست اس وقت بھی ان کو آپریشن کرانے پر مجبور کریں جبکہ وہ ایسا نہیں چاہتیں۔ مریض کی منظوری لازمی ہونا چاہیے۔ اس صورت میں جب کہ لڑکی نابالغ ہو، مگر سن بلوغ کے نزدیک ہو اگر وہ اور ڈاکٹر دونوں متفق ہوں تو سرپرست کی منظوری کو نظرانداز کیا جا سکتا ہے۔ ایسے تمام کیسوں میں ڈاکٹر کو زیادہ اختیار دینا چاہیے۔

٭ کیرالہ اور مہاراشٹر

۲۔ اس ایکٹ کی دفعہ ۲ آپریشن سے ہونے والے کسی نقصان کے سلسلے میں ڈاکٹر پر عائد کردہ الزامات کو رد کرنے کے لیے اس کی احتیاطی تدابیر کو کافی قرار دیتی ہے۔ یہ بات غیر ضروری معلوم ہوتی ہے اور ہوسکتا ہے کہ ڈاکٹر اس کے نتیجہ میں لاپرواہی اختیار کرے۔ اس دفعہ کو نکال دینا چاہیے۔

۳۔ اگرچہ ہم ان اخلاقی ملحوظات کے وزن کو محسوس کرتے ہیں، جن کی وجہ سے بہت سے ڈاکٹروں کو اس طرح کے آپریشن کرنے میں تامل ہوتا ہے۔ لیکن ہم یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ عورت کو اس کا حق ہے کہ وہ اپنے بچوں کی تعداد پر قابو رکھ سکے۔ اسی کے ساتھ یہ بات بھی اہم ہے کہ ڈاکٹروں کو ایسے آپریشنوں کے لیے سہولت فراہمی کا اختیار ہونا چاہیے جب ان سے مریضہ کی صحت کو قطعی خطرہ ہو۔ بہت سے اسپتالوں میں یہ شرط رکھ دی گئی ہے کہ اسقاطِ حمل اس وقت کرایا جائے گا، جب عورت صلاحیت تولید کو (Sterlization) کو بالکل ختم کرائے۔ یہ شرط لازمی نہیں ہونا چاہیے یہ کہیں بہتر ہوگا کہ ماہرانہ مشوروں کے ذریعہ رضامند کرنے کے طریقے اختیار کیے جائیں۔

۴۔ ایسے آپریشنوں کے سلسلے میں جو طریقہ کار اپنایا جاتا ہے اور جو کاغذی کارروائی ہوتی ہے۔ اس کو سادہ و آسان بنانے کی ضرورت ہے یہ بھی ضروری ہے کہ جائز خاتمۂ حمل کی سہولتوں کو وسیع کیا جائے۔ خصوصاً دیہی علاقوں میں۔

۵۔ بہت سے اسپتال اب بھی ایسے ہیں جو ایسے آپریشن کرنے سے قبل شوہر کی مرضی پر اصرار کرتے ہیں حالانکہ قانون کے لحاظ سے یہ ضروری نہیں ہے۔ اس امر کے لیے ایک خاص کوشش کرنے کی ضرورت ہے کہ افراد اور سماج دونوں کے نقطۂ نظر سے اس قانون کی سماجی قدر و قیمت کا یقین طبی پیشے کو دلایا جائے۔

۶ زیادہ تر ڈاکٹر غیر شادی شدہ لڑکیوں کے معاملے میں ایسے آپریشن کرنے سے کتراتے ہیں۔ اس نکتہ کی وضاحت ضروری ہے کہ زنا بالجبر ہی وہ واحد وجہ نہیں ہے جس کے تحت غیر شادی شدہ لڑکیوں کا خاتمۂ حمل کرانا جائز ہو، اور نہ ڈاکٹر پر یہ قانونی پابندی عائد ہوتی ہے کہ وہ کسی زنا بالجبر کے کیس میں کیے گئے آپریشن کی اطلاع پولیس کو دے۔

فلاح و بہبود اور ترقی

۱۔ عورتوں کی فلاح و بہبود کن چیزوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس بات کو سمجھنے میں کسی بھی ابہام کو پیدا ہونے سے روکنے

کے لیے اور ایسی پالیسیوں کی تشکیل کو روکنے کے لیے جو بنیادی مقاصد کے ہی خلاف جاتی ہیں حکومت ہند کو دستوری ہدایتوں اور اُن ضمانتوں کی روشنی میں جو اس ملک کی عورتوں کو اور بین الاقوامی برادری کو وقتاً فوقتاً دی گئی ہیں ۔ عورتوں کی ترقی کے متعلق ایک قومی پالیسی کا ارتقا کرنا چاہیے ۔

۲۔ عورتوں اور بچوں کے لیے فلاح و بہبود اور ترقی کے پروگرام بنانے ، ان کو باہم مربوط و ہم آہنگ کرنے اور ان کا انتظام کرنے والی ایک آئینی اور خود مختار خصوصی ایجنسی کی حیثیت سے مرکزی اور ریاستی سوشل ویلفیر بورڈوں کی تنظیم نو کرنی چاہیے ۔

مرکز اور ریاستوں میں مخصوص کمیشنوں کی تشکیل

مختلف قوانین اور انتظامی پروگرام خاطر خواہ اثر ڈالنے میں ناکام رہے تو اس کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ کوئی ایسی واحد ایجنسی موجود نہیں تھی جو ان تدابیر میں باہمی ربط پیدا کر سکتی ، ان کی جانچ پڑتال کر سکتی اور ان کے نفاذ کے طریقوں کے متعلق ماہرانہ مشورہ دے سکتی ۔ لہٰذا ہم مرکز اور ریاستوں میں آئینی خود مختار کمیشنوں کی تشکیل کی سفارش کرتے ہیں ۔ جن کے کام حسب ذیل ہوں :

۱۔ معلومات جمع کرنا

اس کام کے لیے ان کمیشنوں کو یہ اختیار دے دینا چاہیے کہ مختلف معاملات کے بارے میں حکومت کی متعلقہ ایجنسیوں سے معلومات طلب کر سکیں اور یہ اعداد و شمار جمع کرنے کے بہتر طریقے تجویز کر سکیں ۔

۲۔ موجودہ پالیسیوں پروگراموں اور قوانین کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا۔

اس کام میں ان کمیشنوں کو یہ اختیارات حاصل ہوں کہ (۱) ان تدابیر کے عدم نفاذ پر مذمت و ملامت کر سکیں اور (۲) خلاؤں یا نقائص کی نشان دہی کر سکیں اور ترمیمات یا اصلاحات تجویز کر سکیں ۔ متعلقہ سرکاری محکمہ سے مشورہ کر کے کمیشن جو تبصرے اور تجزیہ پیش کرے ، ان کو ایک رپورٹ کی شکل میں پارلیمنٹ یا ریاستی مجلس قانون ساز کے سامنے پیش کرنا چاہیے اور ایک مقررہ وقت کے اندر متعلقہ حکومت کو ان کا جواب دینا چاہیے ۔

۳۔ کمیشن کو معینہ مقاصد اور پالیسیوں کے نفاذ کی غرض سے نئے قوانین ، پالیسیوں

اور پروگراموں کی سفارشیں پارلیمنٹ یا ریاستی مجالس قانون ساز کے سامنے رکھنے کا اختیار ہونا چاہیے ۔متعلقہ حکومت کی یہ ذمہ داری ہونی چاہیے کہ وہ ان سفارشات پر عمل کرنے کے لیے غور کرے یا اپنی نامنظوری کی تشریح کرے ۔

۴۔ شکایات کا تدارک کرنا موجودہ قوانین کی خلاف ورزی کی صورتوں میں ان کمیشنوں کے لیے جو کام تجویز کئے گئے ہیں ان کے پیش نظر ان کی ترکیب وساخت وسیع اور نمایندہ بنیاد پر ہونا ضروری ہے ۔اس میں اراکین کا ایک گروپ عورتوں کی سربرآوردہ تنظیموں، مزدور انجمنوں، قانون ساز اور مقامی اداروں اور پرائیوٹ اور پبلک دونوں سیکٹروں کے آجروں کے نمائندوں کا ہونا چاہیے ۔ دوسرا گروپ قانون، صحت، تعلیم سماجی تحقیق اور نظم ونسق کے ماہرین کا ہونا چاہیے ۔ کمیشنوں کو ایک یا دو ممبروں کو ان حلقوں سے نامزد کرنے کا اختیار ہونا چاہیے ۔جن کی نمایندگی ان کمیشنوں میں نہیں ہے ۔

ان کی چیرمین کسی خاتون کو ہونا چاہیے جو پورے وقت کام کرے اور غیر سرکاری ہو۔ اراکین میں اکثریت خواتین کی ہونی چاہیے اور کمیشنوں کو اس کا اختیار دینا چاہیے کہ وہ اپنا دفتر معتمدی (سکریٹریٹ) قایم کر سکیں۔

ہم ایک ایسی خاص عدالت (Special Tribunals.) کے قیام کی بھی سفارش کرتے ہیں جو انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں ۔ عورتوں کے خلاف امتیاز اور موجودہ قوانین اور پالیسیوں کی خلاف ورزی یا ان سے بچنے کی کوشش کی صورت میں کارروائی کرے تاکہ سماج میں عورتوں کے حقوق کی حفاظت کی جا سکے ۔

بہبود کے سرکاری پروگراموں کے بارے میں معلومات مختلف وزارتوں، سرکاری شعبوں اور مرکزی اور ریاستی حکومتوں کی دیگر ایجنسیوں سے حاصل کی گئیں۔ کمیٹی نے ساری ریاستوں کا دورہ بھی کیا اور ہر ریاست میں شہری اور دیہاتی علاقوں میں مختلف طبقوں اور زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی تقریباً ۵۰۰ عورتوں سے ملاقات کی۔ کمیٹی نے عورتوں کی قومی تنظیموں، فلاح و بہبود کے میدان میں کام کرنے والے رضاکار اداروں، ٹریڈ یونین تنظیموں اور سیاسی پارٹیوں کے نمائندوں اور مختلف طرح کے سرکاری اور غیر سرکاری ماہرین سے بھی ملاقات کی۔ کمیٹی نے اپنے کام سے متعلق خصوصی معاملات پر ایسے ۵۰ مقالوں اور مطالعوں سے بھی استفادہ کیا (ان میں سے بعض دستاویزی تحقیق پر مبنی تھے اور بعض عملی میدان کے تجربات پر) جن کو مختلف علوم و فنون کے عالموں نے تیار کیا تھا ان کی امداد "انڈین کونسل آف سوشل سائنس ریسرچ" نے حاصل کی تھیں۔ اس طرح کمیٹی کی یہ رپورٹ اس کے ممبروں، اس کے چھوٹے سے تحقیقی عملے اور مختلف علوم و فنون کے عالموں کی اجتماعی کوشش پر مبنی ہے۔

اعداد و شمار کے جدول

جدول	عنوان
۱	ہندوستان میں عورتوں کی آبادی کی افزائش سنہ ۱۹۰۱ء تا سنہ ۱۹۷۱ء (لاکھ کے اعداد میں)
۲	ہندوستان میں عمر کے گروپوں کے لحاظ سے جنس کا تناسب۔ سنہ ۱۹۷۱ء
۳	ریاستوں میں جنس کا تناسب۔ سنہ ۱۹۲۱ء تا سنہ ۱۹۷۱ء
۴	پیدائش کے وقت متوقع عمر۔ سنہ ۱۹۲۱-۷۱ء
۵	کل ہندوستان اور ریاستوں میں پیدائش کے وقت متوقع عمر کی تحلیل کردہ اقدار (Projected Values) سنہ ۱۹۸۱-۸۵ء
۶	ہندوستان کے دیہاتی علاقوں میں تخصیص عمر کے لحاظ سے موت کی شرحیں۔ سنہ ۱۹۶۹ء
۷	منتخب ریاستوں میں شیرخوار بچوں کی موت کی شرحیں (SRS)۔ سنہ ۱۹۶۹ء
۸	ہندوستان میں دس سال اور اس سے زیادہ عمر میں ازدواجی حیثیت کے لحاظ سے عورتوں کی آبادی کی فی صد تقسیم۔ سنہ ۱۹۶۱ء اور سنہ ۱۹۷۱ء
۹	(الف) ہندوستان میں شادی کے وقت اوسط عمر سنہ ۱۹۰۱-۶۱ء
	(ب) ہندوستان میں شادی کے وقت اوسط عمر سنہ ۱۹۶۱-۷۱ء
۱۰	(الف) نقل سکونت کے رخ۔ سنہ ۱۹۶۱ء
	(ب) فاصلہ اور نقل سکونت۔ سنہ ۱۹۶۱ء
۱۱	متعلقہ عمر کے گروپوں میں آبادی کے فی صد کے لحاظ سے پرائمری تعلیم میں داخلے
	(الف) پرائمری اور مڈل کے اسٹیج پر
	(ب) ثانوی اسٹیج پر

ضمیمہ جات

عورتوں کی حیثیت کے متعلق قومی کمیٹی

یہ کمیٹی ۲۲ ستمبر ۱۹۷۱ء کو مقرر کی گئی اور اس نے ۳۱ دسمبر ۱۹۷۴ء کو اپنی رپورٹ حکومت کے سامنے پیش کر دی۔

ترکیب و ساخت

یہ کمیٹی مندرجہ ذیل پر مشتمل تھی:

۱۔ ڈاکٹر (شریمتی) پھول رینو گوہا	صدر
۲۔ کماری مانی بین کارا	ممبر رکن
۳۔ شریمتی نیرا ڈوگرا	"
۴۔ شریمتی ساوتری شیام	"
۵۔ شریمتی سکینہ حسن	"
۶۔ شریمتی کے لکشمی راگھو رامیہ	"
۷۔ شریمتی اُرملا ہکسر	"
۸۔ ڈاکٹر (شریمتی) لیلا دوبے	"
۹۔ ڈاکٹر (شریمتی) لوتیکا سرکار	"
۱۰۔ شری وکرم مہاجن	"
۱۱۔ ڈاکٹر (شریمتی) وینا مجمدار	ممبر رکن سکریٹری*

*جب کمیٹی کی یکم اکتوبر ۱۹۷۳ء کو دوبارہ تشکیل ہوئی تو شریمتی شکنتلا مسانی کی جگہ ڈاکٹر (شریمتی) وینا مزمدار رکن سکریٹری بن گئیں۔

کمیٹی کو تفویض شدہ کام

کمیٹی کو جو کام سپرد کیے گئے وہ حسب ذیل تھے :۔

۱۔ عورتوں کی سماجی حیثیت۔ تعلیم اور روزگار کے متعلق دستوری۔ قانونی اور تنظیمی انتظامات کو جانچنا۔

۲۔ پچھلی دو دہائیوں کے دوران ملک میں اور خاص طور سے دیہی علاقوں میں عورتوں کی حیثیت پر ان انتظامات کے اثرات کا اندازہ لگانا اور زیادہ مؤثر پروگرام تجویز کرنا۔

۳۔ عورتوں میں تعلیمی ترقی پر غور کرنا اور ان عوامل کا تعیّن کرنا جو بعض علاقوں میں ترقی کی سست رفتار کے ذمّہ دار ہیں اور اس کے تدارک کی تدابیر تجویز کرنا

۴۔ کام کرنے والی عورتوں کے مسائل کا جائزہ لینا جن میں روزگار کے سلسلے میں کیے جانے والے امتیازی سلوک بھی شامل ہیں۔

۵۔ بدلتے ہوئے سماجی نقشے میں گھرستنوں اور ماؤں کی شکل میں عورتوں کی حیثیت کو جانچنا اور مزید تعلیم و روزگار کے میدان میں ان کے مسائل کا جائزہ لینا۔

۶۔ خاص خاص کیس لیکر عورتوں کی حیثیت پر آبادی سے متعلق پالیسیوں اور خاندانی منصوبہ بندی کے پروگراموں کے مضمرات کا جائزہ لینا۔

۷۔ ایسی کسی بھی طرح کی تدبیریں تجویز کرنا جو عورتوں کو قوم کی تعمیر میں مناسب اور پورا رول ادا کرنے کے قابل بنا سکیں۔

کام کا پروگرام

قانون، روزگار، تعلیم، اقتصادی زندگی کے دوسرے پہلو، سیاسی شرکت، عام سماجی زندگی اور صحتی مسائل کے میدانوں میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں ان کا جائزہ لینے کے لیے کمیٹی نے چھ مخصوص مقصد کی چھوٹی کارکن جماعتیں اور دو مطالعہ گروپ بنائے۔ اس نے پبلک اور پرائیوٹ دونوں سیکٹروں میں اور ان کے روزگار کے اندر واقع ہونے والی تبدیلیوں کی پیمائش کرنے کے لیے چار جائزے لیے۔ عورتوں کی ترقی و فلاح و

بہبود کے سرکاری پروگراموں کے بارے میں معلومات مختلف وزارتوں، سرکاری شعبوں
اور مرکزی اور ریاستی حکومتوں کی دیگر ایجنسیوں سے حاصل کی گئیں۔ کمیٹی نے ساری
ریاستوں کا دورہ بھی کیا اور ہر ریاست میں شہری اور دیہاتی علاقوں میں مختلف طبقوں
اور زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی تقریباً ..ہ عورتوں سے ملاقات کی۔
کمیٹی نے عورتوں کی قومی تنظیموں، فلاح و بہبود کے میدان میں کام کرنے والے رضاکار
اداروں۔ ٹریڈ یونین تنظیموں اور سیاسی پارٹیوں کے نمایندوں اور مختلف طرح کے
سرکاری اور غیر سرکاری ماہرین سے بھی ملاقات کی۔ کمیٹی نے اپنے کام سے متعلق خصوصی
معاملات پر ایسے ۵ ، مقالوں اور مطالعوں سے بھی استفادہ کیا (ان میں سے بعض
دستاویزی تحقیق پر مبنی تھے اور بعض عملی میدان کے تجربات پر) جن کو مختلف علوم و
فنون کے عالموں نے تیار کیا تھا ان کی امداد "انڈین کونسل آف سوشل سائنس ریسرچ"
نے حاصل کی تھیں۔ اس طرح کمیٹی کی یہ رپورٹ اس کے ممبروں، اس کے چھوٹے سے
تحقیقی عملے اور مختلف علوم و فنون کے عالموں کی اجتماعی کوشش پر مبنی ہے۔

اعداد و شمار کے جدول

جدول. عنوان

۱. ہندوستان میں عورتوں کی آبادی کی افزائش سنہ ۱۹۰۱ء تا سنہ ۱۹۶۱ء (لاکھ کے اعداد میں)

۲. ہندوستان میں عمر کے گروپوں لحاظ سے جنس کا تناسب۔ سنہ ۱۹۶۱ء

۳. ریاستوں میں جنس کا تناسب۔ سنہ ۱۹۲۱ء تا سنہ ۱۹۶۱ء

۴. پیدائش کے وقت متوقع عمر۔ سنہ ۱۹۶۱-۷۱ء

۵. کل ہندوستان اور ریاستوں میں پیدائش کے وقت متوقع عمر کی تحلیل کردہ اقدار (Projected Values) سنہ ۱۹۵۱-۵۵ء۔

۶. ہندوستان کے دیہاتی علاقوں میں تخصیص عمر کے لحاظ سے موت کی شرحیں۔ سنہ ۱۹۶۹ء

۷. منتخب ریاستوں میں شیر خوار بچوں کی موت کی شرحیں (S R S) سنہ ۱۹۶۹ء

۸. ہندوستان میں دس سال اور اس سے زیادہ عمر میں ازدواجی حیثیت کے لحاظ سے عورتوں کی آبادی کی فی صد تقسیم۔ سنہ ۱۹۷۱ء اور سنہ ۱۹۶۱ء

۹. (الف) ہندوستان میں شادی کے وقت اوسط عمر سنہ ۱۹۰۱-۷۱ء

(ب) ہندوستان میں شادی کے وقت اوسط عمر سنہ ۱۹۶۱-۷۱ء

۱۰. (الف) نقل سکونت کے رخ۔ سنہ ۱۹۶۱ء

(ب) فاصلہ اور نقل سکونت۔ سنہ ۱۹۶۱ء

۱۱. متعلقہ عمر کے گروپوں میں آبادی کے فی صد کے لحاظ سے پرائمری تعلیم میں داخلے

(الف) پرائمری مڈل کے اسٹیج پر

(ب) ثانوی اسٹیج پر

۱۲۔ سب سطحوں پر تعلیمی نظام میں مجموعی داخلے۔
۱۳۔ یونیورسٹی کی تعلیم میں عورتوں کے داخلے (بشمول تمام سطحات) شعبہ وار۔ (بشمول یو پی بورڈ)
۱۴۔ یونیورسٹی کی تعلیم کے داخلے۔ اسٹیج وار ــ (بشمول تمام شعبہ جات) (بشمول یو پی بورڈ)
۱۵۔ پنج سالہ منصوبہ ۱۹۶۰ء تا ۱۹۷۰ء
۱۶۔ تعلیمی نظام کے مختلف اسٹیجوں پر فارغ التحصیل طلباء کی تعداد
۱۷۔ عمر کے گروپوں کے لحاظ سے عورتوں کی تعلیمی سطح۔
۱۸۔ خواندگی کی رفتار ترقی ۱۹۰۱-۱۹۷۱ء۔ ایک ہزار مردوں کے مقابلے میں خواندہ عورتوں کی تعداد
۱۹۔ جنس کے لحاظ سے ناخواندہ لوگوں کی تعداد ۱۹۵۱-۱۹۷۱ء
۲۰۔ ضلع کی سطح پر تعلیمی عدم توازن۔ کل آبادی میں فی صد خواندہ
۲۱۔ ہندوستان میں تعلیمی سطحوں کے لحاظ سے ایک ہزار مندرجہ فہرست ذاتوں اور قبیلوں کے مردوں اور عورتوں کی تقسیم ۱۹۷۱ء
۲۲۔ مختلف اسٹیجوں پر ملازم استانیوں کی تعداد
(الف) ابتدائی، مڈل اور ثانوی اسکولوں میں
(ب) کالجوں اور یونیورسٹیوں میں۔
۲۳۔ وسیع صنعتی زمروں کے لحاظ سے کام کرنے والی عورتوں کی تقسیم ۱۹۱۱-۱۹۷۱ء
۲۴۔ مخصوص عمر کے کام کرنے والوں کی جماعت میں شرکت کی شرحیں۔ ۱۹۶۱ء اور ۱۹۷۱ء
۲۵۔ ہندوستان کے دیہی و شہری علاقوں میں مزدور جماعت کے اندر اجرت کے بغیر خاندان کا کام کرنے والوں کی فی صد تعداد جنس اور عمر کے لحاظ سے
۲۶۔ کام نہ کرنے والی عورتوں کی درجہ بندی ان کے خاص مشغلہ کے لحاظ سے۔ ۱۹۷۱ء
۲۷۔ بے روزگار افراد کی تخمینی تعداد ۱۹۷۱ء
۲۸۔ (پبلک اور پرائیویٹ) منظم سیکٹر میں خواتین ملازمین کی تقسیم
۲۹۔ فیکٹریوں میں عورتوں کا روزگار
۳۰۔ کانوں میں عورتوں کا روزگار
۳۱۔ باغات میں مجموعی مزدور جماعت میں عورتوں کی فی صد تعداد
۳۲۔ کام کرنے والوں کی تعلیمی حیثیت شہری علاقوں میں ۱۹۶۱ء اور ۱۹۷۱ء

۳۳۔ دیہی علاقوں میں ۱۹۶۱ء اور ۱۹۷۱ء کام کرنے والوں کی تعلیمی حیثیت۔

۳۴۔ تعلیمی سطحوں اور جنس کے لحاظ سے تعلیم یافتہ افراد کی تخمینی مجموعی تعداد۔

۳۵۔ ڈگری یافتہ اور تکنیکی پیشوں میں عورتوں کی تقسیم حیثیت اور تعلیمی سطح کے لحاظ سے۔ ۱۹۷۱ء۔
(منتخب زمرے)

۳۶۔ خواتین ووٹروں میں ووٹ ڈالنے والی عورتوں کی فی صد تعداد۔ لوک سبھا کے انتخابات میں

۳۷۔ انتخاب میں مقابلہ کرنے والی عورتیں اوران کی سیاسی پارٹیاں۔ لوک سبھا کے انتخابات میں

۳۸۔ مختلف منصوبوں میں سماجی خدمات کے لیے مقررہ رقوم اوران پر ہونے والے مصارف۔

۳۹۔ مختلف منصوبوں میں صحت اور خاندانی منصوبہ بندی کے لیے مقررہ رقوم۔

۴۰۔ ریاستوں کے سلسلے میں صحت سے متعلق کچھ اعداد وشمار۔

جدول ۱۱

ہندوستان میں عورتوں کی آبادی کی افزائش سنہ ۱۹۰۱ء تا سنہ ۱۹۷۱ء

(لاکھ کے اعداد میں)

سال	کل آبادی	مردوں کی آبادی	عورتوں کی آبادی	۱۰۰۰ مردوں کے مقابلہ میں عورتیں
سنہ ۱۹۰۱ء	۲۳ کروڑ ۸۰ لاکھ	۱۲ کروڑ ۱۰ لاکھ	۱۱ کروڑ ۷۰ لاکھ	۹۷۲
سنہ ۱۹۱۱ء	۲۵ کروڑ ۲۰ لاکھ	۱۲ کروڑ ۸۰ لاکھ	۱۲ کروڑ ۴۰ لاکھ	۹۶۴
سنہ ۱۹۲۱ء	۲۵ کروڑ ۱۰ لاکھ	۱۲ کروڑ ۸۰ لاکھ	۱۲ کروڑ ۳۰ لاکھ	۹۵۵
سنہ ۱۹۳۱ء	۲۷ کروڑ ۹۰ لاکھ	۱۴ کروڑ ۳۰ لاکھ	۱۳ کروڑ ۶۰ لاکھ	۹۵۰
سنہ ۱۹۴۱ء	۳۱ کروڑ ۹۰ لاکھ	۱۶ کروڑ ۴۰ لاکھ	۱۵ کروڑ ۵۰ لاکھ	۹۴۵
سنہ ۱۹۵۱ء	۳۶ کروڑ ۱۰ لاکھ	۱۸ کروڑ ۶۰ لاکھ	۱۷ کروڑ ۵۰ لاکھ	۹۴۶
سنہ ۱۹۶۱ء	۴۳ کروڑ ۹۰ لاکھ	۲۲ کروڑ ۶۰ لاکھ	۲۱ کروڑ ۳۰ لاکھ	۹۴۱
سنہ ۱۹۷۱ء	۵۴ کروڑ ۸۰ لاکھ	۲۸ کروڑ ۴۰ لاکھ	۲۶ کروڑ ۴۰ لاکھ	۹۳۰

جدول ۷

ہندوستان میں عمر کے گروپوں کے لحاظ سے جنس کا تناسب ۱۹۷۱ء*

عمر کے گروپ	۱۰۰۰ مردوں کے مقابلہ میں عورتیں		
	کل تعداد	دیہاتی	شہری
سب عمروں کی عورتیں	۹۳۱	۹۵۱	۸۵۷
صفر تا ۴ سال	۹۶۹	۹۷۲	۹۵۳
۵ تا ۹ سال	۹۳۵	۹۳۵	۹۳۱
۱۰ تا ۱۴ سال	۸۸۷	۸۸۵	۸۹۵
۱۵ تا ۱۹ سال	۸۸۳	۸۹۲	۸۳۹
۲۰ تا ۲۴ سال	۱۰۰۸	۱۰۷۳	۸۲۰
۲۵ تا ۲۹ سال	۱۰۲۷	۱۰۷۸	۸۶۳
۳۰ تا ۳۴ سال	۹۹۰	۱۰۳۵	۸۱۱
۳۵ تا ۳۹ سال	۹۱۹	۹۳۹	۸۰۲
۴۰ تا ۴۴ سال	۸۸۲	۹۲۳	۷۳۷
۴۵ تا ۴۹ سال	۸۳۹	۸۷۶	۷۰۵
۵۰ تا ۵۴ سال	۸۳۵	۸۶۸	۷۶۱
۵۵ تا ۵۹ سال	۸۹۷	۸۸۲	۸۰۱
۶۰ تا ۶۴ سال	۹۲۳	۹۲۶	۹۰۸
۶۵ تا ۶۹ سال	۹۱۹	۹۲۱	۸۹۵
۷۰ سال	۹۶۱	۹۵۷	۹۷۸
جن کی عمر نہیں بیان کی گئی	۱۰۵۰	۱۰۶۸	۹۷۲

جدول ۱۲

ریاستوں میں جنس کا تناسب ۱۹۲۱ء تا ۱۹۷۱ء

ریاستیں	عورتوں کی تعداد ایک ہزار					
	۱۹۲۱ء	۱۹۳۱ء	۱۹۴۱ء	۱۹۵۱ء	۱۹۶۱ء	۱۹۷۱ء
آندھرا پردیش	۹۹۳	۹۸۷	۹۸۰	۹۸۶	۹۸۱	۹۷۷
آسام	۹۰۸	۸۸۶	۸۸۹	۸۷۷	۸۷۶	۹۰۱
بہار	۱۰۱۶	۹۹۴	۹۹۶	۹۹۰	۹۹۴	۹۵۶
گجرات	۹۴۴	۹۴۵	۹۴۱	۹۵۲	۹۴۰	۹۳۴
جموں و کشمیر	۸۷۰	۸۶۵	۸۶۹	۸۷۳	۸۷۸	۸۸۲
کیرالا	۱۰۱۱	۱۰۲۲	۱۰۲۷	۱۰۲۸	۱۰۲۲	۱۰۱۹
مدھیہ پردیش	۹۷۴	۹۷۳	۹۷۰	۹۶۷	۹۵۳	۹۴۳
مہاراشٹر	۹۵۰	۹۴۷	۹۴۹	۹۴۱	۹۳۶	۹۳۲
میسور	۹۶۹	۹۶۵	۹۶۰	۹۶۶	۹۵۹	۹۵۹
اڑیسہ	۱۰۸۶	۱۰۶۷	۱۰۵۳	۱۰۲۲	۱۰۰۱	۹۸۹
پنجاب	۸۲۱	۸۳۰	۸۵۰	۸۵۸	۸۹۳	۸۷۴
راجستھان	۸۹۶	۹۰۷	۹۰۶	۹۲۱	۹۰۸	۹۱۹
تامل ناڈو	۱۰۲۹	۱۰۲۷	۱۰۱۲	۱۰۰۷	۹۹۲	۹۷۹
اتر پردیش	۹۰۹	۹۰۴	۹۰۷	۹۱۰	۹۰۹	۸۸۳
مغربی بنگال	۹۰۵	۸۹۰	۸۵۲	۸۶۵	۸۷۸	۸۹۲

جدول ۱۲

پیدائش کے وقت متوقع عمر۔ سنہ ۱۹۲۱-۷۱ء

عشرۂ سال	سال	
	مرد	عورتیں
سنہ ۱۹۲۱-۳۱ء	۲۶٫۹	۲۶٫۶
سنہ ۱۹۳۱-۴۱ء	۳۲٫۱	۳۱٫۴
سنہ ۱۹۴۱-۵۱ء	۳۲٫۴	۳۱٫۷
سنہ ۱۹۵۱-۶۱ء	۴۱٫۹	۴۰٫۶
سنہ ۱۹۶۱-۷۱ء	۴۷٫۱	۴۵٫۶

جدول ۵۰

کل ہندوستان اور ریاستوں میں پیدائش کے وقت متوقع عمر کی تظلیل کردہ اقدار سنہ ۱۹۵۱-۸۵ء

(Projected Values)

ریاستیں		سنہ ۱۹۵۱-۶۰ء	سنہ ۱۹۶۱-۶۵ء	سنہ ۱۹۶۶-۷۰ء	سنہ ۱۹۷۱-۷۵ء	سنہ ۱۹۷۶-۸۰ء	سنہ ۱۹۸۱-۸۵ء
کل ہند	مرد	۴۱٫۹	۴۸٫۷	۵۳٫۲	۵۷٫۳	۶۱٫۱	۶۳٫۱
	عورتیں	۴۰٫۶	۴۷٫۴	۵۱٫۹	۵۶٫۰	۵۹٫۰	۶۱٫۸
کیرالہ	مرد	۴۹٫۵	۵۵٫۵	۵۹٫۵	۶۳٫۱	۶۶٫۴	۶۶٫۹
	عورتیں	۴۷٫۱	۵۳٫۱	۵۷٫۱	۶۰٫۷	۶۴٫۰	۶۴٫۵
پنجاب	مرد	۴۹٫۹	۵۵٫۹	۵۹٫۹	۶۳٫۵	۶۶٫۸	۶۷٫۳
	عورتیں	۴۴٫۰	۵۱٫۰	۵۵٫۰	۵۸٫۶	۶۱٫۹	۶۲٫۴
راجستھان	مرد	۴۹٫۲	۵۵٫۲	۵۹٫۲	۶۲٫۸	۶۶٫۱	۶۶٫۶
	عورتیں	۴۴٫۳	۵۰٫۳	۵۲٫۳	۵۷٫۹	۶۱٫۲	۶۱٫۷
مہاراشٹر	مرد	۴۰٫۱	۵۲٫۱	۵۶٫۱	۵۹٫۷	۶۳٫۰	۶۳٫۵

	عورتیں	۴۴٫۳	۵۰٫۳	۵۴٫۳	۵۷٫۹	۶۱٫۲	۶۱٫۷
مغربی بنگال	مرد	۴۴٫۱	۵۰٫۱	۵۴٫۱	۵۷٫۷	۶۱٫۰	۶۱٫۵
	عورتیں	۴۴٫۵	۵۰٫۵	۵۴٫۷	۵۸٫۱	۶۱٫۴	۶۱٫۹
اڑیسہ	مرد	۴۰٫۷	۴۷٫۵	۵۴٫۰	۵۶٫۱	۵۹٫۹	۶۰٫۵
	عورتیں	۴۱٫۱	۴۷٫۹	۵۲٫۴	۵۶٫۵	۶۰٫۳	۶۱٫۳
مدھیہ پردیش	مرد	۴۱٫۲	۴۸٫۰	۵۲٫۵	۵۶٫۶	۶۰٫۴	۶۱٫۴۴
	عورتیں	۴۰٫۰	۴۶٫۸	۵۱٫۳	۵۵٫۴	۵۹٫۲	۶۰٫۴
کرناٹک	مرد	۴۱٫۲	۴۸٫۰	۵۳٫۵	۵۶٫۶	۶۰٫۴	۶۱٫۴
	عورتیں	۳۹٫۲	۴۶٫۰	۵۰٫۵	۵۴٫۶	۵۸٫۴	۵۹٫۴
گجرات	مرد	۴۰٫۸	۴۷٫۶	۵۲٫۱	۵۶٫۲	۶۰٫۰	۶۱٫۰
	عورتیں	۳۹٫۲	۴۶٫۰	۵۰٫۵	۵۴٫۶	۵۸٫۴	۵۹٫۴
اترپردیش	مرد	۳۹٫۴	۴۶٫۲	۵۰٫۷	۵۴٫۸	۵۸٫۶	۵۹٫۶
	عورتیں	۳۸٫۳	۴۵٫۱	۴۹٫۶	۵۳٫۷	۵۷٫۵	۵۸٫۵
بہار	مرد	۳۷٫۳	۴۴٫۹	۴۹٫۹	۵۴٫۵	۵۸٫۸	۶۰٫۸

	عورتیں	۳۷٫۸	۴۵٫۳	۵۰٫۳	۵۴٫۹	۵۹٫۲	۶۱٫۲
آندھرا پردیش	مرد	۳۷٫۸	۴۵٫۳	۵۰٫۳	۵۴٫۹	۵۹٫۲	۶۱٫۲
	عورتیں	۳۶٫۰	۴۳٫۵	۴۸٫۵	۵۳٫۱	۵۷٫۴	۵۹٫۴
آسام	مرد	۳۶٫۹	۴۴٫۱	۴۸٫۱	۵۳٫۷	۵۹٫۰	۶۰٫۰
	عورتیں	۳۷٫۰	۴۴٫۵	۴۹٫۵	۵۴٫۱	۵۸٫۴	۶۰٫۴

ماخذ: منصوبہ بندی پروگرام۔ گجرات۔ "فیکٹ بک (Fact Book) صفحہ ۹ شائع کردہ فیملی پلاننگ بیورو۔ شعبہ قومی اعداد و شمار اور عددی تشکیل گجرات۔ ۱۹۷۲ء

جدول ۷

ہندوستان کے دیہی علاقوں میں تخصیص عمر کے لحاظ سے موت کی شرحیں ۱۹۶۹ء

عمر کا گروپ	مرد	عورتیں
صفر تا ۴ سال	۵۸ ،۱۳	۷۰ ، ۲
۵ تا ۹ سال	۵ ، ۸	۷ ، ۳
۱۰ تا ۱۴ سال	۳ ، ۰	۷ ، ۲
۵ تا ۱۴ سال	۴ ، ۵	۵ ، ۳
۱۵ تا ۱۹ سال	۲ ، ۱	۴ ، ۲
۲۰ تا ۲۴ سال	۲ ، ۹	۵ ، ۵
۲۵ تا ۲۹ سال	۳ ، ۷	۵ ، ۵
۳۰ تا ۳۴ سال	۴ ، ۱	۶ ، ۴
۳۵ تا ۳۹ سال	۶ ، ۵	۶ ، ۱
۴۰ تا ۴۴ سال	۸ ، ۵	۷ ، ۶
۴۵ تا ۴۹ سال	۱۳ ، ۲	۹ ، ۴
۱۵ تا ۴۹ سال	۵ ، ۳	۶ ، ۱
۵۰ تا ۵۴ سال	۱۸ ، ۷	۱۶ ، ۲

عمر کا گروپ	مرد	عورتیں
۵۵ تا ۵۹ سال	۲۸٫۳	۲۰٫۲
۶۰ تا ۶۴ سال	۴۴٫۰	۳۸٫۷
۶۵ تا ۶۹ سال	۵۹٫۹	۵۲٫۲
۷۰ سال*	۱۲۳٫۰	۱۱۹٫۵
میزان	۱۸٫۲	۲۰٫۱

* تخصیص کے لحاظ سے موت کی شرح۔۔ ایک سال مین کسی بھی خاص عمر کے گروپ میں اموات کی تعداد، اس گروپ کے ۱۰۰۰ افراد میں۔

جدول ۷

منتخب ریاستوں میں شیر خوار بچوں کی موت کی شرحیں

سنہ ۱۹۶۹ء (SRS)

ریاست	دیہی		شہری	
	مرد	عورتیں	مرد	عورتیں
آندھرا پردیش	۱۳۱٫۷	۱۲۶٫۰	•	•
آسام	۱۵۴٫۲	۱۰۴٫۳	۱۱۰٫۷	۹۲٫۴
گجرات	۱۵۳٫۲	۱۷۷٫۸	•	•
ہریانہ	۸۲٫۹	۷۶٫۱	•	•
جموں کشمیر	۱۰۶٫۳	۹۸٫۹	۷۹٫۱	۴۰٫۵
کیرالہ	۶۳٫۸	۴۸٫۵	•	•
مہاراشٹر	۱۰۱٫۰	۱۱۳٫۴	•	•
میسور	۱۱۴٫۵	۱۰۴٫۴	۶۰٫۱	۴۵٫۴
پنجاب	۸۰٫۹	۱۱۵٫۹	۷۰٫۳	۸۶٫۷
راجستھان	۱۶۷٫۶	۱۷۰٫۲	۹۷٫۰	۸۴٫۲
تامل ناڈو	۱۱۵٫۰	۱۰۹٫۸	•	•
اتر پردیش	۱۵۳٫۹	۲۰۵٫۹	۱۱۹٫۰	۹۹٫۷
تمام ۱۲ ریاستوں کے تخمینے	۱۳۲٫۳	۱۴۸٫۱	•	•

جدول ۳

ہندوستان میں دس سال اور اس سے زیادہ عمر میں ازدواجی حیثیت کے لحاظ سے عورتوں کی آبادی کی فیصد تقسیم

سنہ ۱۹۶۱ء و سنہ ۱۹۷۱ء

ازدواجی حیثیت	سال	دیہی	شہری	کل تعداد
غیر شادی شدہ	سنہ ۱۹۶۱ء	۱۵٫۸	۲۴٫۲	۱۷٫۲
	سنہ ۱۹۷۱ء	۲۰٫۲	۲۹٫۲	۲۲٫۰
شادی شدہ	سنہ ۱۹۶۱ء	۶۷٫۵	۶۱٫۱	۶۶٫۵
بیوہ	سنہ ۱۹۶۱ء	۱۵٫۸	۱۳٫۰۰	۱۵٫۵
	سنہ ۱۹۷۱ء	۱۲٫۹	۱۱٫۰	۱۲٫۵
مطلقہ/علحدہ شدہ	سنہ ۱۹۶۱ء	۰٫۸	۰٫۶	۰٫۷
	سنہ ۱۹۷۱ء	٫۵	۰٫۴	۰٫۵
غیر معین حیثیت	سنہ ۱۹۶۱ء	۰٫۱۱	۰٫۱	۰٫۰۱
	سنہ ۱۹۷۱ء	۰٫۱	۰٫۱	۰٫۱۱

جدول ۹ (الف)

ہندوستان میں شادی کے وقت اوسط عمر

۱۹۰۱-۷۱ء

عشرہ سال	مرد	عورتیں
۱۹۰۱-۱۱ء	۲۰٫۲	۱۳٫۲
۱۹۱۱-۲۱ء	۲۰٫۵	۱۳٫۶
۱۹۲۱-۳۱ء	۱۸٫۴	۱۲٫۶
۱۹۳۱-۴۱ء	۲۰٫۲	۱۵٫۰
۱۹۴۱-۵۱ء	۱۹٫۸	۱۵٫۴
۱۹۵۱-۶۱ء	۲۱٫۴	۱۶٫۱
۱۹۶۱-۷۱ء	۲۲٫۲	۱۷٫۲

جدول ۹ (ب) ہندوستان میں شادی کے وقت اوسط عمر ۱۹۷۱ء *

	مرد	عورتیں
دیہی	۲۱٫۶	۱۶٫۷
شہری	۲۴٫۳	۱۹٫۲
میزان	۲۲٫۲	۱۷٫۲

* ایک فی صد نمونے کے اعداد و شمار پر مبنی

جدول [illegible] (الف)

نقلِ سکونت کے رُخ

سنہ ۱۹۷۱ء

نقل سکونت کی نوعیت	کل تعداد	مرد	عورتیں	ایک ہزار مردوں کے مقابلے میں عورتیں
دیہات سے دیہات میں	۷۰٫۸	۵۲٫۷	۷۸٫۶	۳۴۴۷
شہر سے دیہات میں	۵٫۵	۷٫۶	۴٫۶	۱۳۹۸
دیہات سے شہر میں	۱۳٫۹	۲۳٫۴	۹٫۸	۹۶۳
شہر سے شہر میں	۹٫۸	۱۶٫۳	۷٫۰	۹۹۰
میزان	۱۰۰٫۰	۱۰۰٫۰	۱۰۰٫۰	۲۳۱۰

جدول [illegible] (ب) فاصلہ اور نقل سکونت سنہ ۱۹۷۱ء

نقل سکونت کی نوعیت	کل تعداد	مرد	عورتیں	ایک ہزار مردوں کے مقابلے میں عورتیں
تھوڑا فاصلہ	۶۷٫۴	۵۴٫۹	۷۲٫۸	۳۰۶۳
درمیانی نوعیت کا فاصلہ	۲۱٫۵	۲۶٫۶	۱۹٫۴	۱۶۸۲
طویل فاصلہ	۱۱٫۱	۱۸٫۵	۷٫۸	۹۸۰
میزان	۱۰۰٫۰	۱۰۰٫۰	۱۰۰٫۰	۲۳۱۰

جدول ۱۱

متعلقہ عمر کے گروپوں میں آبادی کے فیصد کے لحاظ سے

(الف) پرائمری تعلیم میں داخلے

سال	پرائمری اسٹیج (درجات ۱ تا ۴)			مڈل اسٹیج (درجات ۵ تا ۸)		
	لڑکے	لڑکیاں	کل	لڑکے	لڑکیاں	کل
۱۹۵۰-۵۱ء	۵۵٫۰	۲۰٫۱	۳۷٫۸	۲۰٫۸	۴٫۶	۱۳٫۰
۱۹۵۵-۵۶ء	۵۹٫۵	۲۵٫۰	۴۲٫۶	۲۵٫۴	۶٫۹	۱۶٫۵
۱۹۶۰-۶۱ء	۷۴٫۰	۳۵٫۰	۵۴٫۸	۳۵٫۵	۱۲٫۵	۲۴٫۳
۱۹۶۵-۶۶ء	۹۰٫۲	۴۷٫۶	۶۹٫۲	۴۹٫۹	۲۰٫۷	۳۰٫۶
۱۹۷۰-۷۱ء	۱۰۹٫۸	۷۸٫۶	۸۹٫۷	۶۶٫۷	۳۳٫۰	۵۰٫۷
۱۹۷۵-۷۶ء (ازروئے تخمینہ)	۱۰۹٫۷	۹۷٫۲	۱۰۳٫۴	۸۱٫۹	۵۵٫۷	۶۹٫۲

ماخذ:- وزارتِ تعلیم حکومت ہند

(باقی اگلے صفحہ پر)

جدول ۱۱ (گزشتہ سے پیوستہ)

(ب) ثانوی اسٹیج

سال	(درجات ۷ تا ۱۰)			(درجات ۹ تا ۱۱)		
	لڑکے	لڑکیاں	کل	لڑکے	لڑکیاں	کل
۱۹۵۰-۵۱ء	۱۰٫۹	۱٫۸	۶٫۵	۳٫۳	۰٫۵	۱٫۹
۱۹۵۵-۵۶ء	۱۴٫۹	۳٫۴	۹٫۳	۵٫۲	۰٫۹	۳٫۱
۱۹۶۰-۶۱ء	۲۰٫۸	۵٫۴	۱۳٫۱	۸٫۰	۱٫۶	۴٫۹
۱۹۶۵-۶۶ء	۲۸٫۷	۹٫۱	۱۹٫۱	۱۱٫۵	۲٫۳	۷٫۰
۱۹۷۰-۷۱ء	۳۴٫۲	۱۲٫۲	۲۳٫۴	۱۴٫۶	۳٫۵	۹٫۲
۱۹۷۵-۷۶ء	۴۰٫۸	۱۶٫۹	۲۹٫۱	۱۷٫۵	۴٫۸	۱۱٫۰

ماخذ:- وزارت تعلیم حکومت ہند۔

جدول ۱۲

سب سطحوں پر تعلیمی نظام میں مجموعی داخلے

سال	لڑکے	لڑکیاں	لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں کی زیادتی
۱۹۵۰-۵۱ء	۱،۹۱،۴۲،۰۰۹	۶۴،۰۰،۷۶۳ (۳۳)	۱،۲۷،۴۱،۲۴۶
۱۹۶۰-۶۱ء	۳۳،۷۰،۴،۸۹۷	۱۴۲۵۹۵۰۵ (۴۲)	۱،۹۱،۴۵،۳۹۲
۱۹۷۰-۷۱ء	۵،۵۷،۱۲،۶۲۳	۳،۰۰،۳۰،۴۸۴ (۵۴)	۲،۵۶،۸۲،۱۳۹

قوسین میں درج شدہ اعداد ۱۰۰ لڑکوں کے مقابلے میں داخل شدہ لڑکیوں کی تعداد ظاہر کرتے ہیں۔

جدول ۱۳

یونیورسٹی کی تعلیم میں عورتوں کے داخلے (بشمول تمام سطحات) (شعبہ وار) (بشمول یو۔پی بورڈ)

	سال								
	۱۹۵۰-۵۱ء			۱۹۶۰-۶۱ء			۱۹۷۰-۷۱ء		
شعبے	کل تعداد	عورتیں	۱۰۰ مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی تعداد	کل تعداد (T)	عورتیں (W)	۱۰۰ مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی تعداد	کل تعداد	عورتیں	۱۰۰ مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی تعداد
۱ آرٹس (ARTS)	۱۸۲۰۰۵	۲۹۳۶۲	۱۹٫۱	۴۸۶۲۲۸	۱۱۹۹۸۷	۲۴٫۶	۱۳۲۹۶۲۷	۴۲۱۸۵۰	۳۱٫۷
۲ سائنس	۱۲۷۱۶۸	۹۰۴۶	۷٫۱۰	۳۰۲۷۰۰	۳۱۶۹۶	۱۰٫۵	۹۴۸۰۰۹	۱۶۸۵۴۰	۱۷٫۸
۳ کامرس	۳۴۰۶۷	۱۸۹	۰٫۶۶	۹۰۲۱۴	۸۳۱	۰٫۹	۳۳۴۲۰۸	۱۲۶۷۵	۳٫۷
۴ تعلیم	۴۱۳۵	۱۳۳۹	۳۲٫۴	۱۹۰۰۵	۶۲۳۰	۳۲٫۸	۵۶۹۲۲	۲۰۷۹۱	۳۶٫۵
۵ انجینئرنگ / ٹیکنالوجی	۱۲۰۹۴	۱۹	۰٫۱۶	۴۵۳۸۹	۴۰۳۰	۰٫۸۹	۹۰۰۳۴	۹۱۰	۱٫۰
۶ ڈاکٹری	۱۵۲۶۰	۲۴۹۳	۱۶٫۳	۳۵۲۱۵	۷۷۱۴	۲۱٫۹	۹۶۶۰۱	۲۲۲۹۶	۲۲٫۸
۷ زراعت	۴۷۴۴	۸	۰٫۱۷	۲۷۵۸۴	۱۲۴	۰٫۴۵	۴۳۳۵۲	۱۶۹	۰٫۴
۸ بیطاری سائنس	۱۱۰۱	۵	۰٫۴۵	۵۳۸۵	۳۸	۰٫۷۱	۶۲۲۲	۴۴	۰٫۷
۹ قانون	۱۳۶۴۹	۲۹۰	۲٫۱	۲۷۲۵۱	۸۱۵	۳٫۰	۷۰۶۱۸	۲۶۲۶	۳٫۷
۱۰ دوسرے شعبے	۲۵۲۲	۴۷۵	۱۸٫۸	۱۰۸۹۳	۲۹۱۷	۲۶٫۸	۱۴۸۰۰	۵۹۱۳	۴۰٫۰
۱۱ کل شعبے	۳۹۶۷۴۵	۴۳۱۲۶	۱۰٫۹	۱۰۴۹۸۶۴	۱۷۰۴۵۵	۱۶٫۲	۳۰۰۱۲۹۳	۶۵۵۸۲۲	۲۱٫۹

ماخذ: یونیورسٹی گرانٹ کمیشن ۱۹۵۰-۵۱ء اور ۱۹۶۰-۶۱ء وزارت تعلیم اور سماجی فلاح و بہبود ۔ یو جی سی

217

جدول ۱۴

یونی ورسٹی کی تعلیم کے داخلے (بشمول تمام شعبہ جات)۔ شعبہ وار۔ (بشمول یو.پی. بورڈ)

سال	انڈر گریجویٹ *			پوسٹ گریجویٹ			ریسرچ			سب سطحوں پر		
	کل تعداد (T)	عورتیں (W)	ع + ۱۰۰ (T)	کل تعداد (T)	عورتیں (W)	ع + ۱۰۰ (T)	کل تعداد (T)	عورتیں (W)	ع + ۱۰۰ (T)	کل تعداد (T)	عورتیں (W)	ع + ۱۰۰ (T)
۵۱-۱۹۵۰ء	۳۷۵۳۱۹	۴۰۴۹۹	۱۰٫۸	۱۹۹۹۲	۲۴۲۵ ⊗	۱۲٫۱	۱۴۳۴	۲۰۲	۱۴٫۱	۳۹۶۷۴۵	۴۳۱۲۶	۱۰٫۵۹
۶۱-۱۹۶۰ء	۹۸۵۸۷۲	۱۵۹۴۹۱	۱۶٫۲	۵۸۹۰۹	۱۰۱۷۰	۱۷٫۳	۵۰۸۳	۷۹۴	۱۵٫۶	۱۰۴۹۸۶۴	۱۷۰۴۵۵	۱۶٫۲
۷۱-۱۹۷۰ء	۲۸۲۶۷۹۹	۶۱۱۵۵۳	۲۱٫۶	۱۶۱۱۸۲	۴۱۵۱۶	۲۵٫۸	۱۳۳۱۱	۲۶۵۳	۲۰٫۰	۳۰۰۱۲۹۲	۶۵۵۸۲۲	۲۱٫۹

* بشمول پی۔یو۔سی۔ پی پی۔سی

⊗ اس میں کامرس، تعلیم، انجینئرنگ/ٹیکنالوجی اور ڈاکٹری کی ریسرچ کے داخلے شامل ہیں۔

ماخذ:۔ (۱) ۵۱-۱۹۵۰ء اور ۶۱-۱۹۶۰ء ۔ "ہندوستان میں یونیورسٹیوں میں تعلیم" وزارت تعلیم اور سماجی فلاح و بہبود کی سالانہ اشاعت۔

(۲) ۷۱-۱۹۷۰ء ۔ "ہندوستان میں یونی ورسٹیوں کی ترقی، بنیادی حقائق اور اعداد"۔ یو.سی.جی کی سالانہ اشاعت

جدول ۱۵

تعلیم کے اسٹیج کے لحاظ سے داخلوں میں پنج سالہ اضافہ ۱۹۶۰ء تا ۱۹۷۰-۷۱ء

اسٹیج	۱۹۶۰-۶۱ء تا ۱۹۶۵-۶۶ء پنج سالہ شرح اضافہ			۱۹۶۵-۶۶ء تا ۱۹۷۰-۷۱ء پنج سالہ شرح اضافہ		
	لڑکے	لڑکیاں	کل تعداد	لڑکے	لڑکیاں	کل تعداد
قبل پرائمری	۴۵ فیصد	۳۳٫۹ فیصد	۴۷٫۰ فیصد	۲۹٫۹ فیصد	۱۹٫۰ فیصد	۲۴٫۸ فیصد
پرائمری	۳۴٫۹ فیصد	۵۶٫۱ فیصد	۴۱٫۸ فیصد	۲۰٫۶ فیصد	۳۰٫۷ فیصد	۲۴٫۲ فیصد
ثانوی	۴۹٫۷ فیصد	۷۰٫۶ فیصد	۵۴٫۷ فیصد	۱۸٫۲ فیصد	۳٫۵ فیصد	۲۱٫۵ فیصد
یونیورسٹی	۷۶٫۳ فیصد	۱۱۹٫۴ فیصد	۸۳٫۵ فیصد	۵۷٫۳ فیصد	۷۸٫۴ فیصد	۶۱٫۵ فیصد
پیشہ ورانہ اور خاص اسکول	۱۶٫۵ فیصد	۷۴٫۶ فیصد	۱٫۶ فیصد	۳٫۹ فیصد	۳۴٫۶ فیصد	۹٫۳ فیصد
سب سطحوں پر	۳۷٫۱ فیصد	۶۰٫۱ فیصد	۴۴٫۰ فیصد	۲۰٫۵ فیصد	۳۱٫۵ فیصد	۲۴٫۲ فیصد

جدول ۱۶ (۱)

تعلیمی نظام کے مختلف اسٹیجوں پر فارغ التحصیل طلبا کی تعداد

سال	امتحان					
	میٹرک یا اس کے برابر کوئی اور امتحان			انٹر سکنڈری یا اس کے برابر کوئی اور امتحان		
	لڑکے	لڑکیاں	۱۰۰ لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں کی تعداد	لڑکے	لڑکیاں	۱۰۰ لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں کی تعداد
۱۹۴۷-۴۸ء	۱۲۶۸۸۵	۱۵۳۹۱	۱۲	—	—	—
۱۹۵۰-۵۱ء	۲۱۰۹۹۵	۳۰۱۴۸	۱۴	—	—	—
۱۹۵۵-۵۶ء	۳۵۷۱۶۶	۷۲۳۲۸	۲۰	—	—	—
۱۹۶۰-۶۱ء	۴۵۲۱۵۲	۱۱۳۹۶۶	۲۵	۴۹۶۰۷	۱۰۲۹۰	۲۲
۱۹۶۵-۶۶ء	۶۴۵۵۵۲	۲۰۲۷۱۱	۳۱	۱۶۷۸۵۲	۳۹۳۱۸	۲۳

(باقی اگلے صفحہ پر)

(گزشتہ سے پیوستہ)

جدول نمبر ۱۶ (۲)

سال	امتحان: قبل یونیورسٹی (PRE- UNIVERSITY) لڑکے	لڑکیاں	۱۰۰ لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیاں	امتحان: انٹرمیڈیٹ لڑکے	لڑکیاں	۱۰۰ لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیاں
۱۹۴۷-۴۸ء	—	—	—	۳۰۸۹۸	۴۶۸۰	۱۵
۱۹۵۰-۵۱ء	—	—	—	۴۳۱۴۸	۹۵۱۶	۱۵
۱۹۵۵-۵۶ء	—	—	—	۱۱۱۸۱۸	۱۹۹۲۱	۱۸
۱۹۶۰-۶۱ء	۷۱۸۲۴	۲۰۶۵۰	۲۹	۹۲۸۳۸	۲۲۸۹۳	۲۵
۱۹۶۵-۶۶ء	۱۱۳۰۹۴	۳۹۷۸۳	۳۵	۵۲۳۰۶	۱۴۲۵۵	۳۱

(باقی اگلے صفحہ پر)

(گزشتہ سے پیوستہ)

جدول ۱۶ (۳)

سال	امتحان: بی۔ اے۔/بی۔ ایس۔ سی (پاس اور آنرز) — لڑکے	لڑکیاں	۱۰۰ لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیاں	ایم۔ اے۔ ایم۔ ایس۔ سی — لڑکے	لڑکیاں	۱۰۰ لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیاں
۱۹۴۷-۴۸ء	۱۵۷۱۹	۲۸۷۶	۱۸	۳۱۹۰	۴۴۴	۱۴
۱۹۵۰-۵۱ء	۲۷۳۵۷	۴۸۸۱	۱۸	۶۲۶۲	۸۷۶	۱۴
۱۹۵۵-۵۶ء	۴۴۰۴۱	۹۹۴۸	۲۳	۹۶۰۳	۲۱۶۶	۲۳
۱۹۶۰-۶۱ء	۷۰۷۵۷	۲۲۲۹۵	۳۲	۱۸۵۷۰	۵۱۱۵	۲۸
۱۹۶۵-۶۶ء	۸۹۸۶۵	۳۸۵۸۹	۴۳	۲۵۹۵۹	۹۶۲۱	۳۷

(باقی اگلے صفحہ پر)

جدول ۱۶ (۴)

(گزشتہ سے پیوستہ)

سال	امتحان: عام اور پیشہ ورانہ مضامین میں ڈاکٹریٹ — لڑکے	لڑکیاں	۱۰۰ لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیاں	امتحان: پیشہ ورانہ ڈگریاں اور ان کے برابر دوسری ڈگریاں (صرف ڈپلوما) — لڑکے	لڑکیاں	۱۰۰ لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیاں
۱۹۴۷-۴۸ء	۱۰۳	۴	۴	۱۰۱۷۳	لڑکوں اور لڑکیوں کی تعداد الگ الگ دستیاب نہیں ہے	—
۱۹۵۰-۵۱ء	۱۳۶	۱۰	۷	۱۷۰۹۲	۱۵۵۳	۹
۱۹۵۵-۵۶ء	۳۲۱	۲۹	۹	۳۱۹۵۱	۳۸۲۱	۱۲
۱۹۶۰-۶۱ء	۹۵۹	۲۸۳	۳	۵۳۰۴۵	۷۱۷۹	۱۴
۱۹۶۵-۶۶ء	۸۰۸	۹۹	۱۶	۶۷۵۴۶	۱۰۷۲۱	۱۶

جدول ۱۷

عمر کے گروپوں کے لحاظ سے عورتوں کی تعلیمی سطح

لاکھوں میں

تعلیمی سطح	عورتوں کی تعداد: شہری علاقوں میں	عورتوں کی تعداد: دیہاتی علاقوں میں	کل تعداد
	عمر کا گروپ ۱۵ تا ۲۴ سال		
ناخواندہ:	۳۶	۲۶۲	۲۹۸
	(عورتوں کی مجموعی تعداد کا ۵ ، ۷۶ فیصد اس عمر کے گروپ میں ہے)		
خواندہ:	۷	۲۱	۲۸
پرائمری اور مڈل:	۳۵	۵۲	۸۷
میٹرک پاس اور اس سے زیادہ:	۲۰	۷	۲۷
	(عورتوں کی مجموعی تعداد کا ۲ ، ۶ فیصد عمر کے اس گروپ میں ہے)		
خواندہ اور تعلیم یافتہ عورتوں کی کل تعداد	۶۲	۸۱	۱۴۳

(باقی اگلے صفحہ پر)

(بقیہ صفحہ سابقہ)

تعلیمی سطح	عورتوں کی تعداد		کل تعداد (لاکھوں میں)
	شہری علاقوں میں	دیہاتی علاقوں میں	
	عمر کا گروپ ۲۵ سال اور اس سے زیادہ		
ناخواندہ:	۱۲۹	۸۱۶	۹۴۵
	عورتوں کی مجموعی تعداد کا ۸۰.۶ فیصد اس عمر کے گروپ میں		
خواندہ:	۱۷	۲۹	۴۶
پرائمری اور مڈل کی سطح پر:	۴۱	۴۱	۸۲
میٹرک اور اس سے زیادہ تعلیم یافتہ:	۱۴	۳	۱۷
	عورتوں کی مجموعی تعداد کا [illegible] فیصد اس عمر کے گروپ میں ہے		
خواندہ اور تعلیم یافتہ کا میزان	۷۲	۷۴	۱۴۶

(جدول ۱۴)

نوٹ: عورتوں کے عمر کے مختلف گروپوں میں اور مختلف تعلیمی سطحوں پر تعداد اولاً ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کی ایک فیصد نمونے کی معلومات (Sample Data) سے لی گئی۔ اس کے بعد اس تعداد کو کل عورتوں کی آبادی پر منطبق کیا گیا جو کہ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری میں دی گئی تھی۔ تاکہ وہ قریب قریب اعداد و شمار معلوم کیے جاسکیں جو جدول بالا میں دیے گئے ہیں۔

خواندگی کی رفتار کی ـــــ ٪ مردوں کے مقابلے میں خواندہ عورتوں کی تعداد

سال	کل خواندہ مرد	کل مردوں کی آبادی میں خواندہ مرد ٪	کل خواندہ عورتوں کی تعداد	کل عورتوں کی آبادی میں خواندہ عورتیں ٪	مردوں کے مقابلے میں خواندہ عورتوں کی تعداد
سنہ ۱۹۰۱ء	۲۶۹۰۰۸۰	۹،۸۳	۹۹۶۳۴۱	۰،۶۹	۶۸
سنہ ۱۹۱۱ء	۱۲۹۳۸۸۱۵	۱۰،۵۶	۱۲۰۰۷۶۳	۱،۰۵	۹۴
سنہ ۱۹۲۱ء	۹۸۴۱۴۲۸	۱۲،۲۱	۲۷۸۲۲۱۳	۱،۸۱	۱۰۴۰
سنہ ۱۹۳۱ء	۳۹۶۹۷۵۱	۱۵،۵۹	۴۱۹۶۱۰۵	۲،۹۳	۱۳۲
سنہ ۱۹۵۱ء	۴۵۶۱۰۴۳۱	۲۴،۹۵	۱۳۲۶۵۰۶۸۲	۷،۹۳	۲۹۹
سنہ ۱۹۶۱ء	۷۷۹۳۹۸۴۴	۳۴،۴۴	۲۷۵۷۸۹۲۸	۱۲،۹۵	۳۵۴
سنہ ۱۹۷۱ء *	۱۱۱۹۱۱۰۰۰	۳۹،۵۱	۴۱۶۹۱۰۵	۱۸،۴۴	۴۲۵

* آبادی کے عارضی تخمینے ۔ سنہ ۱۹۷۱ء کی مردم شماری ضمیمہ کا پہلا پیپر ۔ سنہ ۱۹۶۱ء کی ہندوستان کی مردم شماری ۔ جلد اوّل ۔ حصہ دوم الف ۔ عام آبادی کے جدول صفحہ ۱۸۱ ۔ ہندوستان کی سماجی تبدیلی کے بارے میں کچھ اشاریے (Indices) مردم شماری کی اشاعت کا صفحہ ۲۲

جدول ۱۹

جنس کے لحاظ سے ناخواندہ لوگوں کی تعداد

سنہ ۱۹۵۱-۷۱ء

مردم شماری کا سال	مرد	عورتیں
سنہ ۱۹۵۰-۵۱ء	۱۳۹۹۱۸۰۳۱	۱۶۱۹۰۸۹۴۵
سنہ ۱۹۶۰-۶۱ء	۱۴۸۳۰۶۰۳۶۸	۱۰۸۵۲۱۱۸۸۹
سنہ ۱۹۷۰-۷۱ء	۱۷۲۰۲۵۶۱۴	۲۱۵۳۱۴۰۰۴

جدول [illegible]

اضلاع کی سطح پر تعلیمی عدم توازن ۔ کل آبادی میں خواندہ لوگوں کی فی صد

	افراد	عورتیں
۱۔ آندھرا پردیش	۲۴ ، ۵۶	۱۵ ، ۶۵
حیدرآباد	۳۹ ، ۹۱	۲۹ ، ۵۷
عادل آباد	۱۴ ، ۱۴	۶ ، ۴۸
۲۔ اتر پردیش	۲۱۰ ، ۶۴	۱۰ ، ۱۸
دہرادون	۴۵ ، ۰۶	۳۴ ، ۸۵
بستی	۱۵ ، ۵۷	۴ ، ۸۵
۳۔ مدھیہ پردیش	۲۲ ، ۱۲	۱۰ ، ۸۴
اندور	۴۴ ، ۳۵	۳۱ ، ۴۲
بستر *	۹ ، ۶۴	۴ ، ۰۹
دیہی	مرد ۱۳ ، ۳۱	۲ ، ۹۲
شہری	۵۹،۵۵ ۸ ، ۱۱	۳۶ ، ۹۸
۴۔ اڑیسہ	۲۶ ، ۱۲	۱۳ ، ۷۵
کٹک	۳۶ ، ۳۷	۲۲ ، ۴۹

باقی اگلے صفحہ پر

کاراپٹ*	۱۰٫۵۷	۴٫۷۱
۵۔ راجستھان	۱۸٫۷۹	۸٫۳۶
اجمیر	۳۰٫۱۹	۱۸٫۱۸
باڑمیر	۱۰٫۰۲	۲٫۷۰
۷۔ بہار	۱۹٫۷۹	۱٫۴۹
پٹنہ	۲۹٫۷۷	۱۵٫۰۴
چمپارن	۱۳٫۰۷	۵٫۴۴

* غالب آبادی درج فہرست قبائل کی۔

جدول ۲۱

ہندوستان میں تعلیمی سطحوں کے لحاظ سے درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں کے ۱۰۰۰ افراد اور عورتوں کی تقسیم سنہ ۱۹۶۱ء

تعلیمی سطح	درج فہرست ذاتیں				درج فہرست قبیلے			
	مرد		عورتیں		مرد		عورتیں	
	دیہاتی	شہری	دیہاتی	شہری	دیہاتی	شہری	دیہاتی	شہری
کل تعداد	۱۰۰۰	۱۰۰۰	۱۰۰۰	۱۰۰۰	۱۰۰۰	۱۰۰۰	۱۰۰۰	۱۰۰۰
ناخواندہ	۸۴۹	۷۷۸	۹۷۵	۹۰۰	۸۶۶	۶۹۶	۹۷۱	۸۶۵
کل ناخواندہ	۱۵۱	۲۲۲	۲۵	۱۰۰	۱۳۴	۳۰۴	۲۹	۱۳۵
خواندہ جن کی کوئی تعلیمی سطح نہیں	۱۱۳	۲۰۶	۲۰	۶۷	۹۹	۱۹۶	۲۳	۷۸
پرائمری یا جونیئر بیسک	۳۵	۹۸	۵	۳۱	۳۴	۱۱۷	۶	۴۹
میٹرک پاس یا اس سے زیادہ تعلیم یافتہ	۳	۱۸	صفر	۲	۱	۲۱	صفر	۸

ماخذ: ایضاً صفحہ ۲۹۸ تا ۲۹۹۔

جدول ۱۲ (الف)

مختلف اسٹیجوں پر ملازم اُستانیوں کی تعداد

(الف) اُن اُستانیوں کی تعداد جو مختلف اسکولوں میں ملازم ہیں

سال	پرائمری اسکول	تربیت یافتہ استانیوں کا فیصد	مڈل اسکول	تربیت یافتہ استانیوں کا فیصد	ثانوی اسکول	تربیت یافتہ استانیوں کا فی صد
۱۹۵۰ء	۸۲۸۱ (۱۸)	۴۹٫۱	۱۲۸۸۷ (۱۸)	۵۸٫۱	۱۹۹۸۲ (۱۹)	۶۶٫۳
۱۹۵۵-۵۶ء	۱۱۷۰۶۷ (۲۰)	۷۳٫۷	۲۳۸۴۴ (۱۹)	۶۳٫۲	۳۵۰۸۵ (۲۳)	۷۲٫۹
۱۹۶۰-۶۱ء	۱۲۶۷۸۸ (۲۱)	۷۳٫۴	۸۳۵۳۲ (۲۲)	۷۳٫۴	۶۲۳۴۷ (۲۲)	۷۳٫۹
۱۹۶۵-۶۶ء	۱۸۰۳۱۵ (۲۴)	۷۳٫۱	۱۳۸۵۳۹ (۳۶)	۷۹٫۰	۱۱۰۷۰۳ (۳۰)	۷۶٫۳
۱۹۶۸-۶۹ء	۲۰۹۵۰۴ (۲۶)	۷۶٫۹	۱۵۳۰۳۴ (۳۶)	۸۲٫۴	۱۲۰۹۷۸ (۳۰)	۸۰٫۳
۱۹۷۳-۷۴ء	۲۵۰۰۰۰ (۲۹)	۷۷٫۰	۱۹۹۰۰۰ (۳۷)	۸۳٫۰	۱۵۰۰۰۰ (۳۰)	۸۱٫۰

ماخذ: "وزارتِ تعلیم" فارم الف ۱۹۷۳-۷۴ء کے علاوہ جن کا تخمینہ لگایا گیا ہے۔ جو اعداد بریکٹ میں ہیں وہ پڑھانے والے مجموعی عملہ کا فیصد ہیں۔

جدول ۲۲ (ب)

مختلف اسٹیجوں پر ملازم استانیوں کی تعداد (گزشتہ سے پیوستہ)

کالج اور یونیورسٹیوں میں استانیوں کی تعداد

شعبہ	۱۹۵۰-۵۱ء	۱۹۶۰-۶۱ء	۱۹۷۰-۷۱ء
آرٹس	۱۰۹۱	۵۶۲۴	۱۰۱۳۶
	(۱۱.۶۴)	(۱۳۱۹)	(۱۹.۲۷)
سائنس	۳۷۰۹	تعداد آرٹس میں	۵۳۸۱
	(۶.۶۳)	شامل	(۱۳.۰۹)
کامرس	۴	۵۷	۲۲۷
	(۰.۰۴)	(۲.۱۱)	(۳.۲۲)
تعلیم	۱۳۰	۴۴۸	۹۲۴
	(۲۴.۱۳)	(۲۲.۸)	(۲۳.۱۹)
انجینئرنگ اور ٹیکنالوجی	۱	۱۲	۹۲
	(ناقابل لحاظ)	(۰.۰۳)	(۱.۳۴)

(بقیہ جدول ۲۲ (ب))

طب (ڈاکٹر)	۱۶۳ (۹٫۸)	۶۳۱ (۱۳٫۸)	۲۲۳۶ (۱۹٫۸)
زراعت	۱ (۰٫۰۶)	۲۲ (۱٫۴)	۴۹ (۱٫۵)
ورتیٹری سائنس (veterinary)	۱۲ (۰٫۸)	۱۱ (۱٫۷)	۱۸ (۱٫۴)
قانون	صفر	۹ (۱٫۳)	۱۶۳ (۱۰٫۸)
دوسرے شعبے	۲۲ (۱۲٫۱)	۱۰ (۲٫۲)	۱۵۲ (۱۵٫۷)
کل شعبے	۱۸۱۵ (۸٫۵)	۴۶۲۳ (۱۲٫۵)	۱۹۳۹۰ (۱۵٫۰)

ماخذ: وزارت تعلیم اور سماجی فلاح و بہبود، برائے ۱۹۵۰-۱۹۵۱ء اور ۱۹۶۰-۱۹۶۱ء اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن، برائے ۱۹۷۰-۱۹۷۱ء۔ جو اعداد بریکٹ میں ہیں وہ پڑھانے والے کل عملہ کا فیصدی ظاہر کرتے ہیں

جدول ۳۳

وسیع صنعتی زمروں کے لحاظ سے کام کرنے والی عورتوں کی تقسیم سنہ ۱۹۱۱ء تا ۱۹۷۱ء (ہزار کے عدد میں)

سال	عورتوں کی کل آبادی	کل کام کرنے والی عورتیں	زمرہ نمبر ۱ کاشتکاری کرنے والی عورتیں	زمرہ نمبر ۲ زرعی مزدوری کرنے والی عورتیں	زمرہ نمبر ۳ کانوں میں کام کرنے والی، کان سے پتھر نکالنے والی، مویشی پالنے والی، جنگلات میں کام کرنے والی، ماہی گیری شکار اور باغات میں کام کرنے والی	زمرہ نمبر ۴ گھریلو صنعتوں میں کام کرنے والی عورتیں
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷
سنہ ۱۹۱۱ء	۱۲۳۸۹۸	۳۱۸۰۲	۱۸۰۹۰	۱۲۸۰۸	۱۴۵۲	
سنہ ۱۹۲۱ء	۱۲۲۷۴۹	۲۰۰۸۶	۲۰۲۴۶	۱۰۰۰۳	۱۲۳۱	
سنہ ۱۹۳۱ء	۱۳۶۰۷۵	۳۷۹۰۰	۱۳۱۸۰	۱۳۹۹۷	۱۵۷۵	
سنہ ۱۹۵۱ء	۱۷۳۵۳۹	۴۰۵۳۹	۱۸۳۴۶	۱۳۶۹۴	۱۳۵۷	
سنہ ۱۹۶۱ء	۲۱۳۳۶۷	۵۹۴۰۲	۳۳۱۰۳	۱۴۱۷۱	۱۱۸۷	۳۶۶۵
سنہ ۱۹۷۱ء	۲۶۳۹۰۰	۲۱۳۹۸	۹۳۶۶	۱۵۷۹۳	۹۰۷	۱۲۳۱

(جدول ۲۳ گذشتہ سے پیوستہ)

زمرہ نمبر ۸ گھریلو صنعتوں کے علاوہ دیگر چیزیں بنانا	زمرہ نمبر ۶ تعمیرات	زمرہ نمبر ۷ تجارت اور کاروبار	زمرہ نمبر ۸ ذرائع نقل و حمل، ذخیرہ سازی اور رسل و رسائل	زمرہ نمبر ۹ دوسری خدمات	زمرہ نمبر ا اور نمبر ۲ کا میزان (زراعتی شعبہ)	زمرہ نمبر ۳ سے زمرہ نمبر ۹ تک کا میزان (صنعتی شعبہ)
۸	۹	۱۰	۱۱	۱۲	۱۳	۱۴
۴۳۹۱	۲۹۴	۲۲۶۲	۷۹	۲۴۲۲	۳۰۸۹۸ (۷۳٫۹)	۱۰۹۰۴ (۲۶٫۱)
۳۶۸۹	۲۸۹	۲۱۸۹	۶۷۰	۲۱۵۱	۳۰۲۷۹ (۷۵٫۵)	۹۸۱۶ (۲۴٫۵)
۳۲۸۱	۲۹۱	۱۹۱۴	۴۹۰	۲۳۱۳	۲۷۱۷۷ (۷۲٫۳)	۱۰۴۲۲ (۲۷٫۷)
۲۹۰۶	۲۹۱	۱۱۵۳	۱۲۳۰	۳۶۴۷	۳۱۰۶۲ (۷۶٫۸)	۹۳۷۷ (۲۳٫۲)
۷۸۹	۲۴۳	۸۱۵	۶۵۰	۴۳۶۴	۴۷۲۷۴ (۷۹٫۶)	۱۲۱۲۸ (۲۰٫۴)
۸۶۵	۲۰۴	۶۵۶	۱۴۶	۲۲۲۹	۲۵۰۹۰ (۸۰٫۱)	۶۲۳۸ (۱۹٫۹)

نوٹ: جموں اور کشمیر کے اعداد اس میں شامل نہیں۔

(ع): عارضی۔ ایک فیصد نمونے کی معلومات پر مبنی ہے۔

ماخذ (۱) ۱۹۶۱ء کی ہندوستان کی مردم شماری۔ ۱۹۶۲ء کا پیپر نمبر ۱ "فائنل پاپولیشن ٹوٹلس"

(۲) پاکٹ بک آف پاپولیشن۔ شماریات۔ مردم شماری صدی ۱۹۶۲ء۔

جدول ۲۴

مخصوص عمر کے کام کرنے والوں کی جماعت میں شرکت کی شرح

سنہ ۱۹۷۱ء اور سنہ ۱۹۶۱ء

(الف) سنہ ۱۹۶۱ء

عمر گروپ	مرد			عورتیں		
	کل تعداد	دیہی	شہری	کل	دیہی	شہری
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷
کل تعداد	۵۷٫۱۱	۵۸٫۲	۵۲٫۴	۲۸٫۰	۳۱٫۳	۱۱٫۱
صفر تا ۱۴ سال	۹٫۴	۱۰٫۶	۰۳٫۵	۴٫۶	۷٫۶	۱٫۶
۱۵ تا ۳۴ سال	۸۸٫۱۱	۹۱٫۶۱	۷۶٫۹	۴۳٫۶	۴۹٫۸	۱۵٫۸
۳۵ تا ۵۹ سال	۹۲٫۷	۹۷٫۵	۹۳٫۳	۴۷٫۶	۴۹٫۶	۲۲٫۹
۶۰ سال اور اس سے زیادہ	۷۲٫۶	۷۹٫۹	۵۸٫۴	۲۲٫۴	۲۳٫۳	۱۱٫۴

(ب) سنہ ۱۹۷۱ء

عمر گروپ	مرد			عورتیں		
	کل تعداد	دیہی	شہری	کل تعداد	دیہی	شہری
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷
کل تعداد	۵۲٫۵	۵۳٫۴	۴۸٫۷	۱۱٫۸	۱۳٫۱	۶٫۶
صفر تا ۱۴ سال	۶٫۶	۷٫۵	۲٫۸	۲٫۶	۳٫۰	۰٫۸
۱۵ تا ۳۹ سال	۸۲٫۹	۸۶٫۱	۷۴٫۸	۱۸٫۹	۲۱٫۳	۱۰٫۱
۴۰ تا ۵۹ سال	۹۵٫۸	۹۶٫۷	۹۲٫۵	۲۱٫۲	۲۲٫۸	۱۳٫۸
۶۰ سال اور اس سے زیادہ	۷۳٫۸	۷۷٫۴	۶۵٫۴	۱۰٫۵	۱۱٫۳	۶٫۴

ماخذ: سنہ ۱۹۷۱ء کی ہندوستان کی مردم شماری، ۲ سنہ ۱۹۷۲ء کا پیپر

جدول ۲۵

ہندستان کے دیہی اور شہری علاقوں میں کل مزدور جماعت کے اندر اجرت کے بغیر خاندان کا کام کرنے والوں کی فیصد تعداد جنس اور عمر کے لحاظ سے

عمر	ہندوستان کے دیہاتوں میں		ہندوستان کے شہروں میں	
	مرد	عورتیں	مرد	عورتیں
۱	۲	۳	۴	۵
۱۰ تا ۱۴ سال	۴۷٫۵	۵۵٫۵	۳۴٫۵	۵۲٫۵
۱۵ تا ۱۹ سال	۳۶٫۰	۴۹٫۷	۲۲٫۰	۴۱٫۵
۲۰ تا ۲۴ سال	۲۶٫۰	۴۵٫۵	۱۳٫۵	۳۱٫۷
۲۵ تا ۲۹ سال	۱۷٫۰	۴۲٫۵	۸٫۴	۲۶٫۱
۳۰ تا ۳۴ سال	۱۰٫۷	۴۰٫۳	۴٫۳	۲۲٫۱
۳۵ تا ۳۹ سال	۶٫۳	۳۸٫۶	۲٫۵	۱۸٫۸
۴۰ تا ۴۴ سال	۳٫۷	۳۷٫۰	۱٫۶	۱۶٫۴
۴۵ تا ۴۹ سال	۲٫۵	۳۵٫۶	۱٫۱	۱۵٫۴
۵۰ تا ۵۴ سال	۲٫۲	۳۴٫۵	۱٫۲	۱۵٫۰
۵۵ تا ۵۹ سال	۲٫۴	۳۳٫۶	۱٫۵	۱۵٫۱
۶۰ تا ۶۴ سال	۲٫۷	۳۳٫۰	۲٫۱	۱۵٫۳
۶۵ تا ۶۹ سال	۳٫۳	۳۲٫۶	۳٫۵	۱۵٫۵
۷۰ تا ۷۴ سال	۴٫۲	۳۲٫۴	۵٫۵	۱۶٫۰
۷۵ اور اس سے زیادہ	۵٫۶	۳۲٫۲	۸٫۸	۱۸٫۰

ماخذ: یو۔ این۔ او کے ماہرین کی کمیٹی کی رپورٹ۔

جدول ۲۶

کام نہ کرنے والی عورتوں کی درجہ بندی ان کے خاص مشغلہ کے لحاظ سے ۱۹۷۱ء (ہزار کے اعداد میں)

خاص مشغلہ	عورتوں کی تعداد	کل تعداد کا فیصد
کل وقتی طالبات	۲۰۶۶۴	۸٫۹
خانگی فرائض	۱۱۸۴۰۴	۵۱٫۰
دوسروں کی دست نگر اور شیر خوار بچیاں	۹۱۷۲۲	۳۹٫۵
وہ عورتیں جو اب ریٹائرڈ ہیں، جن کے گھر کرایے پر اٹھے ہوئے ہیں۔ اور خود مختارانہ ذرائع آمدنی کی مالک۔	۳۷۷	۰٫۲
جو فقیر ہیں۔ آوارہ گرد ہیں وغیرہ	۲۷۵	۰٫۱
تعزیری، دماغی اور خیراتی اداروں میں	۳۷۰	ن
دیگر	۵۳۶	۰٫۲
میزان	۲۳۲۰۷۵	۱۰۰٫۰

ن: ناقابل لحاظ

جدول ۲۷

بے روزگار افراد کی تخمینی تعداد ۱۹۷۱ء

علاقہ	جنس	بے روزگاروں کا فیصد	۱۹۷۱ء میں کل آبادی (لاکھ کے اعداد میں)	بے روزگار لوگوں کی تعداد (لاکھ کے اعداد میں)
۱	۲	۳	۴	۵
دیہی	مرد	۱٫۴۲	۲۲۵۲	۳۲
	عورتیں	۲٫۱۰	۲۱۳۶	۴۵
	میزان	—	۴۳۸۸	۷۷
شہری	مرد	۱٫۳۵	۵۸۷	۸
	عورتیں	۰٫۹۸	۵۰۴	۵
	میزان	—	۱۰۹۱	۱۳
کل ہند	مرد	—	۲۸۳۹	۴۰
	عورتیں	—	۲۶۴۰	۵۰
	میزان	—	۵۴۷۹	۹۰

جدول ۲۳ ۔

(پبلک اور پرائیوٹ) منظم سیکٹر میں خواتین کی تقسیم
(لاکھ کے اعداد میں)

سال	کل تعداد	پبلک	پرائیوٹ
۱۹۶۲ء	۱۳٫۷	۴٫۸ (۳۵ فیصد)	۸٫۹ (۶۵ فیصد)
۱۹۶۳ء	۱۴٫۹	۵٫۵ (۳۷ فیصد)	۹٫۴ (۶۳ فیصد)
۱۹۶۴ء	۱۵٫۲	۵٫۸ (۳۸٫۲ فیصد)	۹٫۴ (۶۱٫۸ فیصد)
۱۹۶۵ء	۱۶٫۸	۶٫۴ (۳۸٫۱ فیصد)	۱۰٫۴ (۶۱٫۹ فیصد)
۱۹۶۶ء	۱۷٫۴	۷٫۲۰ (۴۱٫۴ فیصد)	۱۰٫۲ (۵۸٫۶ فیصد)
۱۹۶۷ء	۱۸٫۲	۷٫۲ (۳۹٫۶ فیصد)	۱۱٫۰ (۶۰٫۴ فیصد)
۱۹۶۸ء	۱۸٫۳	۷٫۵ (۴۰٫۷ فیصد)	۱۰٫۸ (۵۹٫۳ فیصد)
۱۹۶۹ء	۱۸٫۴	۷٫۷ (۴۱٫۸ فیصد)	۱۰٫۷ (۵۸٫۲ فیصد)
۱۹۷۰ء	۱۸٫۹	۸٫۱ (۴۲٫۸ فیصد)	۱۰٫۸ (۵۷٫۲ فیصد)
۱۹۷۱ء	۱۹٫۳	۸٫۶ (۴۴٫۶ فیصد)	۱۰٫۷ (۵۵٫۴ فیصد)
۱۹۷۲ء	۲۰٫۳	۹٫۲ (۴۵٫۳ فیصد)	۱۱٫۱ (۵۴٫۷ فیصد)
۱۹۷۳ء	۲۱٫۴	۱۰٫۱ (۴۷٫۲ فیصد)	۱۱٫۳ (۵۲٫۸ فیصد)

ماخذ :۔ ڈی ۔ جی ۔ ای اینڈ ٹی ۔

نوٹ : جو اعداد بریکٹ میں ہیں، ان سے کل ملازمین کا فیصد معلوم ہوتا ہے ۔

جدول ۲۹ء

فیکٹریوں میں عورتوں کا روزگار

سال	کل ملازمین (ہزار کے اعداد میں)	ملازم خواتین کی تعداد (ہزار کے اعداد میں)	کل ملازمتوں میں ملازم خواتین کا فیصد
۱۹۵۱ء	۲۵۳۶۵٫۰	۲۹۰٫۰	۱۱٫۴۳
۱۹۵۵ء	۲۶۹۰٫۴	۲۹۵٫۰	۱۱٫۹۶
۱۹۵۸ء	۳۱۰۲٫۲	۳۴۳٫۹	۱۱٫۰۸
۱۹۶۰ء	۳۳۶۷٫۸۰	۳۶۷٫۳	۱۰٫۹۱
۱۹۶۱ء	۳۴۹۷٫۰	۳۷۲٫۳	۱۰٫۶۵
۱۹۶۲ء	۳۶۴۸٫۶	۳۹۴٫۱	۱۰٫۸۰
۱۹۶۳ء	۳۸۶۰٫۰	۴۰۰٫۴	۱۰٫۳۷
۱۹۶۴ء	۴۰۲۴٫۰	۴۰۹٫۱	۱۰٫۱۶
۱۹۶۵ء	۴۱۱۸٫۰	۳۹۴٫۵	۹٫۵۷
۱۹۶۶ء	۴۰۶۹٫۰	۳۶۴٫۷	۹٫۹۶
۱۹۶۷ء	۴۰۷۱٫۰	۳۹۴٫۶	۹٫۵
۱۹۶۸ء	۴۰۶۷٫۰	۳۴۶٫۱	۹٫۰
۱۹۶۹ء	۴۱۳۷٫۰	۳۸۲٫۰	۹٫۰
۱۹۷۰ء	۴۲۶۴٫۰	۳۹۴٫۰	۹٫۰
۱۹۷۱ء	۴۲۸۵٫۰	۳۹۲٫۵	۹٫۱

ماخذ: "انڈین لیبر اعداد وشمار" (Statistics) اور "لیبر کمیشن" کی رپورٹ۔

جدول ۳۰

کانوں میں عورتوں کا روزگار (ہزار کے اعداد میں)

کانیں		۱۹۵۱ء	۱۹۵۶ء	۱۹۶۱ء	۱۹۶۶ء	۱۹۶۸ء	۱۹۶۹ء	۱۹۷۰ء	۱۹۷۱ء
کوئلہ	ک	۳۵۲۶۰	۳۵۲٫۴	۴۱۱٫۳	۴۲۵٫۵	۳۹۵٫۴	۳۹۶٫۴	۳۹۱٫۵	۳۸۲٫۲
	ع	۵۵٫۴	۴۶٫۰	۳۸٫۱	۳۱٫۷	۲۳٫۷	۲۳٫۰	۲۱٫۵	۲۰٫۱
		(۱۵٫۷)	(۱۳٫۰)	(۱۰٫۰)	(۷٫۲)	(۶٫۲)	(۵٫۸)	(۵٫۵)	(۵٫۲)
لوہا	ک	۲۰٫۲	۳۷٫۳	۵۴٫۵	۶۰٫۳	۵۴٫۲	۴۸٫۴	۵۱٫۸	۵۴٫۸
	ع	۷٫۷	۱۰٫۷	۱۵٫۳	۱۵٫۷	۱۳٫۰	۱۱٫۲	۱۲٫۲	۱۳٫۹
		(۳۸٫۲)	(۲۸٫۸)	(۲۸٫۸)	(۲۵٫۹)	(۲۴٫۹)	(۲۳٫۲)	(۲۳٫۹)	(۲۴٫۴)
ابرق	ک	۵۲٫۲	۳۴٫۰	۲۹٫۲	۱۹٫۸	۱۶٫۹	۱۶٫۰	۱۳٫۹	۱۲٫۱
	ع	۷٫۲	۲٫۷	۲٫۴	۱٫۲	۱٫۷	۱٫۵	۱٫۳	۱٫۱
		(۱۳٫۸)	(۷٫۸)	(۸٫۱)	(۶٫۱)	(۱۰٫۱)	(۹٫۴)	(۹٫۳)	(۹٫۱)
مگنیز	ک	۵۵٫۵	۱۱۰٫۰	۴۶٫۹	۴۷٫۰	۳۷٫۲	۳۱٫۰	۲۹٫۳	۳۰٫۴
	ع	۲۴٫۴	۴۴٫۳	۱۷٫۷	۱۹٫۱	۱۵٫۰	۱۲٫۳	۱۱٫۶	۱۲٫۲
		(۴۳٫۹)	(۴۰٫۳)	(۳۷٫۷)	(۴۰٫۶)	(۴۰٫۳)	(۳۹٫۶)	(۳۹٫۶)	(۴۰٫۱)

(جدول ۳ کا بقیہ)

دیگر	ک	۶۹٫۱۱	۹۳٫۹	۱۲۸٫۷	۱۲۶٫۷	۱۳۲٫۶	۱۲۶٫۵	۱۵۱٫۷	۱۵۳٫۰
	ع	۱۵٫۱	۲۲٫۰	۳۲٫۸	۳۳٫۹	۲۹٫۴	۲۹٫۹	۳۰٫۴	۲۸٫۹
		(۲۱٫۸)	(۲۲٫۱)	(۲۵٫۵)	(۲۲٫۹)	(۲۰٫۹)	(۲۰٫۳)	(۲۰٫۰)	(۱۸٫۸)
میزان	ک	۵۴۹٫۰	۶۲۸٫۶	۶۵۱٫۰	۶۹۹٫۳	۶۴۴٫۳	۶۳۸٫۵	۶۲۸٫۲	۶۳۰٫۷
	ع	۱۰۹٫۶	۱۲۵٫۸	۱۰۲٫۳	۱۰۰٫۷	۸۳٫۳	۷۸٫۰	۷۷٫۳	۷۵٫۲
		(۲۰٫۱)	(۲۰٫۰)	(۱۵٫۸)	(۱۴٫۴)	(۱۳٫۱)	(۱۲٫۲)	(۱۲٫۱)	(۱۱٫۹)

ک کل کام کرنے والے افراد کی یومیہ تعداد کا اوسط۔ (قوسین میں عورتوں کی یومیہ فیصد تعداد درج ہے)

ع کام کرنے والی عورتوں کی یومیہ تعداد کا اوسط۔

ماخذ: انڈین لیبر اسٹے ٹسٹکس

جدول ۳۱

باغات میں مجموعی مزدور جماعت میں عورتوں کی فیصد تعداد

	چائے	کافی	ربڑ
۱۹۶۱ء	۴۴	۴۵٫۳	۳۱٫۴
۱۹۷۰ء	۴۷٫۰	۴۴٫۰	۳۵٫۰

جدول ۲۲

شہروں میں کام کرنے والی عورتوں کی تعلیمی حیثیت
۱۹۶۱ء اور ۱۹۷۱ء

تعلیمی سطح	۱۹۶۱ء کل کام کرنے والوں کی تعداد				۱۹۷۱ء کل کام کرنے والوں کی تعداد			
	مرد	عورتیں	مرد	عورتیں	مرد	عورتیں	مرد	عورتیں
کل تعداد	۲۲۴۱۹۸۹۲	۴۰۱۰۰۴۲			۲۸۵۵۴۳۰۰	۳۲۸۵۷۰۰		
ناخواندہ	۷۸۹۵	۳۲۵۳۲۳۳۷	۳۵٫۲	۸۱٫۸۱	۹۱۲۹۰۰	۲۱۶۵۴۰۰	۳۱٫۹	۶۵٫۸
خواندہ بغیر کسی تعلیمی سطح کے	۷۶۹۲۸۹۱	۳۲۱۴۶۰	۳۰٫۲	۸٫۰	۳۲۹۵۱۰۰	۱۶۵۳۰۰	۱۱٫۵	۵٫۰
پرائمری یا جونیئر بیسک	۴۴۴۹۷۱۴	۲۰۹۱۶۷	۱۹٫۸	۵٫۲	۵۲۶۰۰۰۰	۲۰۸۱۰۰	۱۸٫۴	۶٫۲
میٹرک یا ہائر سکنڈری	۲۳۳۰۹۹۲	۱۴۳۱۱۳	۱۰٫۴	۳٫۵	۴۳۶۸۳۰۰	۱۴۹۵۰۰	۱۵٫۱	۴٫۴
ٹیکنیکل ڈپلوما جو ڈگری کے برابر نہیں ہے	۶۷۱۱۶	۶۹۱۴	۰٫۳	۰٫۱	۴۷۵۹۰۰۰	۳۷۱۲۰۰	۱۶٫۶	۱٫۳
غیر ٹیکنیکل ڈپلوما جو ڈگری کے برابر نہیں ہے	۱۱۰۳۸۵	۱۱۹۵۷	۰٫۴	۰٫۲	۴۲۰۰۰	۵۸۰۰	۰٫۱	۰٫۱
گریجویٹ یا پوسٹ گریجویٹ	۵۹۹۷۰۷	۳۶۳۷۰	۲٫۶	۰٫۸	۱۳۲۶۰۰	۲۷۲۰۰	۰٫۴	۰٫۸
ٹیکنیکل ڈپلوما یا ڈگری جو ڈگری یا پوسٹ گریجویٹ ڈگری کے برابر ہو۔	۱۷۳۷۰۳	۲۷۸۲۴	۰٫۷	۰٫۶	۹۸۳۳۰	۸۷۳۰۰	۳٫۴	۲٫۳

(باقی اگلے صفحہ پر)

جدول ۲۷ (گزشتہ سے پیوستہ)

	۱۹۶۱ء کل کام کرنے والوں کی تعداد				۱۹۶۱ء کل کام کرنے والوں کی تعداد			
کل تعداد	مرد	عورتیں	مرد	عورتیں	مرد	عورتیں	مرد	عورتیں
انجینرنگ	۴۲۸۳۱	۱۱۶	۰٫۰۱	صفر	۳۰۵۸۰۰	۴۹۸۰۰	۱٫۱۰	۱٫۱۴
ڈاکٹری	۳۶۸۴۹	۵۷۱۳	۰٫۰۱	۰٫۰۱	۲۷۸۷۰۰	۵۶۱۰۰	۰٫۱۹	۱٫۱۳
زراعت	۴۹۹۲	۲۸	صفر	صفر	۱۳۲۶۰۰	۱۴۰۰	۰٫۱۴	صفر
مویشی پالن اور ڈیری فارم	۲۱۷۰	۱۰	صفر	صفر	۶۷۹۰۰	۱۵۱۰۰	۰٫۵۲	۰٫۱۳
ٹکنالوجی	۲۷۴۴	۳۰	صفر	صفر	۱۱۹۰۰	۲۰۰	صفر	صفر
معلمی	۴۰۲۴۸۷	۱۱۴۴۷۰	۰٫۰۱	۰٫۱۴	۵۷۰۰۰	۳۸۱۰۰	۰٫۱۱	۱٫۱۱
دیگر	۴۱۶۱۰	۲۴۵۷	۰٫۰۱	صفر	۹۳۰۰۰	۱۳۰۰	صفر	صفر
			۱۰۰٫۰۰	۱۰۰٫۰۰			۱۰۰٫۰۰	۱۰۰٫۰۰

جدول ۲۴

کام کرنے والوں کی تعلیمی حیثیت دیہی علاقوں میں

تعلیمی سطح	سنہ ۱۹۶۱ء مرد	عورتیں	کل کام کرنے والے مردوں اور عورتوں کی تعداد کا فیصد		سنہ ۱۹۷۱ء مرد	عورتیں	کل کام کرنے والے مردوں اور عورتوں کی تعداد کا فیصد	
۱۔ کل تعداد	۱۰۶۷۵۰۸۶۴	۵۵۴۹۴۶۹۳			۱۱۹۶۹۱۴۰۰	۲۷۷۱۲۶۰۰		
۲۔ ناخواندہ	۷۳۲۴۴۰۲۲	۵۳۰۷۸۰۵۹	۶۹٫۵	۹۵٫۹	۷۷۸۸۷۱۰۰	۲۵۵۲۷۴۰۰	۶۵٫۱	۹۲٫۱
۳۔ خواندہ (بغیر تعلیمی سطح کے)	۲۳۴۰۳۶۷۳	۱۷۷۴۳۳۰	۲۱٫۰	۳٫۲	۱۴۸۵۷۱۰۰	۸۹۳۳۰۰	۲٫۴	۴٫۳
۴۔ پرائمری	۸۵۱۲۷۲۳	۵۷۸۵۱۵	۸٫۱	۱٫۲	۱۵۳۸۲۰۰۰	۸۴۲۰۰۰	۱۲٫۹	۳٫۰
۵۔ مڈل*	۰	۰	—	—	۷۲۸۶۹۰۰	۲۴۱۳۰۰	۶٫۱	۰٫۸
۶۔ میٹرک یا اس سے زیادہ تعلیم یافتہ**	۱۵۹۰۱۸۵	۶۵۶۸۹	۱٫۴	۰٫۱	۴۳۷۸۳۰۰	۲۰۰۸۶۰۰	۳٫۷	۰٫۷
۷۔ میٹرک یا ہائر سکنڈری	-	-			۳۶۴۵۴۰۰	۱۳۸۱۰۰	۳٫۱	۰٫۴
۸۔ غیر ٹیکنکی ڈپلوما یا سرٹیفکٹ جو ڈگری کے برابر نہ ہو۔	۰	۰			۵۵۳۱۰	۷۴۰۰	صفر	صفر

(باقی اگلے صفحہ پر)

* "مڈل" کا زمرہ جو جداگانہ درج کیا گیا ہے وہ صرف ۱۹۷۱ء سے متعلق ہے۔ لیکن ۱۹۶۱ء میں اس کو پرائمری کے زمرے میں ملا دیا گیا ہے۔

** ۔ ۱۹۶۱ء میں تعلیمی سطح کی درجہ بندی صرف "میٹرک یا اس سے زیادہ درجوں" تک کی گئی ہے۔ لیکن ۱۹۷۱ء میں گریجویٹ اور اس سے زیادہ درجوں تک اور جدول میں موجود ہے ۱۹۶۱ء کے کالم میں میٹرک یا اس سے زیادہ تعلیم یافتہ لوگوں کے سامنے جو اعداد دیے گئے ہیں وہ صرف مقابلے کی آسانی کے لیے ہیں۔ یہ اعداد نمبر ۶ سے ۱۰ تک کے کل تعلیمی زمروں کو ظاہر کرتے ہیں۔

(جدول ۳۳ گزشتہ سے پیوستہ)

تعلیمی سطح	۱۹۶۱ء مرد	۱۹۶۱ء عورتیں	۱۹۶۱ء کل کام کرنے والے مردوں اور عورتوں کا فیصد	۱۹۷۱ء مرد	۱۹۷۱ء عورتیں	۱۹۷۱ء کل کام کرنے والے مردوں اور عورتوں کی تعداد کا فیصد	
۹۔ ٹیکنیکل ڈپلوما یا سرٹیفکیٹ جو ڈگری کے برابر نہ ہو	-	-	-	۱۰۹۹۰	۳۶۷۰۰	۰۱۱	صفر
۱۰۔ گریجویٹ یا اس سے زیادہ تعلیم یافتہ۔	-	-	-	۵۶۷۷۰۰	۲۶۴۰۰	صفر	۰۱۲

ماخذ: ۔ ۱۹۶۱ء کے اعداد۔ حصہ دوم (ب) (۱) "جنرل اکنومک ٹیبل"۔
۱۹۷۱ء کے اعداد۔ آبادی کی معاشی خصوصیات ۱۹۷۳ء کا پیپر سوم

جدول ۳۴

تعلیمی سطحوں اور جنس کے لحاظ سے تعلیم یافتہ افراد کی تخمینی مجموعی تعداد۔ (سیکڑے کے اعداد میں)

تعلیمی سطح ۔	مرد	کل مردوں کی آبادی کا فیصد	عورتیں	کل عورتوں کی آبادی کا فیصد
پرائمری	۳۳۴۹۸۹	۱۱٫۹	۱۶۵۱۱۵	۶٫۳
مڈل	۲۰۷۰۸۹	۷٫۳	۷۶۹۳۰	۲٫۹
میٹرک یا ہائر سکنڈری	۱۳۴۷۳۳	۴٫۸	۳۷۳۶۵	۱٫۴
غیر ٹیکنیکی ڈپلوما یا سرٹیفکٹ	۱۳۸۸	۰٫۰۴	۴۵۵	۰٫۰۱
ٹیکنیکی ڈپلوما یا سرٹیفکٹ	۳۰۴۸	۰٫۱	۱۰۲۰	۰٫۰۰۳
گریجویٹ	۲۸۲۱۲	۱٫۰	۶۹۳۱	۰٫۳

ماخذ: ۔ ۱۹۶۱ء کی ہندوستان کی مردم شماری ۔ حصہ دوم خاص ۔ اس کا تخمینہ ایک فیصدی نمونے کی معلومات سے لگایا گیا ۔ صفحہ ۱۲۱ ۔

نوٹ: فیصد شمار کیا گیا ۔

جدول ۲۵

ڈگری یافتہ اور تکنیکی پیشوں میں عورتوں کی تقسیم حیثیت اور تعلیمی سطح کے لحاظ سے ۱۹۷۱ء
(منتخب زمرے)

کام کرنے والوں کی جماعت کے لحاظ سے حیثیت	ڈاکٹریٹ		ایم اے / پوسٹ گریجویٹ		گریجویٹ - یا اس کے برابر		ڈپلوما سرٹیفکٹ		میزان
	تعداد	فیصد	تعداد	فیصد	تعداد	فیصد	تعداد	فیصد	
الف - ۱ ملازم -	۱۳۷۳	۷۰/۸	۴۰۳۰۲	۴۸/۱	۹۹۳۴۴	۳۳/۰	۶۵۰۹۹	۵۵/۰	۱۴۷۲/۸ (۳۹/۱)
۲ - ذاتی روزگار -	۵۱	۲/۶	۱۶۰۰	۲/۰	۶۹۸۲	۱۱/۹	۹۵۰	۷/۹	۸۹۸۳ (۲/۱)
۳ - بے روزگار اور متلاشی روزگار	۲۴۳	۱۲/۵	۱۵۳۷۶	۱۸/۴	۶۲۱۲۶	۲۰/۰	۲۰۹۱	۱۷/۲	۷۹۸۰۴ (۱۹/۵)
ب - ۴ طالبعلم زیر تربیت	۸۴	۰/۴	۳۲۶	۰/۴	۳۴۲۴	۱/۱	۱۵۹	۱/۳	۳۹۱۴ (۱/۰)
۵ - اپرنٹس	۰	۰	۳۳	ناقابل لحاظ	۳۹۴	۰/۲	۶۵	۰/۵	۴۹۲ (۰/۱)
ج - ۶ - بے روزگار لیکن متلاشی روزگار نہیں	۱۳۵	۷/۱	۱۵۱۹۲	۱۸/۲	۷۳۷۲۱	۲۳/۷	۱۱۰۷	۹/۳	۹۰۱۵۳ (۲۲/۱)

۱۹۷۱ء کی ہندوستان کی مردم شماری کے اعداد کی مدد سے یہ خاکہ تیار کیا گیا ہے۔ ڈگری یافتہ اور تکنیکل حلقے (پی) کے جی سیریز جدول (قومی سطح پر)

دفتر آر۔ جی۔ ہندوستان۔

جدول ۳۶

خواتین ووٹروں میں ووٹ ڈالنے والی عورتوں کی فیصد تعداد
لوک سبھا کے انتخابات میں

سال	ووٹ ڈالنے والوں کا فیصد	ووٹ ڈالنے والی عورتوں کا فیصد	ووٹ ڈالنے والے مردوں اور عورتوں کے فیصد کا فرق
۱۹۶۲ء	۵۴٫۷۶	۴۶٫۶۳	۱۵٫۴۲
۱۹۶۷ء	۶۱٫۳۳	۵۵٫۴۸	۱۱٫۲۵
۱۹۷۱ء	۵۵٫۳۵	۴۹٫۱۵	۱۱٫۸۵

جدول ۳۷

انتخاب میں مقابلہ کرنے والی خواتین اور اُن کی سیاسی پارٹیاں لوک سبھا کے انتخابات میں

(ہر ایک سال کے سامنے اعداد کی پہلی قطار انتخاب میں کھڑی ہونے والی خواتین کی تعداد اور دوسری قطار کامیاب خواتین کی تعداد ظاہر کرتی ہے)

انتخاب کا سال	کانگریس	سوتنتر	بھارتیہ جن سنگھ	سی پی آئی	سی پی ایم	پی ایس پی	ایس ایس پی	آزاد اُمیدوار	دوسری پارٹیاں	میزان
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۱۱
۱۹۶۲ء	۳۳	۹	۳	۳	—	۱	۳	۸	۵	۶۵
	۲۸	۴	صفر	۱	—	صفر	صفر	صفر	صفر	۳۳
۱۹۶۷ء	۳۶	۳	۳	۳	۱	۱	۳	۱۰	۷	۶۶
	۲۱	۲	۱	صفر	۱	صفر	صفر	۲	صفر	۲۸
۱۹۷۱ء	۲۱ (۱۴)*	۳	۳	۳	۲	۱	۱	۳۱	۷	۸۶
	۱۵ (صفر)	۱	۲	۱	۱	صفر	صفر	۱	صفر	۲۱

* جو اعداد بریکٹ میں ہیں وہ کانگریس (تنظیم) کے ہیں۔

سی پی آئی : کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا

سی پی ایم : کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا (مارکس پرست)

پی۔ ایس۔ پی : پرجا سوشلسٹ پارٹی

ایس۔ ایس۔ پی : سنیوکت سوشلسٹ پارٹی

جدول ۳۸

مختلف منصوبوں میں سماجی خدمات کے لیے مقررہ رقوم اور اُن پر مصارف

(روپے کروڑ کے اعداد میں)

ترقی کا زمرہ	پہلا منصوبہ		دوسرا منصوبہ		تیسرا منصوبہ		چوتھا منصوبہ		پانچواں منصوبہ	
	مقررہ رقم	مصارف	مقررہ رقم	مصارف	مقررہ رقم	مصارف	مقررہ رقم	مصارف	مقررہ رقم	مصارف
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۱۱
۱۔ تعلیم اور سائنٹفک ریسرچ۔	۱۴۹ (۷٫۶)	—	۲۷۳ (۵٫۸)	—	۶۶۰ (۷٫۷)	—	۹۸/۲۲ (۸٫۵۰)	—	۱۵۲۶ (۳٫۴۶)	
۲۔ صحت۔	۹۸ (۵٫۰)	—	۲۱۶ (۴٫۶)	—	۲۲۶ (۲٫۶)	—	۲۲۶ (۲٫۶)	—	۸۱۳ (۱٫۵۳)	
۳۔ خاندانی منصوبہ بندی	۰٫۶۵	۰٫۱۵	۴٫۹۷	۲٫۱۶	۲۶٫۹۸	۲۴٫۸۵	۳۱۵ (۱٫۹)	—	۵۱۶ (۰٫۹۷)	
۴۔ سماجی فلاح و بہبود	۴٫۰ (تقریباً ایک فیصد)	۱٫۶۰	۱۹٫۷۰ (۲٫۲۰)	۱۳٫۴۴	۳۲٫۰۰ تقریباً ۲۱۳	۱۹٫۴۰	۸۸٫۹۴	۴۸٫۲۳* ۱۹۶۹-۷۳	۲۲۹ (۰٫۴۳)	

(باقی اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمایئے)

(جدول ۳۸ گزشتہ سے پیوستہ)

۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۱۱
سماجی خدمات اور متفرقات	۴۷۲ (۲۳٫۱)	۴۵۹ (۲۳)	۸۵۵ (۱۸٫۳)	(۸۳۰) (۱۸٫۱	۱۴۹۲ (۱۶٫۴)	۱۴۹۳ (۱۷٫۴)	۲۷۷۱ (۱۷٫۴)	⁄ -	۵۹۱۰ (۱۱٫۱۷)	- -
عورتوں کی سماجی فلاح و بہبود سوشل ویلفیر سیکٹر کے تحت۔	** ۷۰۰	—	** ۱۹۰۰	-	** ۲۱۱۷۰	-	** ۷۳۱٫۰۷	-	** ۴۲٫۹۱	- -

ماخذ: (الف) حکومت ہند پلاننگ کمیشن (پنج سالہ منصوبوں میں "عورتوں کے سماجی فلاح کے لیے مقررہ رقوم)

(ب) انڈیا ۔" اے ریفرنس (Annual Reference) سنہ ۱۹۷۲ء صفحہ ۱۵۹ (پہلے تین منصوبوں کی مقررہ رقم اور فیصد)

(ج) مسودہ پانچواں پنج سالہ منصوبہ ۷۹-۱۹۷۴ء ۔ جلد اول (چوتھے اور پانچویں منصوبوں کی مقررہ رقم اور فیصد) حکومت ہند ۔ صفحہ ۸۳ تا ۸۵

(د) " انڈین اکنومی " آر۔ دت اور کے ۔ پی ایم ۔ سندرم ۔ صفحہ ۳۲۸ (پہلے تین منصوبوں کی سماجی خدمات کے مصارف اور فیصد)

(ہ) " ایر بک " (Year Book) ہندوستان میں خاندانی فلاحی منصوبہ بندی ۷۳-۱۹۷۲ء (پہلے تین منصوبوں کی مقررہ رقم اور مصارف) حکومت ہند صفحہ ۱۴۷ اور

* ۷۳-۱۹۷۲ء (چوتھے پنج سالہ منصوبے پر اخراجات) متوقع ہے ۔

** اس میں دوسرے زمروں کی بھی رقم شامل ہے مثلاً جسمانی طور پر معذور بچے وغیرہ

نوٹ: ۔ جو اعداد بریکٹ میں ہیں وہ مجموعی مقررہ رقم اور مصارف کے فیصد کو ظاہر کرتے ہیں۔

جدول ۳۹

مختلف منصوبوں میں صحت اور خاندانی منصوبہ بندی کے لیے مقرر رقم

(روپے کروڑ میں)

	پہلا منصوبہ	دوسرا منصوبہ	تیسرا منصوبہ	چوتھا منصوبہ	پانچواں منصوبہ
الف۔ صحت کے دیگر پروگراموں کے لیے رقم	۹۸	۲۱۶	۲۲۶	۲۳۶	۸۰۱۶
ب۔ خاندانی منصوبہ بندی کے لیے رقم۔	۶٫۵۰	۴۹٫۷۰	۲۶۹٫۷۰	۳۱۵	۵۱۶
خاندانی منصوبہ بندی کے لیے مقرر کردہ رقم کا دوسرے صحت کے پروگراموں کے ساتھ تناسب۔	۶٫۶۳	۲۳	۱۱۴٫۹۱	۱۳۹٫۳۸	۶۳٫۲۳

جدول نمبر ۱۴

ریاستوں کے سلسلے میں صحت سے متعلق کچھ اعداد و شمار

ریاستیں	۶۶-۱۹۶۵ء اور ۶۷-۱۹۶۶ء میں طبی اور صحت عامہ کی تدابیر پر حکومت کے فی کس مصارف (روپیہ میں)	۶۶-۱۹۶۵ء میں آبادی کے فی ہزار افراد کے لیے اسپتالوں اور ڈسپنسریوں میں بستروں کی تعداد	۶۵-۱۹۶۴ء اور ۶۶-۱۹۶۵ء میں دیہی گھرانوں میں ہونے والی کل پیدائشوں میں سے وہ فیصد پیدائشیں جن میں تربیت یافتہ دائی، مڈوائف، ڈاکٹر یا اہلیت یافتہ نرس نے مدد کی ہے۔
۱	۲	۳۰	۴
آندھرا پردیش	۲٫۸۸	۰٫۵۳	۱۲٫۲۴
آسام	۳٫۲۸	۰٫۴۵	۱۲٫۸۸
بہار	۱٫۷۲	۰٫۲۴	۲٫۷۸
گجرات	۲٫۲۴	۰٫۵۳	۹٫۷۹
ہریانہ			۱۵٫۳۲
جموں و کشمیر	۴٫۱۳	۱٫۰۱	۶٫۱۰
کرناٹک	۲٫۵۸	۰٫۷۵	۱۵٫۸۹
کیرالہ	۳٫۷۰	۰٫۹۴	۲۵٫۷۲

(باقی اگلے صفحہ پر)

جدول نمبر ۳۴ (گزشتہ سے پیوستہ)

۱	۲	۳	۴
مدھیہ پردیش	۲٫۲۷	۰٫۴۱	۵٫۱۴
مہاراشٹر	۲٫۹۵	۰٫۸۱	۷٫۵۲
اڑیسہ	۳٫۲۱	۰٫۴۳	۹٫۷۹
پنجاب	۲٫۵۷	۰٫۴۷	۱۴٫۲۷
راجستھان	۳٫۸۰	۰٫۵۲	۴٫۰۷
تامل ناڈو	۳٫۰۳	۰٫۴۸	۲۱٫۹۲
اترپردیش	۱٫۴۹	۰٫۳۸	۲٫۵۱
مغربی بنگال	۳٫۳۲	۰٫۸۵	۲٫۹۸
ہندوستان	۲٫۵۸	۰٫۵۷	۸٫۸۱

نوٹ :- کالم (۲) اور (۳) کے اعداد "ہندوستان میں صحتی اعداد و شمار" (Health statistics in India) "وزارت صحت" حکومت ہند سے لیے گئے ہیں :

کالم (۴) کے اعداد کو این۔ ایس۔ ایس کی رپورٹ نمبر ۱۷۱۔ انیسواں دور (۱۹۶۴-۶۵) میں دیے گئے تخمینوں سے شمار کیا گیا ہے۔

کالم (۲) میں ہریانہ پنجاب میں شامل ہے۔

ماخذ :- پی۔ کے باردھن۔ "مسئلہ موت و حیات پر" (On life and Death question) مطبوعہ اکنامک اینڈ پولیٹیکل ویکلی" خاص نمبر اگست ۱۹۶۷ء

اسکولی نظام کے تحت اضافی عمر کے گروپوں میں اسکولی طلبار کی جنس وار تناسب ۱۹۷۱ء

مختلف سطحوں پر لڑکوں کی تعلیم کے مقابلے میں لڑکیوں کی تعلیم کی شرح ترقی کا اظہار" نن کی شکل میں ۴۸-۱۹۴۷ تا ۷۱-۱۹۷۰
کے دوران فیصد لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں کی تعداد میں نشیب و فراز

چارٹ ۳

ماخذ: وزارتِ تعلیمات، حکومتِ ہند

ملین کے اعداد میں

تعلیم کے داخلے تمام سطحیں ملاکر - (کل ہند)
لڑکیوں کے مقابلے میں لڑکوں کی افزونی
لڑکے
لڑکیاں
۵۶
۴۹
۴۲
۳۵
۲۸
۲۱
۱۴
۷
ماخذ - وزارت تعلیمات حکومت ہند
سال
چارٹ

پرائمری سطح پر داخلے (کل ہند)
لڑکیوں کے مقابلے میں لڑکوں کی افزونی
لڑکے
لڑکیاں
ملین کے اعداد میں
ماخذ - وزارت تعلیمات حکومت ہند
صفر
سال

چارٹ ۵

مختلف سطحوں پر لڑکوں کی تعلیم کے مقابلے میں لڑکیوں کی تعلیم کی شرح ترقی کا اظہار گراف کی شکل میں ۴۸-۱۹۴۷ تا ۷۱-۱۹۷۰ کے دوران فیصد لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں کی تعداد میں نشیب و فراز

چارٹ ۴ (الف)

ماخذ: وزارت تعلیمات حکومت ہند

مختلف سطحوں پر لڑکوں کی تعلیم کے مقابلے میں لڑکیوں کی تعلیم کی شرح ترقی کا اظہار گراف کی شکل میں ۴۸-۱۹۴۷ء تا ۷۱-۱۹۷۰ء کے دوران فیصد لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں کی تعداد میں نشیب و فراز

ماخذ - وزارت تعلیمات حکومت ہند

تعلیم کے داخلے تمام سطحیں ملاکر۔ (کُل ہند)

چارٹ ۳

پرائمری سطح پر داخلے (کل ہند)

ثانوی بشمول مڈل سطح پر داخلے (کل ہند)
لڑکیوں کے مقابلہ میں لڑکوں کی زیادتی
لڑکے
لڑکیاں
ملین کے اعداد میں
ماخذ۔ وزارت تعلیمات حکومت ہند
سال

چارٹ ۹

تعلیمی اداروں کی ترقی ۴۸-۱۹۴۷ تا ۶۸-۱۹۶۷ء
تعلیمی اداروں کی تعداد
صرف عورتوں کی مخصوص تعلیمی اداروں کی تعداد
ماخذ - وزارتِ تعلیمات حکومتِ ہند
اداروں کی تعداد لاکھ کے اعداد میں
۲
۴
۶
۸
۱۰
بھنر ۱۹۴۷ ۴۸ ۴۹ ۵۰ ۵۱ ۵۲ ۵۳ ۵۴ ۵۵ ۵۶ ۵۷ ۵۸ ۵۹ ۶۰ ۶۱ ۶۲ ۶۳ ۶۴ ۶۵ ۶۶ ۶۷ ۶۸
چارٹ ۸
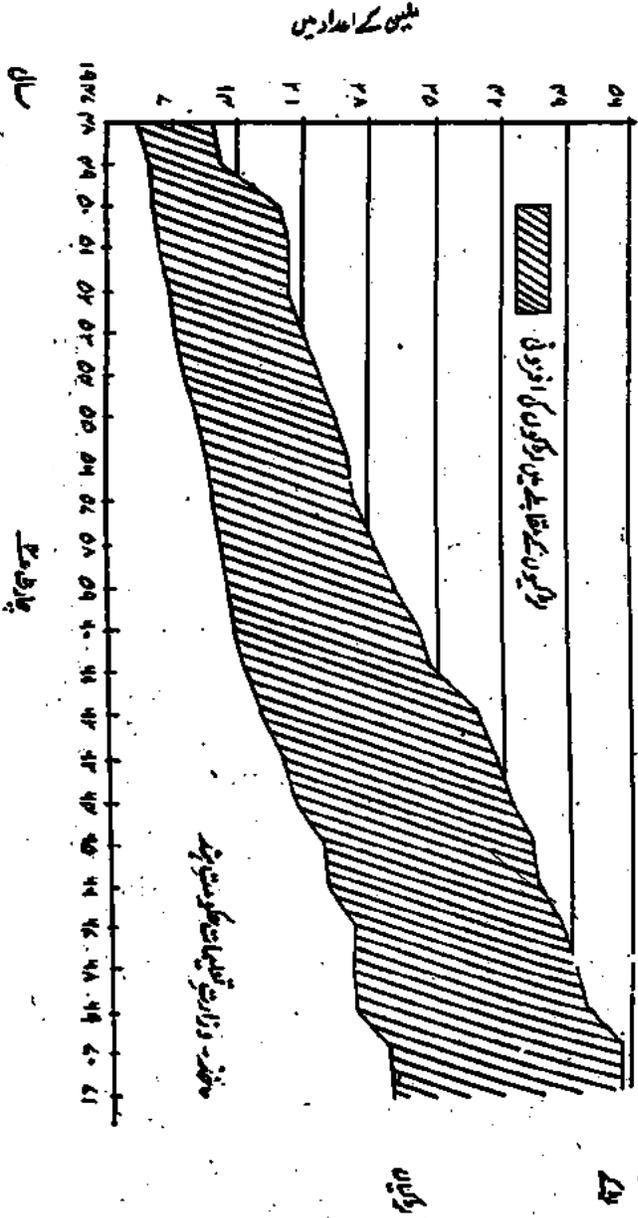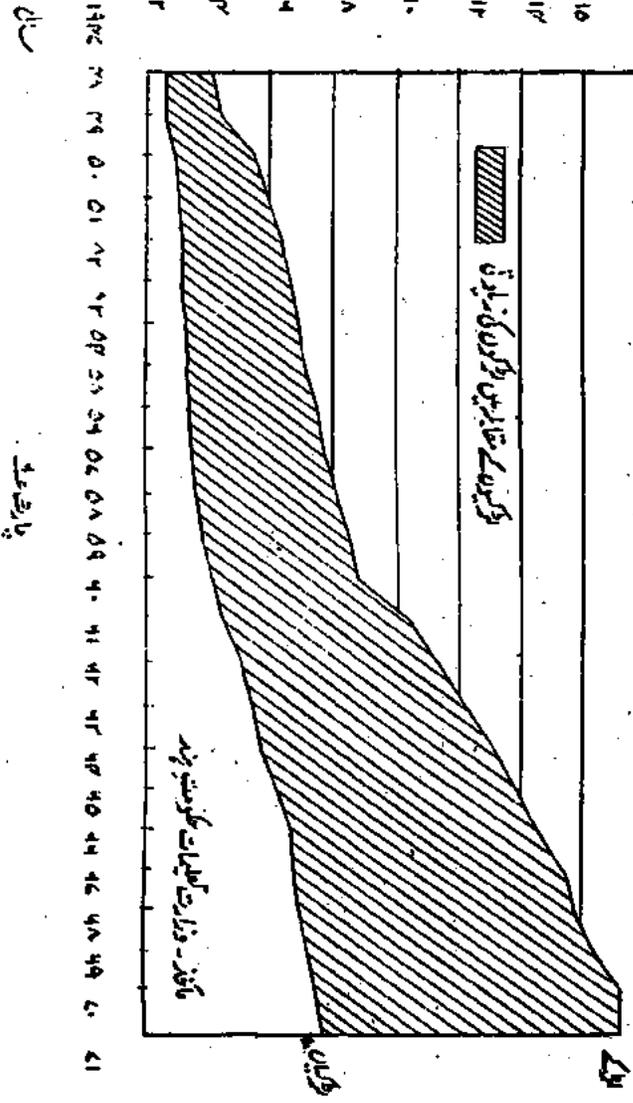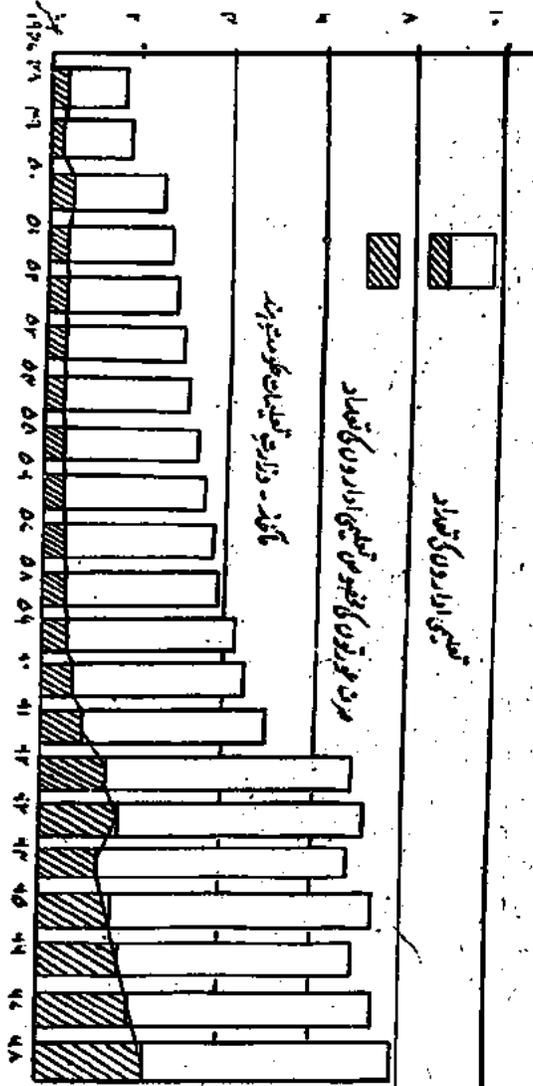
تعلیم نسواں میں پچھ پسماندہ ریاستیں

نقشہ میں دیے ہوئے اعداد تعلیم نسواں میں ریاستوں کا درجہ ظاہر کرتے ہیں۔

نوٹ :- یہ نقشہ ١٩٧٠-٧١ء کے اعداد و شمار کی معلومات پر مبنی ہے۔ ارونا چل پردیش (نیفا) اس نقشے میں نہیں دیا گیا ہے کیونکہ اس وقت اس کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ اس کو بھی پسماندہ ریاستوں میں شامل کرنا پڑے گا۔

چارٹ ۹
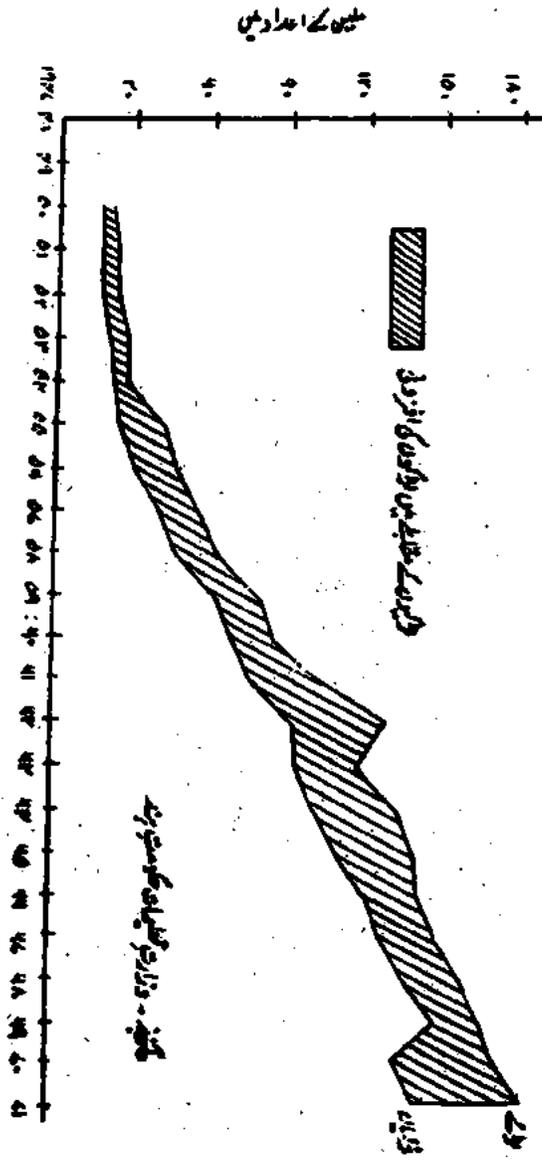
قبل پرائمری سطح پر داخلے (کُل ہند)
ملین کے اعداد میں
۱۸۰
۱۵۰
۱۲۰
۹۰
۶۰
۳۰
لڑکیوں کے مقابلے میں لڑکوں کی افزونی
لڑکے
لڑکیاں
ماخذ ۔ وزارت تعلیمات حکومت ہند
چارٹ ۱۰

کلیات فانی	پروفیسر ظہیر احمد صدیقی	52/-
ہندوستانی خارجہ پالیسی کی بنیادیں	بسمل پرساد / محمد محمود فیض	12/25
ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج	ڈاکٹر رفیق زکریا	46/-
لمعات بصیرت	رگھوناتھ گھئی	40/-
مجموعہ نغز (تذکرہ شعرائے اردو)	محمود خاں شیرانی	50/-
مشرق و مغرب میں تنقیدی تصورات کی تاریخ	پروفیسر محمد حسن	28/-
مقالات مسعود	پروفیسر مسعود حسین خاں	18/50
مولیر	پروفیسر ثریا حسین	15/-
میر تقی میر	نثار احمد فاروقی	18/-
نالاڈیار (کلاسیکی تامل شلوکوں کا مجموعہ)	غازی حمید اللہ خاں	4/75
واجد علی شاہ کی ادبی و ثقافتی خدمات	کوکب قدر سجاد علی میرزا	97/-
عہدۂ ناظم کتب خانہ داری ایک تعارف	کے۔ سی۔ ہیڈسن / مہ جبیں اختر	22/-
وضاحتی کتابیات (جلد دوم) ۷۷-۱۹۷۸ء	پروفیسر گوپی چند نارنگ / پروفیسر مظفر حنفی	43/-
وضاحتی کتابیات (جلد سوم)	پروفیسر گوپی چند نارنگ / پروفیسر مظفر حنفی	135/-
ہندی ادب کے بھگتی کال میں مسلم ثقافت کے اثرات (دوسری طباعت)	ڈاکٹر سید اسد علی / ڈاکٹر ماجدہ اسد	22/-
یادبود غالب	پروفیسر خواجہ احمد فاروقی	21/-
مغلوں کا نظام مالگزاری (۱۷۰۰ء سے ۱۷۵۰ء تک)	نعمان احمد صدیقی / ایس۔ بی ہودکی	9/-
مراد آباد۔ تاریخ اور صنعت	تاباں نقوی	12/-
مسیر طالبی (سفر نامہ)	مرزا ابو طالب اصفہانی / ثروت علی	32/-
منتخب دساتیر کا تقابلی مطالعہ	شجاع الدین فاروقی	65/-
ناوابستگی	پروفیسر رشید الدین خاں / ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ مہدی	37/-
وجے نگر کے عہد میں نظام حکومت اور سماجی زندگی	ٹی۔ وی۔ مہالنگم / پروفیسر کے۔ نیل کنٹھ شاستری	41/-

فسانۂ آزاد (جلد سوم، حصۂ اوّل)   رتن ناتھ سرشار / امیر حسن نورانی   67/50

فسانۂ آزاد (جلد سوم، حصہ دوم)   رتن ناتھ سرشار / امیر حسن نورانی   67/50

فسانۂ آزاد (جلد چہارم، حصۂ اوّل)   رتن ناتھ سرشار / امیر حسن نورانی   50/-

فسانۂ آزاد (جلد چہارم، حصۂ دوم)   رتن ناتھ سرشار / امیر حسن نورانی   50/-

فکر و تحقیق (۱) جنوری تا جون 1989   قومی اردو کونسل   15/-

فکر و تحقیق (۲) جولائی تا دسمبر 1989   قومی اردو کونسل   15/-

فکر و تحقیق (۳) جنوری تا جون 1990   قومی اردو کونسل   15/-

فکر و تحقیق (۴) جولائی تا دسمبر 1990   قومی اردو کونسل   15/-

فکر و تحقیق (۵) جنوری تا جون 1992   قومی اردو کونسل   20/-

فکر و تحقیق (۶) جولائی تا دسمبر 1992   قومی اردو کونسل   20/-

فکر و تحقیق (۷) جنوری تا جون 1997   قومی اردو کونسل   30/-

فکر و تحقیق (۸) جولائی تا دسمبر 1997   قومی اردو کونسل   30/-

ہندوستانی کتبوں کا مطالعہ   ڈی۔ سی۔ سرکار / ملیحہ سمیع الزماں   49/-

قطب مشتری،   اسد اللہ وجہی / ڈاکٹر حمیرہ جلیلی   48/-

قلم کا مزدور پریم چند   مدن گوپال   20/-

ہندوستانی معاشرہ عہد وسطیٰ میں (دوسری طباعت)   کنور محمد اشرف / قمر الدین   20/-

ہندوستان میں مسلم حکومت کی اساس   اے، بی، ایم، حبیب اللہ / مسعود الحسن   25/-

کائنات جلیل   علی احمد جلیلی   35/-

کلیات ذوق   ڈاکٹر تنویر احمد علوی   34/-

یوروپ کے عظیم سیاسی مفکرین   ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی   15/50

کلیات سودا (حصۂ اوّل)   پروفیسر محمد حسن   48/-

کلیات سودا (حصۂ دوم)   پروفیسر محمد حسن   13/-

کلیات عیش   ڈاکٹر حبیبہ بانو   80/-

کتاب	مصنف / مترجم	قیمت
دکن کی قدیم تاریخ	پروفیسر یزدانی	49/-
تاریخ اور سماجیات	عائشہ بیگم	10/50
رنجیت سنگھ	نریندر کرشن سنہا ر کیلاش چندر چودھری	9/25
ریاست حیدر آباد میں جدوجہد آزادی (۱۸۰۰تا۱۹۰۰)	سید محمد جواد رضوی	[illegible]0/-
سلاطین دہلی کا سیاسی نظریہ	محمد حبیب ر بیگم افسر عمر سلیم خاں	[illegible]
سلطنت مغلیہ کا مرکزی نظام حکومت	ابن حسن ر آئی۔اے۔ ظلی	19/-
سوویت یونین کا سیاسی نظام	ظفر امام	74/-
عشری درجہ بندی	جیلول ڈیوی ر سید محمود حسن قیصر امروہی	80/-
شہیدان آزادی (حصہ دوم)	پی۔ این۔ چوپڑا ر سید تفضل حسین	20/-
صوتیات فونیمیات	پروفیسر اقتدار حسین خان	24/-
صوبائی خود مختاری کی ابتدا	ایس گومر ر بشیشور پرشاد	12/50
ظہیر الدین محمد بابر (دوسری طباعت)	ایل، ایف، رش بروک ولیمز ر رفعت بلگرامی	13/-
علی وردی اور اس کا عہد	کالی کنکر دتا ر عبد الاحد خاں خلیل	30/-
برطانیہ کا دستور اور نظام حکومت	محمد محمود فیض آبادی	36/-
تاریخ آصفی	مرزا ابو طالب ر ڈاکٹر ثروت علی	10/-
قدیم ہندوستان میں تعلیم	ڈاکٹر اے۔ ایس۔ الیکر ر ابو یوسف	35/-
عام لسانیات	پروفیسر گیان چند جین	75/-
قدیم ہندوستان میں شودر	ڈاکٹر رام سرن شرما ر جمال الدین محمد صدیقی	14/50
مہاتما گاندھی	بی۔ آر۔ نندا ر علی جواد زیدی	60/-
مغلیہ سلطنت کا عروج و زوال	ڈاکٹر ریاض احمد خاں شیروانی	37/-
مغل دربار کی گروہ بندیاں اور ان کی سیاست (دوسری طباعت)	ڈاکٹر ستیش چندر ر ڈاکٹر قاسم صدیقی	22/-